آنند لہر کی حیات اور ادبی خدمات کا جائزہ

گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر، فیکلٹی آف
آرٹس میں پیش کیا گیا تحقیقی مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اُردو)

مقالہ نگار
محمد شفیق
محمد شفیق

نگراں
برکت علی ڈاکٹر برکت علی
پروفیسر (ریٹائرڈ)

شعبۂ اُردو و فارسی گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر (پنجاب)

۲۰۱۲ء

ANAND LEHAR KI HAYAT AUR ADABI KHIDMAAT KA JAIZA

Thesis

SUBMITTED FOR

THE AWARD OF THE DEGREE OF DOCTOR OF PHILOSOPHY (URDU)

MOHAMMED SHAFIQ

(Research Scholar)

DR. BARKAT ALI

(Supervisor)

DEPARTMENT OF URDU AND PERSIAN

GURU NANAK DEV UNIVERSITY, AMRITSAR - 143005

PUNJAB

2012

فہرست ابواب

پیش لفظ

ریاست جموں وکشمیر میں ضلع پونچھ کی اپنی تاریخی، تہذیبی اور ادبی اہمیت ہے۔ ادب کے حوالے سے ضلع پونچھ بے حد زرخیز ہے کیونکہ یہاں بعض ایسی شخصیات پیدا ہوئی ہیں جن کی ادبی کاوشوں کی وجہ سے ضلع پونچھ کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ اسی سرزمین سے اُردو کے بلند مرتبہ افسانہ نگار کرشن چندر کا تعلق رہا ہے۔ جنھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ پونچھ کے پرفضا ماحول میں گذارا ہے۔ جس کا عکس ان کے تخلیقی سرچشموں میں ملتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے اپنی قلم کی طاقت کی وجہ سے ریاست جموں وکشمیر میں خاص کر اُردو فکشن کو منور کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور ٹھاکر پونچھی کے ناول برصغیر کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئے۔ سجاد پونچھی، جاوید راہی کا تعلق بھی سرزمین پونچھ سے ہے۔ جو اُردو اور گوجری ادب کو فروغ دینے میں جی توڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔

آنند لہر کا شمار نہ صرف ضلع پونچھ بلکہ ریاست جموں وکشمیر کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملکی سطح کی ادبی تنظیموں اور انجمنوں نے بھی اِن کی فکشن نگاری کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں اعزازات اور انعامات سے نوازا ہے۔ آنند لہر دورِ حاضرہ کے ایک کامیاب فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے فکشن کے حوالے سے سب سے زیادہ خدمات افسانہ کی صنف میں انجام دی ہے۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے، چار ناول، اور دو ڈرامائی مجموعے اور ایک مکمل ڈراما شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آنند لہر نے اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں سیاسی، سماجی، تاریخی، قومی یکجہتی وغیرہ موضوعات کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر ایک پہلو کو ایک خاص انداز واسلوب سے اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں جگہ دی ہے۔ جو انہیں انفرادی حیثیت عطا کرتے ہیں۔

جب راقم نے 2008ء میں ایم۔اے اُردو جموں یونیورسٹی سے پاس کیا تو میں نے پی۔ایچ۔ڈی کا ارادہ کیا تو اچانک میرا داخلہ پی۔ایچ۔ڈی میں ہوگیا۔ تو میرے دِل میں یہ خواہش تھی کہ میں کسی اچھی شخصیت پر کام کروں جب ریسرچ کمیٹی میں میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اُس وقت میرے نگراں ڈاکٹر برکت علی صاحب نے میری اس خواہش کو قبول کیا تو چند دنوں کے بعد مجھے ''آنند لہر کی حیات اور ادبی خدمات کا جائزہ'' پیش کیا اور میں نے اُس کو خوشی سے قبول کیا۔

میرے اِس تحقیقی مقالے کا عنوان ''آنند لہر کی حیات اور ادبی خدمات کا جائزہ'' ہے۔ میں نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اول۔ آنند لہر کی حیات سے متعلق ہے جس میں آنند لہر کی حیات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ لہر کے آباواجداد، پیدائش، تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، ادبی زندگی کا آغاز، مختلف انجمنوں سے وابستگی، اخلاق وعادات پر مختصر مگر جامعہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب اول کا حصہ (ب) ''آنند لہر اہلِ قلم کی نظر میں'' کے عنوان سے ہے۔ آنند لہر کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر مختلف اہل قلم اور قدر شناسوں نے جو آرائیں پیش کی ہیں اُن کو مدنظر رکھتے ہوئے لہر کا ریاستی وملکی ادب میں مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب اول کے حصہ ''ج'' میں آنند لہر کا اُردو ادب میں مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کا دوسرا باب آنند لہر کی افسانہ نگاری اور تخلیقی سرچشمے چار افسانوی مجموعوں کی روشنی میں مکمل بحث کی گئی ہے اور مجموعوں میں شامل افسانوں کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب آنند لہر کی ناول نگاری، ان کے ناولوں کا تنقیدی وتحقیقی مطالعہ ہے۔ جس میں اِن تخلیق کردہ چار ناولوں، ''سرحدوں کے بیچ''، ''اگلی عید سے پہلے''، ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور ''یہی سچ ہے'' پر مکمل بحث کی گئی ہے۔

مقالے کا چوتھا باب آنند لہر کی ڈِرامہ نگاری ہے۔ ڈرامہ نگاری میں ان کے تین ڈرامائی مجموعوں کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا پانچواں اور آخری باب مصادر و ماخذ ہے۔ اس باب میں پیچھے والے چار ابواب کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔

آخر میں کتابیات، رسائل و جرائد کے حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں تحقیق کے دوران استفادہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے میرا یہ مقالہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

اوّل میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں جس نے مجھے اتنی ہمت، طاقت اور حوصلہ عطا کیا کہ میں اس اتنے مشکل کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔ اس مقالے کو مکمل کرنے میں مختلف احباب کی مدد ملتی رہی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے نگران محترم ڈاکٹر برکت علی کا شکر گذار ہوں اور اُن کا شکریہ ادا کرنا اپنا عین فرض سمجھتا ہوں جن کی محنت، لگن اور ہمدردی سے یہ مقالہ تکمیل پذیر ہوا۔ اس کے بعد میں شعبہ کے موجودہ صدر ڈاکٹر عزیز عباس کا دِل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی نیک دُعاؤں اور قابلیت، محنت اور لگن کی صحبت میں رہ کر اس قابل بنا کہ میں اس کام کو بحسن خوبی انجام دے پایا اور میں اِن کے لیے یہ نیک دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور اُن کو سلامت رکھے۔

اس کے بعد میں شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر چمن لعل کا تہہ دِل سے شکر گذار ہوں جنھوں نے میرے کام کا ایک ایک لفظ نیک دلی اور خوش اسلوبی سے دیکھنے میں مدد کی۔ جہاں پر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی اُس سے مجھے آشنا کیا۔ میں اِن کا دِل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ رب العزت ان کی عمر دراز کرے اور زندگی کے ہر مقام پر کامیاب کرے۔

اس کے بعد شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے سابقہ صدر ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، ڈاکٹر محمد ریاض احمد اور ڈاکٹر فرحت شمیم تمام کا دِل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے مجھے اپنے نیک مشوروں اور دُعاؤں سے نوازا ہے۔

اس کے بعد میں شعبہ اُردو و فارسی گورونانک دیو یونیورسٹی اور شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے تمام ریسرچ اسکالرز کا شکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے ریسرچ کے دوران اپنا تعاون دیا۔ میں اپنے عزیز دوستوں خاص کر محمد قدیر مہتابؔ، پروین حسین، اختر حسین، ریاض احمد لون، الطاف مدثر، شیراز حسین شاہ بخاری، خالد حسین ہاشمی، عادل ہاشمی، شہباز مرزا، مقیم انصاری، ظہور احمد، جاوید شاہ وغیرہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے یہ مقالہ لکھنے کے دوران میری کسی نہ کسی طرح مدد کی۔

آخر میں، میں اپنے والدین کا بے حد مشکور ہوں جن کی نیک دُعائیں ہمیشہ شامل رہی ہیں اور اس کے علاوہ تعلیم کے دوران کبھی بھی مالی پریشانی نہیں آنے دی۔ اپنی تمام تر مشکلات کو برطرف رکھتے ہوئے انھوں

نے میری ہر خواہش اور ضرورت کو پورا کیا۔ اس کے بعد میں اپنے چچا جان، منظور احمد قریشی اور حفیظ محمد اسحاق اور بھائی ذاکر حسین کا ممنون ہوں جنھوں نے ریسرچ کے دوران ہر طرح کی شفقت سے نوازا۔ میں آنند لہر صاحب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میرے تحقیقی کام میں مجھے تعاون دیا اور اپنا قیمتی وقت نکال کر نیک مشوروں سے نوازا۔

میں اپنی بہنوں اور بھائیوں، کوثر پروین، شاویز اختر، راحیلہ، محمد فرید اور محمد احسان الحق کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی نیک خواہشات اور دُعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں۔

آخر میں طارق ابرار کا شکر گذار ہوں جنھوں نے اس مقالے کی کمپیوٹر کمپوزنگ کی۔

شکریہ
محمد شفیق

باب اول

حصہ (الف) آنند لہر کی حیات

(پیدائش، خاندان، تعلیم و تربیت، ملازمت، شادی، اولاد، اخلاق و عادات
، ادبی زندگی کا آغاز، تصنیفات انعامات و اعزازت وغیرہ)

ادبی لحاظ سے ضلع پونچھ کی سرزمین کافی زرخیز نظر آتی ہے اس زمین نے ایسے شعرا، ادباء اور فنکاروں کو جنم دیا۔ جنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کی وجہ سے نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ ملکی سطح پر بھی پونچھ کو متعارف کروایا ہے۔ اُردو کے عظیم الشان افسانہ اور ناول نگار کرشن چندر کی پیدائش ضلع پونچھ میں ہوئی۔ اس کے علاوہ اس خطے سے تعلق رکھنے والے سرآوارہ تخلیق کار چراغ حسن حسرت، ٹھاکر پونچھی، دینا ناتھ رفیق، اور کے۔ڈی۔ مینی اپنی گراں قدر ادبی خدمات کے طفیل ادبی دُنیا میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ جنھیں اُردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔

پیدائش:۔ آنند لہر کا پورا نام شیام سندر آنند ہے لہر ان کا تخلص ہے اور آنند ان کی ذات ہے لیکن ادبی دنیا میں یہ آنند لہر کے نام سے ہی مشہور ہوئے ہیں۔ آنند لہر 2 جولائی 1951ء میں اپنے وطن پونچھ میں ہی پیدا ہوئے ان کے آباواجداد کا تعلق پونچھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سیٹھڑا سے ہے یہ گاؤں اب 1947ء کی لڑائی کے بعد پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے قصبہ میں ہے۔ اس لڑائی کی بے چینی اور بدامنی کی وجہ سے ان کے خاندان کو سٹھیڑا سے ہجرت کر کے پونچھ آنا پڑا۔ اور وہیں کے ایک محلہ سرائے میں رہائش پذیر ہوئے۔

آباواجداد: آنند لہر کے والد کا نام بلراج آنند تھا۔ اور والدہ محترمہ کا نام سمتری دیوی تھا۔ لہر کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین تھے۔ جس کی یہی وجہ ہے کہ اُن کو اُس وقت اُن کی قابلیت کی بنا پر محکمہ مال میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا۔ آپ کے تین چچے تھے جن میں سے ایک کا نام لال موہن راج آنند، دوسرے کا نام ارجن دیو آنند اور تیسرے کا نام ٹھیمو آنند تھا۔ شری لال مول راج آنند محکمہ مال میں گرداور کے عہدے پر فائز تھے ۔اور دوسرے چچا ارجن دیو آنند کسی بھی سرکاری نوکری سے وابستہ نہیں تھے لیکن پنجابی زبان کے ایک بہت بڑے اور اچھے شاعر تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں پنجابی میں نظم لکھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پنجابی کے پہلے شاعر ہیں اور تیرہ چودہ سال کی عمر میں اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ اور تیسرے چچا ٹھیمو آنند بھی کسی سرکاری نوکری سے وابستہ نہیں تھے۔ بلکہ ان کا کاروبار کھیتی باڑی کا پیشہ تھا آپ کی دادا کا نام لالہ موہن راج آنند تھا۔ جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا اور آپ کی دادی کا نام رام پیاری تھا آنند لہر کے دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا نام شو رتن آنند اور چھوٹے کا نام شیتل کمار آنند تھا۔ بڑے بھائی نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی ہوئی تھی لیکن بدقسمتی سے 24 سال کی عمر میں اس دنیا فانی سے رحلت پا گئے۔ چھوٹے بھائی کا نام شیتل کمار آنند ہے جو ایک تعلیم

یافتہ نوجوان ہے اور محکمہ مال میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہیں۔آنندلہر کی دو بہنیں ہیں جن میں سے بڑی کا نام ریشمی نندہ ہے جوایک پڑی لکھی نوجوان عورت ہے جو غیر سرکاری اسکول میں استانی کے عہدے پر فائز ہیں ان کی چھوٹی بہن کا نام ببلی تھا جو صرف دو سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔آپ کا خاندان ضلع پونچھ میں تقریباً 35 سال تک قیام پذیر رہا۔نامور ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار آنند لہرؔ جو اُردو ادبی دُنیا میں کافی مشہور و معروف ہیں کا تعلق بھی پونچھ کی سرزمین سے ہے۔

تعلیم و تربیت:۔آنند لہرؔ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز 1962ء میں اس وقت ہوا جب اُنہوں نے پانچ سال کی عمر میں گورنمنٹ پرائمری اسکول پونچھ میں داخلہ لیا اس کے بعد آپ نے مڈل اسکول پونچھ میں داخلہ لیا۔ہائر سکینڈری اسکول پونچھ سے بارہویں جماعت کا امتحان سائنس مضامین میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔اس کے بعد 1972ء میں ڈگری کالج پونچھ سے بی۔ایس۔سی (Bsc) کا امتحان پاس کیا۔تعلیم سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔لہذا آپ نے اپنی مذید تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔اور جموں ہائی کورٹ سے وکالت کا سلسلہ شروع کیا اور آج کل دہلی میں سپریم کورٹ میں بھی اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔اس وقت لہرؔ صاحب کا شمار ملک کے اہم ترین وکلاء میں ہوتا ہے۔

شادی:۔آنند لہر کی بیوی کا نام نیلم آنند ہے جو گاؤں چھلہ من کوٹ جو قصبہ مینڈر سے چار کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ایک پڑے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور خود بھی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔پہلے بنک میں نوکری کرتی تھیں لیکن بعد میں گھریلو مصرفیات کی وجہ سے ان کو یہ نوکری ترک کرنی پڑی اور اب وہ ایک گھریلو خاتون کی زندگی گذار ہی ہیں۔

اولاد:۔آنند لہر کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔آپ کے بڑے بیٹے اکشے کمار آنند نے جموں یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کرنے کے بعد جموں ہائی کورٹ سے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا شمار اچھے وکلاء ہونے لگا لیکن بدقسمتی سے 18 جنوری 2011ء کی شام کو اس دنیا فانی سے منہ موڑ گئے۔آنند لہر کے چھوٹے بیٹے کا نام سدھاتھ آنند ہے جو ایک انجینئر نگ کا طالب علم ہے اور اپنے اسی پیشے میں مصروف ہے آپ کی ایک چھوٹی بیٹی روہنی آنند ہے جو اس وقت ایم۔ایس۔سی میں زیر تعلیم ہے۔

اخلاق و عادات :۔ آنند لہر ایک کامیاب وکیل ،ناول نگار ،افسانہ نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کو ابھارنے میں ان کے اخلاق و عادات کا بھی اہم رول رہا ہے۔ اعلیٰ ظرفی اور شرافت اُن کے چہرے سے عیاں ہے ۔اُن کی عظمت ان کی انتہائی ندامت میں چھپی ہے غریب پروری، مذہبی رواداری ،انسانی ہمدردی اور ادب نوازی کے اعلیٰ صفات اُن کی شخصیت میں ایک خوبصورت نکھار پیدا کرتے ہیں ۔آپ ایک شریف النفس اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں ۔غیر یبوں اور حاجت مندوں کی بھی بڑی ہمدردی سے مدد کرتے ہیں ۔لہر ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔

انتہائی مصروفیات کے باوجود بھی دوسروں سے ملنے کے لیے وقت نکالتے ہیں ۔آپ کے چہرے پر ہمیشہ خوشی کی لہریں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بال کم ہونے کی وجہ سے ماتھا کافی اونچا ہوگیا ہے ۔آپ کی آواز میں اعلیٰ ادرجے کی مٹھاس لب و لہجے میں متانت اور طبیعت میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ حقیقت میں لہر صاحب ایک ہمدرد اور شفیق انسان ہیں ۔چھوٹے بڑے کی عزت کرنا اپنا عین فرض سمجھتے ہیں ۔آپ اعلیٰ درجے کے مہمان نواز سخی دل اور حساس طبیعت کے مالک ہیں ۔سادہ لباس اور متوازن غذا کھاتے ہیں ۔اسیر کشتواڑی ان کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ’’مجھے امین بنجارہ جیسے فاضل دوست کے توسل سے لہر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا،تو میں نے ان کو عاجزی اور انکساری کا مجسمہ پایا۔ جب وکالت کا کام کرتے ہیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ ایک مقبول تخلیق کار ہیں ۔اور جب ادبی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو وکیلوں کی کوئی نشانی تک نظر نہیں آتی ہے مگر حق تو یہ ہے کہ وہ بیک وقت ایک بہت اچھے قانون دان اور ادیب بھی ہیں ۔وکیل اور ادیب کو ایک ہی جسم میں دیکھنا ہو تو لہر صاحب کا دیدار کیجیے ۔وہ جھوٹی اور سچی باتوں میں وقت گذارنے کا احساس نہ ہونے دیں گے‘‘ ۔[1]

---

[1]۔ اسیر کشتواڑی:۔ آنند لہر تخلیقات کے آئینے میں ۔مشمولہ شمشاہی ۔مجلہ تسلسل شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی ۔15 جولائی 2005ء ص35

ادبی زندگی کا آغاز: آنند لہر نے اپنی ادبی سفر کا آغاز کالج کے زمانے سے شروع کیا۔ زمانہ طالب علمی سے آپ کو ادب سے گہری دلچسپی تھی ۔ادبی محفلوں میں اکثر شرکت کرتے تھے جہاں پر اوباؤشعرأ سے ملاقاتوں کا سلسلہ نکلتا رہا۔ ان محفلوں میں آنے جانے سے آپ کے اندر اُردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوگئی ۔چنانچہ لہر صاحب طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب کے گرویدہ ہو گئے ۔ ان کا تخلیقی سفر گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ سے شروع ہوا جبکہ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' کالج کی میگزین '' آئینہ'' کے لئے آنند لہر کے نام سے لکھا۔ یہ ابتدائی کوشش کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی ۔آپ کا نام بحیثیت قلم کار مشہور ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا لہر صاحب کے اندر موجود تخلیق کار جاگ اٹھا۔ اچھا آغاز آدھی کامیابی کے برابر مانا جاتا ہے۔ چنانچہ لہر صاحب نے وکالت سے پہلے ہی اپنا نام ادیبوں اور فنکاروں کی فہرست میں درج کروایا۔ لہر صاحب کو اپنی ابتدائی زندگی میں مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کے والد صاحب کی قلیل آمدنی سے ان کی پڑھائی کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے آپ کو دوران تعلیم پرائیویٹ ٹیوشن کا سلسلہ شروع کرنا پڑا ۔آپ نے اپنی طالب علمی کا زمانہ بڑی پریشانیوں اور تنگ دستی میں گذارا لیکن آپ نے اپنی ہمت نہیں ہاری بلکہ اپنی جدوجہد میں اپنے قدم مسلسل آگے بڑھاتے رہے۔ اس بات کا ذکر موصوف نے ان الفاظ میں ایک انٹرویو کے دوران کیا

> ''گھر کی آمدنی بہت قلیل تھی والد محترم کے سر پر پانچ بچوں کی پرورش کرنے کی ذمہ داری تھی باقی بہن بھائی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے گھر کے اخراجات زیادہ تھے لہذا مجھے اپنا ذاتی خرچہ لگانے کے لیے پرائیویٹ ٹیوشن کا سلسلہ شروع کرنا پڑا۔ بچپن بڑے عیش و آرام میں گذرا لیکن طالب علمی کے دور میں بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن حالات سے لڑتے ہوئے میں نے اپنی ہمت نہیں ہاری۔ زمانے کے تھپیڑوں سے ٹکراتا رہا۔ سنبھلتا رہا ۔ پڑھائی کا شوق بہت گہرا تھا بالخصوص اردو ادب سے،،[1]

---

[1] آنند لہر: ایک انٹرویو کے دوارن موصوف نے بتایا۔

آنند لہر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اُنہوں نے ابتدا میں غزلیں کہنی شروع کیں لیکن ان میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ کالج میں بزم ادب کے نام سے ایک بزم بنائی گئی تھی۔ اس بزم کے صدر نور حسین پونچھی جو اس وقت انفارمیشن آفیسر تھے۔ ہر مہینے میں بزم کے تحت مشاعروں کا اہتمام کرتے۔ اس بزم کے ممبران میں جو لوگ شامل تھے ان میں گردھاری لعل برقؔ، شوال آزادؔ، بلدیوراج رہبرؔ، ماسٹر محمود الحسن، مقصود الحسن ملوچن، درشن سنگھ اکالی، باجے دیو سنگھ دت، سرون ناتھ، اور آفتاب کے نام شامل ہیں۔ آنند لہر بھی اس بزم میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس بزم کا مقصد اُردو ادب کو فروغ دینا تھا۔ اس بزم میں منعقد کی جانے والی ادبی محفلوں میں لہر صاحب نہ صرف شمولیت کرتے بلکہ صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ جہاں تک ان کی کالج کی مصروفیات کا تعلق ہے اُنھوں نے نہ صرف شاعری کی طرف دھیان دیا۔ بلکہ اسکٹ کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کا پہلا اسکٹ ''کالج ودآوٹ ہوسٹل'' (college without hostel) کے نام سے تھا یہ اسکٹ یوم جموریہ کے موقع پر پیش کیا گیا۔ اس میں کالج بغیر ہوسٹل کے مسائل کو بھی پیش کیا گیا۔ ان کا دوسرا اسکٹ سٹرائنگ ان نرق'' "Strike in Naraq" کے نام سے پیش کیا گیا جو اپنے زمانے میں کافی مقبول ہوا۔ آنند لہر نے ادبی سطح پر مختلف عہدوں پر فائز رہے ''انجمن ترقی پسند'' اور ''اُردو آل آنڈیا لیگل سیل،، کے سرپرست تھے جو لیگل سیل ہائی کورٹ کے مختلف ممبران سے تشکیل دیا گیا تھا۔ جس کا مقصد اردو مسائل پر روشنی ڈالنا تھا۔ اس کے علاوہ حلقہ فکروفن کے جنرل سیکریٹری اور ریڈیو کشمیر جموں کے یوانی سروس کے ایڈوائزر بھی رہ چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آنند لہر پیشہ کے لحاظ سے ایک اعلیٰ درجہ کے وکیل ہیں اور اس شعبے میں وہ حد درجہ مصروف رہتے ہیں لیکن وہ اپنی زندگی کی ان تمام مصروفیات سے وقت نکال کر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کی روحانی زندگی کو سکون مل سکے۔ آنند لہر ان تخلیق کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو اپنی شہرت کے لئے نہیں لکھتے ہیں بلکہ دل کی تسکین کے لئے لکھتے ہیں ان کی متعدد تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں اس طرح آنند لہر ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔

تصنیفات:۔ آپ کا پہلا مضمون ''پتھر کے آنسوں'' اور پہلا افسانوی مجموعہ '' انحراف ہے جو 1975ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1988ء میں ''نروان'' کے عنوان سے چھے ڈراموں پر مشتمل لہر صاحب کا مجموعہ

منظر عام پر آیا۔ان ڈراموں کے نام یہ ہیں۔
تیاگ، کالی کہانی، کھیل، نروان گہنگار، اور سپاہی کی واپسی ۔ظاہر ہے کہ اس کتاب کا نام نروان، ڈرامے کے نام پر ہی رکھا گیا ہے۔اس کے بعد ان کا دوسرا طویل ڈرامہ 'تپسوی کون'' 1992ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ڈراما لہر صاحب کا ایک مکمل ڈراما زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا۔یہ ڈراما 79 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔اسلئے اسٹیج پر کھیلے جانے کی قابل بنانے کی خاطر تیرہ مناظر میں منقسم کیا گیا ہے یہ سماجی نوعیت کا ڈرامہ ہے جس میں ایمان دار، رشوت خور، ایماندار اور رشوت خور کی زندگیوں کی خاص جھلکیاں دکھائی گئی ہیں ۔اس کے بعد لہر صاحب کا ایک اور ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سرحدیں'' 2006ء میں منظر عام پر آیا اس مجموعے میں کل تین ڈرامے سرحدیں، پل اور زندگی ہیں تینوں ڈرامے کئی بار ریڈیو پر نشر بھی ہو چکے ہیں اور ان ڈراموں کو ادبی دنیا میں کافی پسند کیا گیا۔اس کے علاوہ لہر صاحب کے افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان کی تفصیل اس طرح سے ہے۔لہر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سرحد کے اُس پار'' 2001ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے کا دیباچہ شرون کمار ورمانے لکھا ہے۔اس مجموعے میں کل 13 افسانے شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں ۔سرحد کے اس پار، رنگ ساز۔ سپیرن ۔ گوری، شکست ، واپسی ، رشتے ۔چھوٹی سی آواز، پھول والی زندگی منو، تندور، جسم، بستی اور بنجارن وغیرہ ہیں۔

اس مجموعہ کا دیباچہ شرون کمار ورمانے لکھا ہے جن کی نظر اُردو افسانے کی ابتداء اور ارتقاء پر گہری ہے۔صاحب موصوف نے اس دیباچے میں اُردو افسانے تاریخ اور تدریجی ترقی پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے آنند لہر کے افسانوں پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

> ''آنند لہر کسی ازم یا تحریک سے جڑا کہانی کار تو نہیں ہے۔اور یہ اس کے فن کے فن کی بہتری ہے۔لیکن وہ افسانے کی روایات ، جمالیاتی حسن اور فنی باریکیوں سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہیں۔وہ ان معنوں میں ترقی پسند ہے کہ انسان کا بھلا چاہتا ہے۔اس کے لیے وہ نعرہ نہیں لگاتا۔قاری کو زندگی کی کروٹوں ،صعوبتوں اور مشکلوں سے آگاہ کرتا چلا جاتا ہے اور ان حالات

کو بدلنے اور سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کسی نہ کسی جگہ منشی پریم چند کی روایت

سے جڑا رہتا ہے۔ اور یہ تقلید نہ ہو کر پاسداری ہے'' [1]

آنند لہر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''انحراف'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا دیباچہ انور کمال حسینی نے لکھا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل 33 افسانے شامل ہیں۔

''انحراف'' آنند لہر کے تجریدی افسانوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کے نام یہ ہیں۔

سولھواں برس، راستے کے پہاڑ، وجود، سفر، جواب، پانی کی لکیریں، دائرہ، زندگی کے زخم، اندھی روشنی، الجھن، بے چہرہ لوگ، ریت کا چشمہ، سورج کا قتل، گولائی، نروان، بے معنی صدا، گھر، عمر، سراب، پڑوسی، رفتار، سڑک وغیرہ ہی سے پتہ چلتا ہے کہ آنند لہر دیو مالائی قصے کہانیوں کے بجائے اپنے ماحول اور سماج سے متعلق سچی باتیں لکھتے ہیں۔ لیکن اُن کا طرزِ تحریر اور خیال دونوں ایک بے رنگ چیز کو بھی رنگین اور خوشنما بناتے ہیں۔

اس کے علاوہ ''کورٹ مارشل'' بھی ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل 22 کہانیاں شامل ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ نامی انصاری نے تحریر کیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں کے نام اس طرح ہیں۔ اب تھانہ چل پڑے گا، دادی اماں، کورٹ مارشل، سپاہی، دُعا، سنہرا کفن، کھیر، گواہوں کا بیوپاری، چند لمحے، ویشیا، برف اب بھی سفید ہے۔ گوتم بدھ سڑک، صرف ایک آدمی، کرائے کا مریض، اگر ایسا ہوا، خالی ہاتھ، ٹھنڈا چہرہ، فائر برگیڈ۔ شہروں کا کھیل، تیاگ، ایک خبر، اور انسان کب جیتے گا وغیرہ اس کے بعد آنند لہر کے افسانوں کا آخری مجموعہ ''بٹوارہ'' کے نام سے 2009 میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل ۔۔۔ کہانیاں شامل ہیں۔ جن کے نام یوں ہیں۔

بٹوارہ۔ دادی اماں، سمندر کا پانی، موسم بدلتے رہتے ہیں۔ رانی رانی غم خوار، دوسری بے انصافی، سنہری مچھلی، تھوڑی سی غلطی، حساب جیومیٹری، ایک داغ، یہ سرحدیں، انصاف، آگ، وہ کدھر جائے،

---

[1] شرون کمار ورما۔ دیباچہ۔ ''سرحد کے اُس پار''۔ ص۔ ۹

دوسرا ابٹوارہ، جج صاحب، ہتھیار، اس نے سوچا۔ کلفیاں، عشق کی ہار، سوال ۔ سونامی اور انتظار۔ اُن کے بچے ۔ہار کی جیت، بیراگن، درمیان میں وہ ۔ تپسیا، لوگ لوگ ہیں۔ گھر زمیں کی ضرورت ۔ دوسری سوچ۔ ایک اور ہجرت وغیرہ۔ ان تمام افسانوں کے مطالعے سے آنندلہر کی فکر کا علم ہوتا ہے کہ اُن کے اندر کتنا احساس شدت سے موجود ہے۔ جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر صفحہ کو رنگین بنا رہا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز، بدلتے وقت اور حالات، جذباتی بے کیفی، بے رحم ماحول کی سنگینی، اور خود غرضی کے تلاطم میں آنندلہر کا یہ افسانوی مجموعہ ۔عہد جدید کے یہ فلسفہ حیات کو موثر کیفیات سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہے۔

ان کے علاوہ آنندلہر کے ناولوں کے نام درج ذیل ہیں۔ ''مجھ سے کہا ہوتا''۔ ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ' اور یہی سچ ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے'' ۔یہ آنندلہر کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول 2004ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا دیباچہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے لکھا۔ جو جموں یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے سابقہ صدر رہ چکے ہیں۔ اس ناول میں لہر نے کشمیر کے پر فضاء ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے ایک درد بھری دستان ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد آنندلہر کا دوسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ۔2005ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا دیباچہ پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین نے لکھا۔ جو جموں یونیورسٹی شعبہ اُردو کے سابقہ صدر رہ چکے ہیں۔ اس ناول میں لہر صاحب نے امریکہ اور عراق میں ہونے والی لڑائی کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ اس کے بعد لہر کا تیسرا ناول ''یہی سچ ہے'' 2008ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر سید احمد قادری نے لکھا۔ ان کا چوتھا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' ۔2009 میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ سید معصوم رضا نے تحریر کیا۔ اس ناول میں ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے آر پار بسنے والے لوگوں کی عملی دقتوں کا تمثیلی انداز میں خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ پورا ناول 66 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سرورق کسی اچھے فن کار نے بنایا ہے۔

اس کے بعد آنندلہر کے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کا انگریزی میں ''گل بدن'' کے نام سے ترجمہ ہوا۔ انگریزی کے علاوہ ہندی اور عربی میں بھی ان کی تصنیفات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ یہ تھی آنندلہر کی تصنیفات جواب تک منظر عام پر آکر داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔

انعامات واعزازات: آنندلہر کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ریاست اور ریاست سے باہر ملکی سطح پر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے انہیں انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ اس سلسلے میں ریاست کی مشہور و معروف ادبی تنظیم ''رساجاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی'' نے ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں جموں یونیورسٹی کے سابقہ وائس چانسلر پروفیسر امیتابھ مٹو نے آنندلہر کو ''رساجاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی'' نے ایوارڈ سے نوازا۔ پروفیسر امیتابھ مٹو، آنندلہر کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آنندلہر''۔ ایک پرخلوص انسان ہیں۔ جو سماج کا درد اپنے اندر رکھتے ہیں۔
جس کی وہ کہانی یا ناول کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں''۔ ۱

اس سے پہلے 1975ء میں آل انڈیا کہانیوں کے اس مقابلے میں انہیں مناسب انعام سے بھی نوازا گیا۔ جس میں ان کی ایک کہانی ''سپیرن'' کو اول درجہ ملا۔ اس سلسلے میں لہر صاحب نے ایک ملاقات کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔

''آل انڈیا کہانی مقابلہ 1975ء میں منعقد ہوا۔ اس میں ملک بھر سے دس
کہانیاں منتخب کی گئیں۔ اس میں میری کہانی ''سپیرن'' کے نام سے شامل تھی
۔ اس کہانی کو درجہ اول ملا اور مجھے مناسب انعام سے نوازا گیا''۔ ۲

جب آنندلہر کے ڈراموں کا مجموعہ ''نروان'' شائع ہوا۔ تو ''میر اکیڈمی لکھنو'' نے آپ کو انعام سے نوازا۔ راجستھان اُردو اکیڈمی، جموں و کشمیر اُردو فورم، نمی ڈوگری سنستھا اور ادبی کنج نے بھی آنندلہر کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزازات اور انعامات سے نوازا۔ اس کے علاوہ اُتر پردیش اُردو اکیڈمی، بہار اُردو اکیڈمی اور چوہدری چرن سنگھ یونیورسٹی اُردو ڈیپارٹمنٹ اعزاز، سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اُردو جموں یونیورسٹی، امریکن بائیوگرافیکل انسٹی چیوٹ، مین آف دی ایوارڈ۔ پراچین کلا کیندر چندی گڑھ انعام، ادیان اکیڈمی اُڑیسہ اعزاز، لالہ جگت نارائن جالندھر انعام۔ انتر راشٹریہ سمان

۱۔ پروفیسر امیتابھ مٹو سابقہ وائس چانسلر جموں یونیورسٹی۔ مشمولہ انجبو۔ آنندلہر کی فن اور شخصیت۔ ص۔ ۱۲۳

۲۔ آنندلہر۔ ایک انٹرویو کے دوران

اپادھی اعزاز، سنستھا کی طرف سے ساہتیہ سمن اعزاز، صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ڈرامہ ''بٹوارہ''
پر -/5000روپے دیئے گئے انعام۔

ریاست اور ریاست سے باہر سے تعلق رکھنے والے مفکر، فن کار اور مقالہ نگاروں نے وقتاً فوقتاً آپ
کے فن اور شخصیت پر بھی مضامین تحریر کیے ہیں۔ جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان لکھنے والوں
میں۔ مختار ٹونگی، پروفیسر سعید، معصوم رضا، جناب وید بھسین، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی،
افتخار احمد صدیقی، ابراہیم یوسف، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کمار پاشی، عبدالرشید فدا کشتواڑی، اور اسیر کشتواڑی،
شرون کمار ورما، جاوید انور، سعید اختر اعظمی، رام پرکاش راہی، ڈاکٹر نصرت چودھری، خورشید کاظمی،
پروفیسر شہاب عنایت ملک، شام طالب، انور کمار حسینی، فرحت پروین، نامی انصاری، ڈاکٹر پریمی رومانی،
ڈاکٹر اسداللہ وانی، قمر الدین برتر، محمود شیخ، متین اعجاز، عشاق کشتواڑی، قمر سمبھلی، مشتاق انجم، ڈاکٹر محمد ایوب
اور ڈاکٹر شمع افروز زیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ آنند لہر کی تصنیفات کو ہندوپاک میں خاصی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اس بات کا زندہ
ثبوت یہ ہے کہ آنند لہر کے افسانے ملکی وغیر ملکی سطح کے اخبارات ورسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ان اخبارات
اور رسائل کے نام اس طرح سے درج ذیل ہیں۔ روزنامہ ہندوستان، ماہنامہ شاعر، جمنی، باد باراں، پاکستان
جدید فکر وفن، ہماچل پردیش ماہنامہ، حیات۔ نئی دہلی۔ اُردو دُنیا، وغیرہ بیسویں رسائل قابل ذکر ہیں۔ یہی نہیں
بلکہ دور حاضرہ میں کچھ رسائل وجرائد آنند لہر کے خصوصی گوشے بھی شائع کر رہے ہیں۔ جن میں ''عصری آگہی
'' تحریک ادب، مژگان (بنارس)، شاعر، رنگ، آبجوں، اسباق پونہ، انساب سرونج، سبق اُردو، اللہ کی پکار،
شیرازہ اور تسلسل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی میں ایم فل (M.Phil) اور ریاست سے باہر بھی دوسری یونیورسٹیوں میں ان
پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

باب اوّل

حصہ (ب) آنند لہر اہلِ قلم کی نظر میں: ایک جائزہ

ریاست جموں وکشمیر کے مشہور ومعروف افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور ڈراما نگاروں میں شیام سندر آنند لہر کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آنند لہر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے شروع کیا۔ بعدازاں ناول اور ڈرامے کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور ریاست کے اُردو ادب میں اپنا ایل الگ مقام بنالیا۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو فکشن میں بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ نامور اور معروف وکیل ہونے کے باوجود انھوں نے ادب کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور تاہنوز وہ ادبی شہ پارے تخلیق کررہے ہیں۔ آنند لہر کی اب تک جو تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔ ''نروان'' ۔ 1988۔ ''تپسوئی کون'' 1994ء۔ ''اگلی عید سے پہلے'' ۔ 1997 ۔ ''سرحد کے اس پار'' ۔ 2001ء۔ ''انحراف'' 2002، ''سرحدوں کے بیچ'' ۔ 2000 ۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' ۔ 2003 ، ''کورٹ مارشل'' 2006، ''یہی سچ ہے'' ۔ 2008ء، ''سرحدیں'' 2006ء، ''بٹوارہ'' 2009 ۔ وغیرہ یہ تمام ان کی ادبی خدمات ہیں۔

آنند لہر کی فن اور شخصیت سے متاثر ہوکر مختلف نقادوں، دانشوروں اور ماہرین نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ جن سے ادبی دُنیا میں اُن کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ریاست جموں وکشمیر کے نامور ادیب اور تاریخ نویس اسیر کشتواڑی۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

> ''مجھے امین بنجارہ جیسے فاضل دوست کے توسل سے لہر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، تو میں نے ان کو عاجزی اور انکساری کا مجسمہ پایا۔ جب وکالت کا کام کرتے ہیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ ایک مقبول تخلیق کار ہیں ۔ اور جب ادبی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو وکیلوں کی کوئی نشانی تک نظر نہیں آتی ہے مگر حق تو یہ ہے کہ وہ بیک وقت ایک بہت اچھے قانون دان اور ادیب بھی ہیں ۔ وکیل اور ادیب کو ایک ہی جسم میں دیکھنا ہو تو لہر صاحب کا دیدار کیجئے ۔ وہ جھوٹی اور سچی باتوں میں وقت گذارنے کا احساس نہ ہونے دیں گے'' ۔ [1]

---

[1] اسیر کشتواڑی:۔ آنند لہر تخلیقات کے آئینے میں ۔ مشمولہ شمشاہی ۔ مجلّہ تسلسل شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی ۔ 15 جولائی 2005ء ص 35

مشہور شاعر اور ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزادلہر صاحب کے بارے میں اپنا اظہار خیال ظاہر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''میرے عزیز دوست آنند لہر دُنیا کے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ صف اول کے افسانہ نگار، ناول نگار اور تمثیل نگار ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں مگر ابھی تک وہ بطور شاعر کے وہ منظر عام پر نہیں آئے۔ منظر خاص تک ہی محدود ہیں۔ جہاں تک فکشن نگاری کا تعلق ہے۔ اُن کے افسانے ملک کے بلند پایا ادبی جریدوں میں شائع ہو کر داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ حال ہی میں اُن کا ڈراما ''تپسوئی کون''۔ ہندوستان بھر میں شرف مقبولیت کی بلند منزلوں تک پہنچ چکا ہے'' [1]

آنند لہر صاحب کا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے جو مصنف نے خون جگر میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہے۔ یہ داستان ہندوستان کی آزادی سے شروع ہو کر آج تک پہنچتی ہے۔ یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک۔ سرزمین کشمیر کی یہ درد بھری داستان جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ایسی روداد ہے جس میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ کہیں کہیں تصادم بھی ہو جاتا ہے۔ اور نتیجتاً کہیں اندھیرا فتح یاب ہوتا ہے اور کہیں روشنی لیکن انجام کار روشنی کامران و نصرت پایاب ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا سبب ہے کہ نصف صدی کا یہ سارا سفر ناول نگار کے اپنے دل کی تجلی سے جگمگا رہا ہے۔ ناول نگار نے تو قنوطی (Passimist) ہے۔ نہ رجائی (Optimist) بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دُنیا کسی انسان کے ذریعے سے بہتر ہو سکتی ہے۔ یعنی اصلاح کا قائل ہے''۔

ریاست جموں و کشمیر کے ایک نامور محقق اور نقاد پروفیسر ظہور الدین لکھتے ہیں۔

''آنند لہر ریاستی اُردو فکشن پر ابھرتی ہوئی ایک نئی آواز ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک نامور ایڈوکیٹ ہونے کے ناطے آپ کی مصروفیات کا جو عالم ہے۔

---

[1] جگن ناتھ آزاد، مشمولہ شاعر۔ فاران پبلیشرز بمبئی۔ جلد ۷۶۔ شمارہ ۵۔ مئی ۲۰۰۵ء۔ ص۔ ۹

وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اپنی دلچسپیوں خصوصاً ناول وافسانہ کے لیے آپ کس طرح وقت نکال پاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ آپ کے جو ناول اس وقت تک چھپ کر آئے ہیں اُن میں ''سرحدوں کے بیچ'' قابلِ ذکر ہے۔ جس پر ملک کی اکیڈمیوں نے آپ کو انعام سے بھی نوازا ہے۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔ جس میں آپ نے افتادِ طبع کے عین مطابق ایک ایسے موضوع کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا تعلق اگرچہ ہمارے ہی دور سے ہے لیکن نوعیت کے اعتبار سے ہر دور کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ یعنی ہتھیاروں کی دوڑ اور اُن کے استعمال سے پیدا ہونے والے نتائج جس سے انسان تو متاثر ہوتے ہی ہیں وہ چرند پرند بھی اُن کے اثرات سے محفوظ نہیں رہتے جس کا اس ماحول سے کسی طرح کا کوئی رشتہ ہو۔ یہ موضوعات جتنے اہم ہیں۔ آنند لہر انھیں اتنے ہی موثر لیکن سیدھے سادھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کہ وہ بہت سے ادنیٰ حقیقتوں پر سے پردے اُٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی فطرت کا ایسا ننگا ناچ شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملے''۔

مشہور و معروف مقالہ نگار، تحقیق وتنقید نگار شمس الرحمان فاروقی آنند لہر کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اب شک کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے تین دہائیوں کی مُدت افسانہ نگاری کے میدان میں صرف کی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ فیشن کی ہوا میں راہ رو نہیں ہوئے۔ شروع ہی سے انھوں نے جو استعاراتی اور علامتی لیکن سہل اور آسانی سے دل میں بیٹھ

لے۔ پروفیسر ظہور الدین۔ ایک نئی آواز مشمولہ۔ تسلسل۔ شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی۔ جلد ۸۔ شمارہ۔ ۱۵۔ 2005۔ ص۔ 29

جانے والا ادب اختیار کیا تھا اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ معاصر دُنیا کا عکس ان کے افسانوں میں نہ اس طرح سے جھلکتا ہے کہ اخباری رپورٹ معلوم ہو۔ اور نہ وہ اس قدر دھندلا یا گنجلک ہے کہ اس کے خدوخال کو پہچاننے کے لیے دیر تک الجھنا پڑے ۔ آنند لہر کی نثر پر جدید شعر کا اثر جا بجا نظر آتا ہے۔ لیکن انھوں نے شعر کو بیانیہ پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کے دو حالیہ افسانوں کے مجموعے ''سرحد کے اُس پار'' اور ''انحراف'' دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ آنند لہر نے دُنیا کے بدلتے ہوئے رنگوں کو اپنے بیانیہ تخیل کے آئینے میں بہت خوبی سے اُتار لیا ہے''۔ ۱

اُردو ادب کے مشہور افسانہ نگار اور ڈرامانگار کمار پاشی آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''گذشتہ دہائی میں جن چند ناموں نے اپنے افسانوں سے اُردو دُنیا کو متوجہ کیا اُن میں ایک نمایاں نام آنند لہر کا ہے۔ موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جن لوگوں کو نئے اُردو افسانوں میں کہانی پن کی تلاش ہے۔ انھیں آنند لہر صاحب کے افسانوں کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ جن میں عصری صداقتوں کو تخلیقی فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے''۔ ۲

ریاست پنجاب ایک مشہور شاعر، ناول نگار اور افسانہ نگار شرون کمار ورما آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' کے دیباچہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

۱۔ شمس الرحمان فاروقی۔ مشمولہ شاعر۔ جلد۔ ۷۶۔ شمارہ ۵ مئی۔ 2005۔ ص۔ 9

۲۔ کمار پاشی مشمولہ شاعر۔ جلد۔ ۷۶۔ شمارہ۔ ۵، مئی۔ 2005۔ ص۔ 9

''لہر پیشے سے وکیل ہے ۔اس لیے تجرباتی ذہن اور مدلل طریقہ اظہار رکھتا ہے۔اسی خوبی نے اس کے فن افسانہ نگاری کوتقویت دی ہے۔وہ نہ تو جذباتی ہوکر بہکتا ہے ۔اور نہ صرف پاسبان عقل کے سایہ میں تھم تھم کر چلتا ہے۔وہ قلم کی خدمت اور لفظ کی آبرو وعظمت کو پہچانتا ہے۔اس لیے اُن سے کھلواڑ نہیں کرتا۔کم الفاظ میں بات کہنے کا ہنر کم لوگ جانتے ہیں۔

غزل کی یہ خوبی جب افسانے میں جگہ پاتی ہے تو استعارہ وعلامت پیدا ہوتی ہے۔ جوطرز بیان کو اجال دیتی ہے۔لہرؔ اپنے نکتہ نظر کواس طرح نہیں کرتا ہے کہ وہ مقصد بن فن کو مجروح نہیں کرتا۔ بلکہ انڈر کرنٹ کی طرح کہانی کی تہہ میں جاری وساری رہتا ہے۔آنند لہرؔ نے اس دور میں کہانی لکھنا شروع کی جب انسانی زندگی افراتفری ، شک وشبہ ، بدلتے ہوئے انسانی اور سماجی رشتوں، اخلاقی اقدار کی شکست وریخت ، احیائے مذہب، سائنسی اور تکنیکی ترقی کے باوجود انسانیت کا زوال عام ہے۔لہرؔ حالات کا ماتم نہیں کرتا۔ان سے خوش اسلوبی سے نپٹنے اور انہیں بدلنے کی بات کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں عجائب نہیں ہیں ۔علم ،روزمرہ کی زندگی اور آدمی کو پیش آنے والے حادثات ، مشکلات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کا طرز بیان سادہ اور دلچسپ ہے۔ افسانہ نگاری کے فنی رموز سے بھی واقف ہے۔اور زندگی پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ دونوں تو یہاں اس کی کہانی کو دلچسپ ،کامیاب اور بامعنی بناتی ہیں''۔[۱]

اُردو تنقید وتحقیق کا ایک اور اہم نام سعید اختر اعظمی ،آنند لہرؔ کے ناول۔''اگلی عید سے پہلے'' پر اس طرح سے تبصرہ کرتے ہیں۔

---

[۱]۔ گوشہ آنند لہر۔سہ ماہی ۔رنگ ۔ص ۔۲۸

''کشمیر جنت نظیر پر ادباء وشعراء نے خاصا لکھا ہے۔اور صفحات در صفحات سیاہ کرڈالے ہیں ۔ان میں لب و لہجے کے اعتبار سے قطع نظر مرغ زاروں کا حسن اور رومان کی عکاسی جا بجا ملتی ہے۔آنند لہر کا ناول ''اگلی عید سے پہلے '' کا پس منظر بھی کشمیر ہی ہے۔ جہاں کی آب وہوا، تہذیب اور مختلف کرداروں کے تاثرات کو مخصوص منظر نامہ میں ڈھالنے کی سعی کی گئی ہے۔ کشمیری ہونے کے سبب آنند لہر کو اہل کشمیر کے درد اور اُن کے مسائل سے بخوبی آگاہی ہے۔اس لیے کرداروں کے تانے بانے بننے میں انھیں تخیل کا سہارا نہیں لینا پڑتا ہے۔اخوت، اتحاد اور ایکتا کے پیامبر عبدل کے ساتھ اس ناول میں بدری، سلیمان، اسلم، شانتی اور ریشما کے کردار صداقت، راستی اور حب الوطنی کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔

انتساب کتاب میں وہی پیامبر ہے جو ناول کے اندرون میں دل بن کر دھڑکتا ہے۔ آنند لہر نے کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مثبت کرداروں کے ساتھ پٹھان ۔کیپٹن اور کمانڈر جیسے منفی کرداروں کے تصادم کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ زبان کی سلاست وسادگی کے ساتھ جہاں کہیں انھوں نے خود کو شامل کیا ہے وہ بھی کہانی کا حصہ لگتا ہے۔ناول کی سب سے بڑی خامی کمپوزنگ کی فاش غلطیاں ہیں ۔ جو بسا اوقات کوفت کا باعث بھی بنتی ہیں۔ قیمت کی زیادتی نے بھی اس پر سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس جانب بھی توجہ دی جاتی''۔[۱]

ریاست جموں وکشمیر کے ایک مشہور صحافی آر کے بھارتی اپنے ایک انگریزی مضمون میں آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۔سعید اختر اعظمی ۔مشمولہ ہفت روزہ ہماری زبان ۔ناشر مانوی پرکاش پنج تیرتھی جموں ۔۲۲ تا ۲۸ جون 2005ء۔ص۔۶

"The book "Sarhad ke us Paar" is a collection of Urdu Short stories written by the noted writer and Prominent advocate Sham Sunder Anand Lehar.The diction of these stories is simple, easy to understand and poetic which goes directly to the heart and compels our attention.The style is quite new and unique if the book has been awarded it only shows that there are men and women around who guage the excellence, appriciate it and reward it suitably.The book is being translated by this writer into hindi at present and will be published by Mr.Sham Sunder Anand Lehar".1

برصغیر کے ایک سربرآوردہ نقاداوراديب ڈاکٹر خلیل اللہ خان نے اپنے مقالے میں آنندلہر کے شاہکارناول ''سرحدوں کے بیچ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''آنندلہر کی ساتویں کتاب ''سرحدوں کے بیچ'' ایک ناول ہے۔ کشمیر ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم مسئلہ ہے جو آزادی کے پچاس سال بعد بھی حل نہیں ہوسکا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں دہشت گردی ختم نہیں ہورہی ہے۔ اوران ممالک پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

''سرحدوں کے بیچ'' میں کشمیر کے ایک ایسے گاؤں کی عکاسی کی گئی ہے جہاں غربت اور مفلسی کا راج ہے۔ کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول'' سرحدوں کے بیچ'' رہنے والے لوگوں کی زندگی پر مبنی ہے۔ پودینہ کی چٹنی اور روٹی یہاں کی عام غذا ہے۔ لیکن جہاں پودینہ ہوتا ہے وہ پاکستان کے علاقے میں چلا گیا۔ اس لیے پودینہ توڑنے جانا قونونا جرم ہوگیا ہے۔ اس ناول کے خاص کردار ''رانی'' قانونی پابندی سے بے خبر اکثر پودینہ توڑنے جاتی۔ ایک دن پکڑے جانے پر قانونی مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔
سرحدوں پر گولی اکثر چلائی جاتی ہے کبھی ان چاہے اور کبھی چاہے چل

۱۔ آر کے بھارتی۔ On the other side of the border۔ غیر مطبوعہ۔

جاتی ہے۔ راجہ کی نفسیاتی خفیہ پولیس کی انکوائری سینٹر پر ہوئی۔ اس کو رانی سے محبت ہوگئی۔ غلام ایک جابر کردار ہے۔ سینٹر پر خادمی ہے۔ رانی کو سزا ہوگئی۔ راجہ کا تبادلہ ہو جاتا ہے اور رانی حاملہ ہو جاتی ہے۔ راجہ پولیس کی نوکری چھوڑ کر کالج ٹیچر کی حیثیت سے کام کرنے لگتا ہے۔ وہ اکثر رانی سے ملنے جاتا ہے۔ رانی کے بچے کی تولید ہوتی ہے۔ لیکن بچہ راجہ کو نہیں ملتا۔ رانی کی سزا ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسے پاکستان بھیج دیا جاتا ہے اور بچہ کو گورنمنٹ تعلیم و تربیت کے لیے لیتی ہے۔ ناول کے کردار حقائق پر مبنی ہیں اور زندگی کے قریب ہیں۔ ناول کا مقصد سرحد کی مشکلات کو بیان کرنا ہے۔ پلاٹ بہت منظم ہے اور کہانی ۸۰ صفحات پر پھیلی ہے''۔[۱]

آنند لہر کے ناول ''اگلی عید سے پہلے'' پر محمد معظم الدین نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کیے ہیں:

''شام سندر (قلمی نام آنند لہر) اُن کی اب تک کئی تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر تبصرہ ان کا تیسرا ناول ہے۔ اس کی تخلیقی فضا سرزمین کشمیر پر 1947ء سے 1996ء تک رونما ہونے والے حالات اور درد بھری داستان سے تیار کی گئی ہے۔ اس میں قبائلیوں اور پٹھانوں کے ذریعے وادی کشمیر کی مجروح ہوتی ہوئی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں پوجا اور نماز دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے غم میں برابر شریک ہیں۔

اس ناول کو فنی اعتبار سے پرکھنے کے بجائے ناول نگار کے ذہنی رویے کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس کی بناء پر یہ ناول وجود میں آیا، فن کار نے اس ناول کے ذریعے پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ فکر و عمل سے اس

۱۔ ڈاکٹر خلیل اللہ خان۔ مشمولہ ماہنامہ انشا کلکتہ۔ انشا پبلی کیشنز۔ جولائی۔ اگست۔ ۲۰۰۰۔ ص۔ ۵۲

دُنیا کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اس کا یہ جذبہ یقیناً قابل قدر ہے۔ چنانچہ موضوعاتی اعتبار سے یہ ناول اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے'' کا سرورق، کاغذ، کتاب اور طباعت وغیرہ دیدہ زیب ہیں۔ اُمید ہے کہ فکشن کے دل دادہ حلقوں میں اس ناول خاطر خواہ پذیرائی ہوگی'' [1]

ریاست جموں و کشمیر کے ایک اور نقاد، مضمون نگار اور شاعر فدا کشتواڑی نے آنند لہر کی شخصیت اور فن پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''آنند لہر اُردو کے مشہور و معروف افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے خود کو صرف افسانہ تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ڈرامے اور ناول کے ذریعے بھی اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ 2 جولائی 1951 کو جموں کے مردم خیز خطے پونچھ میں جنم لینے والے شیام سندر آنند لہر نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی۔ کالج میں تقسیم کے دوران ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور اپنا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' کالج میگزین کے لیے آنند لہر کے نام سے لکھا۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ ڈراموں کا مجموعہ ''نروان'' اور ''تپسوئی کون'' شائع ہو چکے ہیں۔ کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔ گذشتہ برس میں بھی اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ سرحد کے اُس پار، چھپ کر مقبول ہو چکا ہے۔

آنند لہر تجریدی افسانے بھی لکھتے ہیں۔ جن کے ذریعے بڑے اہم مسائل پیش کرنا ان کی ہنرمندی ہے۔ ''انحراف'' کے افسانے ان کے اس ہنر کا بہترین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کی

---

[1] محمد معظم الدین۔ مشمولہ ماہنامہ آجکل نئی دہلی، جلد۔۶۴۔ شمارہ ۲۔ ستمبر ۲۰۰۵۔ ص۔۴۲

کمزوریوں کوانھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جس میں عصری صداقتوں کا تخلیقی فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا طرز بیاں سادہ اور دلچسپ ہے۔ وہ افسانہ نویسی کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ قلم اور الفاظ کی عظمت کو جانتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات قاری کے ذہن تک پہچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ہیں۔ اس لیے وہ تخلیقی ذہن بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مشاق تجربہ کار، افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ وہ جہاں فنی نزاکتوں پر پورے اُترتے ہیں۔ وہیں ان میں معاشرے کی حقیقی تصویر صاف نظر آتی ہے"۔ ا

آنندؔلہر کے افسانوی مجموعہ "سرحد کے اس پار" پر اظہار خیال کرتے ہوئے معین اعجاز لکھتے ہیں:۔

"ناول ہو یا افسانہ، غزل ہو یا نظم، کوئی بھی مصنف اسی وقت قاری کو متوجہ کرتا ہے جب اس میں متاثر یا متوجہ کرنے والی کوئی بات ہو۔ کیوں کہ قاری گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے اور اس کے سینے میں ایک دل بھی ہوتا ہے۔ لہذا وہ باتیں اسے یقیناً متوجہ کرتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی طور پر اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔ حال ہی میں آنندؔلہر کا افسانوی مجموعہ "سرحد کے اس پار" پڑھنے کو ملا۔ یقین کیجیے بڑی تازگی کا احساس ہوا۔ آنندلہر اُردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں اور ایک عرصہ سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سیدھی سادھی بات وہ آسان اور سیدھی سادھی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ کوئی ابہام یا اُلجھاؤ نہیں ہوتا۔ "سرحد کے اس پار" میں تمام کہانیاں اسی انداز کی ہیں۔

ا۔ عبدل رشید فدا کشتواڑی۔ شیام سندر آنندؔلہر جموں کے مشہور افسانہ نگار۔ مشمولہ آبجو سہ ماہی رسالہ۔ اُردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی کشتواڑ۔ جولائی ۲۰۰۵۔ ص۔ ۶۸

فنکار جہاں انسانی احساسات وجذبات کا ادراک رکھتا ہے۔ وہیں دوسری جانب سماج اوراس کی نفسیات اور نبض کو بھی پہچانتا ہے۔ حالات اگر کسی وجہ سے ناموافق وناخوشگوار ہوجاتے ہیں اور سماجی زندگی میں ابتری اور گراوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ تو شدید طور پر دکھی ہوتا ہے اور کڑھتا ہے۔ جہاں عام آدمی اندر ہی اندر کڑھتے اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔ وہاں فنکار اپنے احساسات کو کہانی یا نظم یا مصوری میں ڈھال دیتا ہے اوراس طرح احمد ندیم قاسمی کے الفاظ میں وہ احساسات کائنات کے دل کا ترجمان بن جاتا ہے"۔[1]

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کے تییں تو کائناتی ہے"

آنندلہر کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر نصرت چودھری یوں رقمطراز ہیں۔

"آنندلہر کے یہاں زیادہ تر اینٹی اور تجریدی کہانی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کرداروں کے خواب آور کیفیت کو اُبھارا ہے۔ نئے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کرداروں کے خواب آور کیفیت کو اُبھارا ہے۔ نئے افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پر زندگی کی بے معنویت، معاشی ناہمواری، طبقاتی تضادات، بے چینی، تنفر، مادیت اور میکانکی عمل کا احساس ملتا ہے۔ وہیں افسانے کے فن میں بھی کئی تجربے ہوئے ہیں۔ نئے افسانے میں کہانی پن، پلاٹ اور کرداروں سے قطع نظر اینٹی پلاٹ اور اینٹی کہانی کی جھلک ملتی ہے۔ نئے تجریدی افسانوں کی تکنیک اور ہیت، روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔ آنندلہر کے یہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات کی

---

[1] ۔معین اعجاز۔ مطالعے کی رسید۔ مشمولہ اُردو ماہنامہ حیات۔ اپریل۔۲۰۰۲۔ص۔۴۰

ترتیب، پلاٹ کی تعمیراور کرداروں کے روایتی ارتقاء کے بجائے منتشر خیالات، واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔جس طرح خواب میں ہم زماں ومکاں کی حدود سے ماوراء ہو جاتے ہیں۔اسی طرح ''انحراف'' کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے۔خواب کے سے عمل کے مختلف زمانی ومکانی حدود کے بجائے واقعات کا ایک منتشر عمل سامنے آتا ہے۔ان کے افسانے سڑک، علالت، رفتار، راستے کا پہاڑ اور وجود تجریدی افسانے کے اعلیٰ نمونے کہے جاسکتے ہیں''۔ا

آنندلہر کے ناول ''یہی سچ ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید احمد قادری اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ:۔

''اُردو فکشن میں جن فن کاروں نے اپنے فکروفن، مطالعے ومشاہدے اوراحساسات وجذبات سے قابل قدر اضافہ کیا ہے۔اُن میں آنند لہر کا نام ہے جو اہم اور معتبر ہے۔انھوں نے کئی معیاری افسانوں کے ساتھ ساتھ ''اگلی عید سے پہلے''۔''سرحدوں کے بیچ'' اور ''مجھ سے کہا ہوتا''۔جیسے ناول مختلف اہم موضوعات پر لکھ کر اپنی بے پناہ فکری وفنی صلاحیتوں کا اعتراف کرایا ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں میں اُردو کے کئی ناول سامنے آئے ہیں۔جن میں موضوعات کا تنوع، اسلوب کی ندارت اور زبان وبیان کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو فکری وفنی سطح پر معنویت اور انفرادیت بخشی ہے۔

آنند لہر کے زیر نظر ناول ''یہی سچ ہے'' میں زندگی کے حقائق کی فلسفیانہ انداز میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ارتبساط سے بڑے ہی

ا۔شیرازہ جموں وکشمیر اکیڈمی آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز۔شمارہ۔۵، ۶، ۷۔جلد۔۳۶

موثر انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔'' ۔ا

برصغیر کے ایک اہم نقاد اور ادیب محمد ابوزر اپنے ایک مقالے میں آنند لہر کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سرحدوں کے بیچ'' عہد حاضر کے معروف ادیب آنند لہر کا نیا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ڈراموں کے مجموعے ''زوان'' اور ''تپسوئی کون'' ۔دو افسانوں کے مجموعے ''سرحد کے اُس پار''، ''انحراف'' اور ناول ''اگلی عید سے پہلے'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کی زندگی اور وہاں کے مسائل کا باشعور ہمدردانہ ذکر ملتا ہے ۔جسے پڑھ کر ایک جیتا جاگتا کشمیر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور جس سے کشمیر کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آنند لہر اپنی اسی روایت کی پیروی کرتے ہوئے زیر تبصرہ ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں بھ کشمیر کی سماجی، معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی زندگی کی عکاسی بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں کی ہے'' ۔ا

اُردو کی ایک نامور شخصیت نامی انصاری آنند لہر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آنند لہر اُردو کے معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کی کئی کتابیں اب تک زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ''سرحدوں کے بیچ'' کا موضوع ہند و پاک کے درمیان کی سرحد کے دونوں طرف کے گاؤں کی انسانی صورت حال ہے۔ جو نہ صرف دردناک ہے۔ بلکہ یہ سرحدیں انسانیت کی بنیادی قدروں کو پامال کرنے کا موجب بھی بن گئی ہیں۔

ا۔ آنند لہر ''یہی سچ ہے''۔ اُردو بک سوسائٹی دریا گنج نئی دہلی۔ ص۔ ۷

ا۔ محمد ابوزر۔ مشمولہ ہماری زبان۔ دہلی۔ ۲۲ تا ۲۸ مئی۔ ۲۰۰۶

سرحد سے ملحق گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی رانی اپنے بیمار باپ کی فرمائش
پر پودینے کی پتیاں توڑنے کے لیے قریب کے جنگل میں جاتی ہے۔
اور گرفتار کر لی جاتی ہے۔ کیونکہ جس جگہ پودینہ اُگتا ہے وہ زمین سرحد پار کے
ملک میں شامل ہے۔ اور بغیر ویزا پاسپورٹ سرحد پار کرنا نا قابل معافی جرم
ہے۔ سرحد پار ملک کے اذیت خانوں اور جیلوں میں اس پر کیا گذرتی ہے۔
اس کا نہایت ہی موثر خاکہ مصنف نے بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے
۔اور انسانی صورت حال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

آنند لہر کا یہ ناول دلچسپ ہے اور قاری کی فکر کو مہمیز بھی کرتا ہے۔ پلاٹ کی
بُنت مضبوط ہے اور واقعات کے بیان میں کوئی اینچ پیچ نہیں ہے۔ ناول کی
زبان بھی صاف، سیدھی، بامحاورہ اور موثر ہے۔ اصل معاملہ اس کے موضوع
اور ٹریٹمنٹ کا ہے۔ جس میں آنند لہر بالکل کامیاب ہیں۔ اور ان کی دانشورانہ
فکر نے اس کتاب کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے''۔ ا

اُردو ادب کے ایک مشہور فکشن نگار قمر سنبھلی، آنند لہر کی فکشن نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آنند لہر اُردو فکشن کا ایک اہم نام ہے ان کے کئی ناول اور افسانوں کے
مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نیز ڈراموں پر بھی انہوں نے توجہ کی ہے۔ حال
ہی میں آنند لہر کا ایک مختصر ناول (جسے ہم ناولٹ بھی کہہ سکتے ہیں)
''سرحدوں کے بیچ'' منظر عام پر آیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد کتنے ہی ناول تقسیم
،ہجرت وغیرہ کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اور ان میں کافی بہت مقبول بھی
ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ ناول بھی اسی موضوع سے ملتے جلتے پلاٹ
پر لکھا گیا ہے۔ اور اس میں دو ملکوں کی سرحد پر بسنے والوں کے مسائل اور اُن

ا۔ نامی انصاری۔ مشمولہ رنگ سہ ماہی۔ جلد ۳۱۔ اکتوبر۔ نومبر۔ ستمبر ۲۰۰۵ء۔ ص۔ ۲۷

کی زندگیوں کا بڑے خوبصورت انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔دو ملکوں کے سرحد پر رہنے والے کیسے کیسے مرحلوں سے گذرتے ہیں۔اس کا کچھ تصور وہی کرسکتے ہیں جوان تجربات اور کم سے کم مشاہدہ سے گذرتے ہیں۔ وہاں کے بسنے والوں کا گھر اگر ملک کی سرحد ہے اور ان کا کھیت دوسرے ملک کی سرحد میں۔بعض مکانات تو ایسے بھی ہیں کہ ان کا صحن ایک ملک میں اور کمرے دوسرے ملک میں ہیں"۔[1]

ڈاکٹر طارق سلیم، آنند لہر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آنند لہر افسانوی ادب سے بہت پہلے جڑے ہوئے ہیں ان کے ڈراموں کے مجموعے "نروان" اور "تپسوی کون" کے علاوہ ان کے افسانوں کے مجموعے "سرحد کے اُس پار" اور "انحراف" اور ایک ناول میں کشمیر کی فضا سانس لیتی ہے۔آنند لہر نے اپنی روایات کو برقرار رکھا ہے۔انھوں نے اپنے نئے ناول "سرحدوں کے بیچ" میں بھی کشمیر کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول سرحد کے قریب رہنے والوں پر مبنی ہے جو لوگ سرحدوں کے قریب رہتے ہیں۔ وہ اس پورے علاقے کو اپنا مانتے ہیں۔انھیں کسی بھی حد یا خطہ کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک عام باشندے کی حیثیت سے اپنے اردگرد کے وسائل سے ہی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں"۔[2]

اُردو ادب کی ایک مشہور شخصیت ڈاکٹر مجید احمد آزاد اپنے ایک مقالہ میں آنند لہر کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

۱۔قمر سنبھلی۔ماہنامہ رہنمائے تعلیم، دہلی۔"دہلی آف لاہور"۔اپریل ۲۰۰۴

۲۔ڈاکٹر طارق سلیم۔مشمولہ ابجوسہ ماہی۔رسالہ۔ اُردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی کشتور۔جولائی۔ستمبر ۲۰۰۵ء۔ص۔۱۱۱۔

''معاصر اُردو افسانہ نگاری میں آنند لہر ایک مقبول نام ہے ۔ان کے افسانے ملک و بیرون ملک کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ اور قارئین کا وسیع حلقہ انھیں پسند کرتا ہے ۔ان کے افسانوی مجموعے ''سرحد کے اس پار'' ۔''کورٹ مارشل'' اور ''انحراف'' کی خوب پذیرائی ہوئی ہے۔انھیں زندگی کے مسائل کو افسانے کے قلب میں ڈھالنے کا ہنر آتا ہے ۔ان کی نظر زندگی کی باریکیوں پر ہے۔انسان کی عظمت پر ہے اور کمال یہ ہے کہ گرد و پیش کا ماضی اور حال ان کی آنکھوں میں تازہ ہے۔ یہ سرمایہ بلاشبہ ایک ذہین فن کار کے لیے نعمت سے کم نہیں ہے۔ جس کا انھوں نے بھرپور استعمال بھی کیا ہے۔ جو آج تک ان کے افسانوں کے موضوع بنتے رہے ہیں ۔افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' ان کی افسانہ نویسی کا ایک روشن باب ہے۔اس میں شامل افسانے موضوعاتی تنوع رکھتے ہیں''۔ ۱

مختار ٹونکی، آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں۔ عدالتی مصروفیات اور قانونی موشگافیوں سے وقت نکال کر اپنی تخلیقی قوتوں اور ادبی کاوشوں کو بروئے کار لاتے ہیں ۔انھیں اُردو سے محبت ہے۔اس لیے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود تواتر سے پرورش لوح و قلم کرنا بہت بڑی بات ہے ۔متزاد یہ کہ پیشہ کی نکتہ ریزیاں اور عملی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں ان کی تخلیقات میں در نہیں آتیں۔ یہ ضرور ہے کہ وکالت نے ان کے ذہن کو تجریاتی بنا دیا ہے ۔وہ جو لکھتے ہیں بہت مدلل طریقہ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں ۔زندگی کے مسائل کا تجزیہ انھوں نے خوب خوب کیا ہے ۔اور بغیر رنگ

۱۔ڈاکٹر مجید احمد آزاد ۔ دربھنگہ۔ آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کا ایک جائزہ ۔غیر مطبوعہ

آمیزی کے کیا ہے۔انھیں افسانہ نویسی کی ہنر مندی حاصل ہے۔مگر داستان طرازی انھیں بالکل نہیں آتی ۔افسانوں کے گہرے مطالعے سے یہ بات بھی خصوصی بن کر واضح ہوتی ہے کہ تمام افسانے اپنی ایک اور پیکر میں مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر کئی شکمی کہانیاں رکھتے ہیں۔ اور یہ کہانیاں از خود غیر ارادی طور پر معرض وجود میں آگئی ہیں۔میری حقیر رائے میں یہ ان کے فن کی عظمت کی واضح دلیل ہے''۔ ا

اشرف حسین، آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں۔

''آنند لہر کا تعلق سرزمین پونچھ سے ہے جو تخلیقی اعتبار سے ہمیشہ ہی زرخیز رہا ہے وہ ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ جب بھی ذہن کی بے قرار موجیں اظہار خیال کے لیے اکساتی ہیں وہ جذبات واحساسات کو قلم بند کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں ۔ان کا اظہارِ خیال ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کی شکل اختیار کرتا ہے ۔سپریم کورٹ کے ایک نامور ایڈوکیٹ ہونے کے ناطے آپ کی مصروفیات کا جو عالم ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ۔اس کے باوجود ادبی دلچسپیوں کے لیے کس طرح وقت نکال پاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ادبی ذوق وشوق نے اس دور جدید میں وہ مقام انھیں عطا کیا ہے جس کو بیان کرنا مشکل ہے۔اُن کے ڈرامہ ''بٹوارہ'' پر صدر جمہوریہ ہند نے 50 ہزار روپے کی ایک چھوٹی سی رقم سے فراز کیا۔انھوں نے ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور ''یہی سچ ہے'' جیسے عمدہ اور بے مثال ناول لکھے۔ ساتھ ہی

ا۔مختار ٹونکی ۔مشمولہ شاعر ۔جلد ۷۶ ۔شمارہ ۵۔ مئی ۲۰۰۵ء ۔ص۔۱۵

ساتھ ''انحراف''، ''سرحد کے اس پار'' اور ''کورٹ مارشل'' جیسے افسانوی مجموعے مختلف موضوعات پر لکھ کر اپنی بے پناہ فکری وفنی صلاحیتوں کا اعتراف کرایا ہے''۔ ا

صغیر احمد اُردو ادب کے ایک مشہور ادیب اور فنکار آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زیر تبصرہ کتاب اُردو کے مشہور افسانہ نگار آنند لہر کے 34 افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آنند لہر صاحب سپریم کورٹ کے ایک مصروف وکیل ہیں۔ وہ ادب سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ادب کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔ یہ ان کی ادب دوستی کی ایک سچی مثال ہے۔ اس کتاب سے پہلے ان کی دس تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھیں نہ صرف عوام نے داد تحسین سے نوازا اور مقبولیت بخشی۔ بلکہ صدر جمہوریہ ہند نے ان کے ڈراما ''بٹوارہ'' پر 50 ہزار روپے کی حقیر رقم سے انھیں سرفراز کیا۔ آنند لہر نے ''نروان''۔ مختصر ڈرامے ''تپسونی کون''، طویل ڈراما، اور سرحدیں ریڈیائی ڈرامے لکھے جو کہ عام وخاص میں مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''اگلی عید سے پہلے''۔ ''سرحدوں کے بیچ''۔ ''مجھ سے کہا ہوتا''، ''یہی سچ ہے'' جیسے عمدہ اور بے مثال ناول لکھے''۔ ۲

اہل قلم کی مندرجہ بالا آراؤں اور آنند لہر کی فنی پختگی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلنا کافی حد تک آسان ہو جاتا ہے کہ لہر صاحب نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اُردو زبان وادب کی خاطر خواہ خدمات انجام دی

ا۔ اشرف حسین۔ بٹوارہ۔ ۲۰۰۹۔ ص۔ ۹

۲۔ صغیر احمد۔ مشمولہ۔ اُردو دُنیا۔ جلد ۱۳ شمارہ۔ ۹۔ ستمبر ۲۰۱۱ء۔ ص۔ ۹۱

ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو فکشن کو وُسعت دینے میں آنند لہر کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بقول پروفیسر شہاب عنایت ملک۔ سابقہ صدر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی۔

"ریاست جموں وکشمیر کا ادبی مورخ جب بھی کوئی ادبی تاریخ مرتب کرے گا تو آنند لہر کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ انھوں نے ریاست میں ،اُردو فکشن کو جو وُسعت عطا کی ہے۔ وہ کوئی دوسرا فکشن نگار نہیں کر سکا۔ ان کے ناول ، افسانے اور ڈرامے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ لہر صاحب ایک ایسے دردمند ادیب ہیں جو اپنے آس پاس کی گردو پیش کی زندگی سے بخوبی آشنائی رکھتے ہیں اور سماجی مسائل کی عکاسی کرنے میں کوئی جواب نہیں رکھتے ہیں۔ آنند لہر کے ناول جہاں ہمارے گردو پیش کی زندگی میں رونما ہونے والے مسائل کو اُجاگر کرتے ہیں وہیں دوسری طرف انسانی دوستی ،آپسی بھائی چارے اور انسانیت کا درس بھی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول قاری کے ذہن کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ یہ ناول قصہ پن کی وجہ سے بھی اپنی گرفت میں بھی لے لیتے ہیں۔ لہر کے ناول اگر چہ ضخیم نہیں ہیں لیکن وہ پلاٹ کا تانا بانا اس طرح سے بنتے ہیں کہ کم صفحات میں ہی وہ موضوع کو ہنر مندری کے ساتھ سمیٹ کر قاری کے ذہنوں پر زبردست تاثر چھوڑتے ہیں اور یہی ایک کامیاب ناول نگار کی خصوصی بھی ہوتی ہے۔ سیدھے سادے انداز میں موضوعات کو ناول کے پلاٹ میں سمیٹ کر لہر نے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول کی روایت کو فروغ دینے میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ذاتی زندگی میں جو مٹھاس ہے اس کا مظاہرہ آنند لہر نے اپنے ناولوں میں بھی کیا ہے۔ اور اگر میں آنند لہر کو وکالت اور ادب کا ایک بہترین امتزاج کہوں تو غلط نہیں ہوگا"۔ ا

ا۔ ڈاکٹر شہاب عنایت ملک۔ سابقہ صدر شعبہ اُردو ،جموں یونیورسٹی۔ آنند لہر ناولوں کے آئینے میں۔ ایک جائزہ۔ غیر مطبوعہ۔

باب دوم

آنند لہر کی افسانہ نگاری

سرحد کے اس پار، انحراف، کورٹ مارشل، بٹوارہ کی وشنی میں

آنندلہر کا شمار ریاست جموں وکشمیر میں دورحاضر کے معروف ناول نگاروں، ڈرامہ نگاروں اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔ آپ ملکی سطح پر بھی اپنی ادبی حیثیت کالوہامنوا چکے ہیں۔ جب آنندلہر نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو اُردوافسانہ ترقی کی کئی منازل طے کر چکا تھا۔ یعنی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فنی اور تکنیکی سطح پر بھی اُردوافسانے میں کئی طرح کے تجربے ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ موضوعاتی سطح پر بھی اُردوافسانہ میں کئی تبدیلیاں آچکی تھیں۔

کرشن چندر۔ حیات اللہ انصاریؔ، سعادت حسن منٹوؔ، راجندرسنگھ بیدیؔ، اختر دینوی، عصمت چغتائیؔ، اوپندرناتھ اشکؔ، احمد ندیم قاسمیؔ وغیرہ نے نہ صرف انسانی زندگی کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا بلکہ اس کی نفسیاتی اور داخلی زندگی کے مسائل، اُلجھنوں اور کش مکش کو بھی افسانوں کے روپ میں پیش کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُردوافسانے نے قلیل عرصے میں ایک شاندار روایات قائم کرلیں۔

1960ء کے آس پاس جس طرح اُردوافسانے نے علامتی اور تجریدی صورت اختیار کی اور پرانی روایات سے انحراف کر کے علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے آگے بڑھا۔ اس کے نمایاں اثرات تقسیم ملک کے بعد صوبہ جموں کے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں پشکر ناتھؔ، مالک رام آنندؔ، واجدہ راہیؔ، نورشاہؔ، موہن یاورؔ، کشوری چند، ویریندر پٹواری، کشمیری لال ذاکرؔ، عبدالغنی شیخ، پروفیسر ظہورالدین، عمر مجید، غلام نبی، جان محمد آزادؔ، انیس ہمدانیؔ، اشرف انصاریؔ، غلام رسول آزادؔ، واجدہ تبسم، حمیداللہ بٹ، شوک پٹواری، کلدیپ رائنا اور شبیر شاہ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس طرح سے افسانوی روایات کو ریاستی سطح پر فروغ ملنے لگا۔

شیام سندر آنندلہرؔ وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نہ صرف روایتی افسانہ نگاروں کے اثرات قبول کیے بلکہ جدید دور میں نئے رجحانات قبول کر کے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

آنندلہرؔ نے 1972ء میں اُردوافسانہ کے میدان میں اُس وقت قدم رکھا جب انھوں نے پہلی بار ڈگری کالج پونچھ کی میگزین ''آئینہ'' کے لیے افسانہ ''پتھر کے آنسو'' لکھا۔ اس زمانے میں آنندلہرؔ ڈگری کالج

پونچھ میں زیر تعلیم تھے۔اس زمانے میں اُردو افسانہ روایتی ارتقاء کے دور سے آگے بڑھ کر علامتی اور تجریدی تجربات اپنے اندر سمیٹ رہا تھا۔آنند لہر نے بھی اپنے دور کے غالب رجحانات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ایک طرف ان کے مسائل ملکی اور دوسری جانب ریاستی عوام کے مسائل تھے۔چنانچہ انھوں نے نئی تکنیک کے تحت مختصر علامتی اور تجریدی افسانے لکھے۔

علامت نگاری کی روایات کی ابتداء 1875ء میں فرانس میں ہوئی۔بور لیئر نے سب سے پہلے اسے اپنی تحریروں میں پیش کیا۔بور لیئر نے فطرت کو ایک حقیقت کے سمبل کے روپ میں دیکھا۔علامت کسی لفظ کے معنی کے مفہوم کو کہا جاتا ہے۔ہماری زندگی کی سب سے اہم علامت الفاظ ہیں۔تخلیق کار عام طور پر الفاظ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔جو الفاظ علامت بھی ہوتے ہیں۔لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لکھا ہوا ہر جملہ ایک علامت ہے۔

الفاظ کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ظاہری یا خارجی اور داخلی یا باطنی۔علامت کا تعلق الفاظ کے باطنی مفہوم سے ہوتا ہے۔نیز اس کا تعلق فنکار کے شعور سے نہیں بلکہ اس کے تحت الشعور سے ہوتا ہے۔تحت الشعور میں جو کچھ ہوتا ہے اسے وہ علامت کے ذریعے قاری پر آشکار کر دیتا ہے۔اس لیے قاری کو اس کی داخلی نفسیات کا علم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ عوام اور اس کے گرد و پیش میں بکھرے ہوئے معاشرتی، سماجی اور معاشی ماحول کی عکاسی بھی علامتوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

علامت نگاری کی طرح تجریدیت کا آغاز بھی مغرب سے ہوا۔ابتداء میں اس کا استعمال مصوری میں ہوتا تھا۔اس کے بعد ادب میں بھی اس کو شامل کر دیا گیا۔تجربہ کا مقصد اصل میں ایک قسم کا تاثر مرتب کرنا ہوتا ہے۔تجریدی کہانیوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ایسی کہانیوں میں افسانہ نگاری کے لیے ضروری لوازمات غائب ہوتے ہیں۔کہنے سے مُراد یہ ہے کہ تجریدی کہانیوں میں واقعات کردار نگاری وغیرہ سے معدوم ہوتے ہیں۔

کہانی کے عنصر میں سب سے اہم عنصر وحدت تاثر ہوتا ہے۔تجریدی کہانیوں میں یہ عنصر غائب ہوتا ہے لیکن اگر گہرائی سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں تمام تر بکھراؤ کے باوجود کسی نہ کسی نقطہ

واخذ کا احساس ہوتا ہے اور جن کہانیوں میں اِس عنصر کا سرے سے وجود نہیں ہوتا ہے۔ وہ قاری اور ناقد دونوں کی توجہ سے محروم رہتی ہیں۔ یعنی ایسی کہانیاں عام آدمی تو کیا۔ ادباء کی سمجھ میں بھی نہیں آتی ہیں۔

اُردو میں تجریدیت کے رجحان کو برتنے میں انور سجاد، جوگیندر پال، بلراج نیرؔ وغیرہ نے اہم رول ادا کیا۔ ریاست جموں و کشمیر میں تجریدی اور علامتی افسانے لکھنے والوں میں آنند لہرؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ آنند لہرؔ کا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' تجریدی افسانوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اگرچہ آنند لہرؔ سے پہلے علامتی اور تجریدی افسانے تو لکھے جا رہے تھے لیکن کسی نے تجریدیت پر قلم نہیں اُٹھایا تھا لیکن آنند لہرؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فنی لحاظ سے اس میں اضافہ کیا۔

آنند لہر ریاست کے وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے تجریدی افسانے لکھے، وہ اپنے افسانوں میں ایک خواب اور کیفیت کو اُبھارتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر نصرت چوہدری۔

> ''لہرؔ کے یہاں زیادہ تر اینٹی اور تجریدی کہانیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر بغیر پلاٹ اور کردار کے ایک خواب اور کیفیت کو اُبھارا۔ نئے افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پر زندگی کی بے معنویت، معاشی ناہمواری، طبقاتی تضادات، بے چینی اور میکانکی عمل کا احساس ملتا ہے۔ وہیں افسانے کے فن میں تجربے بھی ہوئے ہیں۔ نئے افسانوں میں کہانی کی جھلک ملتی ہے۔ نئے تجریدی افسانوں کی تکنیک اور ہیئت روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔ آنند لہرؔ کے ہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روایتی ارتقاء کے بجائے منتشر واقعات و خیالات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح خواب میں ہم زماں و ہم مکاں کی حدود سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ''انحراف'' جیسے افسانوی مجموعے کو پڑھتے ہوئے خواب کے سے عمل کے تحت زمانی و مکانی حدود کے بجائے واقعات کا ایک منتشر عمل سامنے آتا ہے۔ ان

کے افسانے سڑک، عدالت، رفتار، راستے کا پہاڑ، اور وجود تجریدی افسانے
کے اعلیٰ نمونے کہے جاسکتے ہیں''۔

ذکر ہو چکا ہے کہ آنند لہر نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو سب سے پہلے اپنے گرد ونواح کے ماحول سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف شہری بلکہ دیہاتی زندگی کے رسم ورواج، رہن سہن، اور دیگر مسائل کو اپنے افسانوں میں محسوسات، تجربات، مشاہدات، نفسیات اور احساسات کے ساتھ گہرے معاشرتی، مشاہدات، نفسیات اور احساسات کے ساتھ گہرے معاشرتی شعور کا احساس بھی ہوتا ہے۔ قاری اِن کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے اس چیز کو محسوس کرتا ہے کہ انھیں گرد وپیش کی ہر چیز پر گہری نظر ہے اور ان سب کی عکاسی لہر صاحب نے ایسی فنکاری سے کی ہے کہ طبقے کی جیتی جاگتی تصویریں قاری کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ آنند لہر نے اپنی کہانیوں میں آج کے معاشرے میں گرے ہوئے انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں یک رنگی ہے۔ موضوعات میں تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ خود رقمطراز ہیں۔

''میرے افسانوں کے موضوعات عام طور پر سماجی اور سیاسی ہوتے ہیں۔
جو دیکھتا ہوں وہی لکھتا ہوں۔ سماج میں ہو رہی بُرائیوں سے غفلت کا سیاہ
پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور سماج میں شریف الشکال صفت
بھیڑیا انسانوں کے منہ سے کالا پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں''۔ ۲

شمس الرحمٰن فاروقی۔ آنند لہر کی افسانہ نگاری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

''آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اب کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ انھوں
نے تین دہائیوں کی مدت افسانہ نگاری کے میدان میں صرف کی ہے۔ مزے
کی بات یہ ہے کہ وہ فیشن کی ہوا میں بے راہ روی نہیں ہوتے۔ شروع ہی

۱۔ ڈاکٹر نصرت چوہدری۔ جموں وکشمیر اُردو افسانہ (رسالہ شیرازہ جموں)
۲۔ ایک انٹرویو کے دوران موصوف نے بتایا۔

سے انھوں نے استعارتی اورعلامتی لیکن سہل اورآسانی سے دل میں بیٹھ
جانے والا اسلوب اختیار کیا تھا۔ اس پروہ ہمیشہ قائم رہے۔
معاصر دُنیا کا عکس اِن کے افسانوں میں اس طرح جھلکتا ہے کہ اخباری
رپورٹ معلوم ہو اور نہ وہ اس طرح قدر دھندلا یا گنجلک ہے کہ اس کی
خدوخال کو پہنچانے کے لیے دیر تک اُلجھنا پڑے''۔[۱]

آنند لہر نے اپنے افسانوں میں سیاسی اورسماجی نظام کی کمزوریوں اورعصری صداقتوں کو تخلیقی جامہ پہنا کر پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں میں انسان کی شکست خوررا ہ زندگی کی تصویریں جلوگر ہیں جب ہم اُن کے افسانوی مجموعوں پر نظر ڈالتے ہیں۔تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ آنند لہر کا بنیادی مقصد حقیقت نگاری، ذات کی گہرائی، جنگ بندی، امن وامان اورآپسی بھائی چارے کو مستحکم کرنا ہے۔وہ روزمرہ کے واقعات سے خاکہ تیار کرتے ہیں۔بقول آنند لہر۔

''میں امن اورشانتی چاہتا ہوں۔تمام سرحدیں ختم ہونی چاہییں۔انسانوں
کی تقسیم نہیں ہونی چاہیئے۔آپسی بھائی چارہ ہونا چاہئے۔اسی نقطہ نظر کو میں
''سرحد کے اُس پار'' افسانے اور''سرحدوں کے بیچ'' ناول میں پیش
کیا ہے''۔[۲]

آنند لہر کے افسانوں میں کرداروں کی بھرمار ہے اور ہر کردار کی انفرادیت اورنفسیاتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ ہر کردار جیتا جاگتا اور حقیقی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ان کے افسانوی مجموعہ''انحراف''میں تمام افسانوں کے کردار علامتی ہیں۔مجموعے میں شامل افسانوں میں کہیں سورج، کہیں''الف''اور کہیں''ب''وغیرہ کردار ہیں۔اس سلسلے میں افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''۔۔۔۔تم زخمی کیسے ہوئے۔تمہاری شکل تو الف سے ملتی جلتی ہے

۱۔شمس الرحمٰن فاروقی، رسالہ۔ہماری زبان(ہفت روزہ)

۲۔ایک انٹرویو کے دوران موصوف نے بتایا۔

اور الف تو ہر چیز کی ابتدا ہے''۔

''س'' نے سوال کیا''۔

''دوست الف کو الف نہیں رہنے دیا۔ اسے لفظوں کے بیچ اس طرح گرفتار کیا گیا کہ اس کا وجود ہی بگڑ گیا۔ ''س'' نے ایک بار پھر سوال کیا۔ لفظوں کی جنگ لڑتے لڑتے دراصل لفظ ہمارے ساتھ چپک جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو لفظوں کے سانچے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اپنی اور لفظوں کی کشمکش میں زخمی ہو جاتے ہیں کیونکہ بے جان لفظوں پر اس لڑائی کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ دراصل الف سے لے کر ''ے'' تک سب حروف لفظوں کا محور ہیں۔ سب کا وجود ایک ہی ہے۔ ہم مرتے ہیں لیکن لفظ زندہ رہتے ہیں''۔ [1]

آنند لہر نے اپنے افسانوں میں مردوں کی نفسیاتی خواہشات، خود غرضی، مادیت پسندی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں عورتوں کے مسائل، جذبات، جنسی استحصال اور نفسیات اس کی نامرادی درد اور قربانی کو کھل کر اُبھارا ہے۔ غرض یہ ہے کہ لہر صاحب نے عورت کو اپنے افسانوں میں مختلف روپ میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ماں، بہن، عورت، طوائف اور معشوق وغیرہ وغیرہ لیکن ہر صورت میں ان کے افسانوں کی عورت اپنی تمام نفسیاتی پیچیدگیوں کے باوجود ایک مکمل عورت نظر آئی ہے۔ آنند لہر کا زیادہ تر رجحان عورت کے استحصال کو بیان کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ایک افسانے میں لہر رقمطراز ہے۔

''تمہاری عمر سترہ برس کی نہیں ہو سکتی اور نہ ہے'' اُس نے بڑے اطمینان سے کہا''۔ ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟۔ اگر پیسے کم ہیں تو بولو'' نہیں یہ بات نہیں تمہاری عمر تو ہزاروں برس ہے''۔ وہ کیسے؟ لڑکی نے پوچھا۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔ عورت نے بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔''بڑی مشکل سے

---

[1]۔ آنند لہر۔ انحراف (ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ نئی دہلی)، ص۔ ۱۱

لائی ہوں اس کا باپ مانتا ہی نہیں تھا۔ کرتا بھی کیا۔ بیٹی کو رکھتا بھی کہاں۔ تین بیٹے تھے۔۔ بہوؤں کو بھی آنا تھا۔ لہذا سودا بیٹیوں کے حق میں کیا۔ گھر بنانے کے لیے بیٹی کا سودا کیا" ؎۱

نسوانی کرداروں کے ساتھ مردانہ کردار بھی آپ کے افسانوں کی زینت بن گئے ہیں۔ یہ کردار باپ "بیٹا" اور خاوند کی حیثیت میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں ۔ اور کہیں عورت کے حق میں اور کہیں عورت کو پامال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جبکہ ان کے افسانوں میں عورت مظلوم ،لاچار، بے سہارا اور بے بس نظر آتی ہے۔ یہی وہ مسائل ہیں جو آج ہمارے سماج میں ہر جگہ نظر آتے ہیں لیکن کسی کی نظر ان مسائل پر نہیں جاتی ۔کہانی کار سماج میں ہو رہی ناانصافیوں پر نہ صرف گہری نظر رکھتا ہے بلکہ ان کو دور کرنا بھی چاہتا ہے۔

آنند لہر نے اس کیفیت کو اپنے افسانہ "جسم بستی" میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

"تمام پارٹیوں نے متفقہ طور پر ثریا کو اپنا اُمیدوار بنا دیا۔ یعنی کے عورت کے تئیں وفاداری اور ہمدردی دکھائی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ثریا الیکشن جیت گئی۔ اور ممبر اسمبلی بن گئی ۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اسمبلی کے اندر جاتے ہی اس خوالہ سسٹم کے خلاف آواز اُٹھائے گی تا کہ آئندہ کسی عورت کو خوالہ کرنے کی کوئی مرد جرأت نہ کر سکے ۔ آوازوں نے اِسے پھر گھیرنا شروع کر دیا۔ ایک لاکھ روپے کیونکہ جاگرناتھ کا چیف منسٹر بنا ضروری ہے ۔ دو لاکھ روپے ساتھ میں داس رام آپ کی ذات کا بھی ہے۔ ثریا حیران رہ گئی ۔ پھر وہی آوازیں۔ خوالے ہو جاؤ گی مالا مال ہو جاؤ گی۔ منسٹر سے آگے بہت آگے ۔ ثریا کو محسوس ہوا یہاں بھی جسم بکتے ہیں ۔ آتما بکتی ہے ۔ آتما پرماتما کا روپ ہے ۔ عورت صرف جسم ہے ۔ وہ کسی بھی روپ میں ہو۔ وہ کہیں بھی ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ چاہے منسٹر ہو جائے یا کوٹھے

؎۱۔ آنند لہر۔ سرحد کے اُس پار (سیمانت پرکاشن، روہیلہ اسٹریٹ، نئی دہلی) ص۔ 67-66

پر رہے۔حوالہ سسٹم ختم نہیں ہوگا'' ۔ ۱

آنند لہر نے افسانوں کی اگر کردارنگاری کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ راجندر سنگھ بیدی اور پریم چند سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی کہانیاں بھی سماجی مسائل کو پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کردارنگاری ان کے ہم پلہ ہے۔

''۔۔۔۔۔ان کے افسانے زندگی کی کاوشیں ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی طرح کھٹے، میٹھے، کڑوے کسیلے اور تیز ہوتے ہیں اور ان افسانوں کے کردار کسی دور دراز دیس کے اجنبی نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے افراد ہوتے ہیں'' ۔ ۲

آنند لہر کے افسانوں میں ذات، سماج، معاشرہ، سیاست، بے روزگاری، سرمایہ کاری، مفلسی، جنسی خواہشات کے ساتھ ساتھ فرسودہ رسومات، مذہبی ڈھونگ، ضعیف الاعتقادی کا بھی تجزیہ ملتا ہے۔ انھوں نے افسانوں کو زندگی کے قریب لانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی عبادت میں چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ روانی اور سلاست اِن کے ہر مضمون میں پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں روزمرہ کی باتیں عام ملتی ہیں۔ قاری چاہے کم پڑھا لکھا ہو۔ یا زیادہ اِن کے تحریر کیے ہوئے افسانوں کو بہت جلدی ہی سمجھ لیتا ہے۔ وہ قلم اور الفاظ کی عظمت کو بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ کم الفاظ میں زیادہ اور مکمل بات کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اِن کے افسانوں میں عام بول چال کی زبان پائی جاتی ہے۔

اسیر کشتواڑی اِن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''۔۔۔''انحراف'' لہر صاحب کے تجریدی افسانوں کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ جو پڑھنے اور غور کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مصنف کا ہنر اور اس کی کامیابی ورق ورق سطر سطر لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں

۱۔ آنند لہر۔ سرحد کے اس پار (سیمانت پرکاشن روہیلہ اسٹریٹ نئی دہلی)۔ص۔۷۳

۲۔ انور کمال حسینی۔ آنند لہر ایک جدید افسانہ نگار ''انحراف'' ملک بک ڈپو، نئی دہلی۔ 2009ء۔ص۔3-4

جو لہرؔ کو ادبی دُنیا میں ایک منفرد اور بلند مقام دلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں"۔[1]

آنند لہرؔ کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے اس میں چاشنی، شگفتگی اور مٹھاس ملتی ہے۔ یہ عام سے موضوع کو اس طرح کے اسلوب میں ڈھال لیتے ہیں کہ وہ ایک آفاقی کہانی بن جاتی ہے۔ مختصر جملے ان کے افسانوں کی جان ہیں۔ آپ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بے لاگ صفحہ قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔ آپ قاری کو ذہن میں رکھ کر لکھتے ہیں۔ اور اِسے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لہرؔ کے افسانے موجودہ دور میں زبان کے اعتبار سے بے مثال نظر آتے ہیں۔

آنند لہرؔ کے دوسرے افسانوی مجموعے "سرحد کے اس پار" کے افسانے روایتی ہیں۔ ان میں سیدھا سادہ انداز ملتا ہے۔ اِن کے افسانوں کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں جذباتیت اور رومانیت کی جھلک کم و پیش ہر افسانے میں ملتی ہے۔ مثلاً بنجارن، سرحد کے اس پار، رنگ ساز، تندور، پھول والی وغیرہ وغیرہ۔

آنند لہرؔ کشمیر کے تہذیب یافتہ ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے سرحد کے مسائل اور انسانوں کی تقسیم کے بعض اہم مسائل کو اُجاگر کیا ہے۔ ان افسانوں میں سرحد کے اس پار، گولائی، رشتے، چھوٹی سی آواز اور بنجارن وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی دبی کچلی عوام اور ان کی زندگی کے مسائل بھوک، بے روزگاری، جہالت اور محرومی کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

آنند لہرؔ کے افسانوں کے پلاٹ مضبوط اور لچک دار ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کہانی کا پلاٹ تیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی کے درپیش مسائل ان کے افسانوں کے موضوعات بنتے ہیں۔ اس لیے ان میں قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے آپ کے افسانے زندگی کی حقیقت سے بالکل قریب تر نظر آتے ہیں۔ مثلاً سرحد کے اُس پار، بنجارن، گولائی، راستے کا پہاڑ اور سولھواں برس وغیرہ وغیرہ۔

---

[1]۔ اسیر کشتواڑی۔ آنند لہرؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

آنندلہر کے افسانوں کی علامتیں واضع اور دلکش ہیں۔ ان کے افسانوں میں سوچ کا مثبت پہلونظر آتا ہے۔وہ زندگی سے فرار ہونے کے بجائے اُس سے مقابلہ کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ان کے علامتی افسانے سولھواں برس، راستے کا پہاڑ، ایک دو دلیر نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب پر محیط نظر آتے ہیں۔ دوسرے علامتی افسانے دراصل وجود، پانی کی لکیریں، سورج کا قتل، بے چہرہ لوگ اور عمر وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

آنندلہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' ہے۔اس میں 33 افسانے شامل ہیں۔ 96 صفحات پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ 1975ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ اِس افسانوی مجموعے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے 2002ء میں اسے دوبارہ ملک بک (3212) ترکمان گیٹ نئی دہلی والوں نے اِسے دوبارہ شائع کیا۔اس کے مطالعے سے لہر کی فنی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کے نام یہ ہیں۔

(۱)سولھواں برس (۲) راستے کا پہاڑ(۳) وجود(۴) سفر(۵) پانی کی لکیریں(۶) دائرہ (۷)جواب (۸) زندگی کے زخم(۹) آندھی(۱۰) الجھن (۱۱) بے چہرہ لوگ(۱۲) ریت کا چشمہ (۱۳)سورج کا قتل (۱۴) گولائی (۱۵) نروان (۱۶) قیدی (۱۷) لمحہ (۱۸) بے معنی صدا (۱۹) وجود کی جنگ (۲۰) بکھرے لفظ (۲۱) اندھی لکیریں (۲۲) زخم (۲۳) گھر (۲۴) راوٗے (۲۵) عمر (۲۶) سراب (۲۷) بے بس لوگ (۲۸) الفاظ (۲۹) چیخ (۳۰) پردیسی (۳۱) رفتار (۳۲) سڑک (۳۳) علامت وغیرہ ہیں۔

آنندلہر کے افسانوی مجموعے ''انحراف'' سے ہی کافی مقبول ہوگئے تھے۔انور کمال حسینی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''انحراف''میں روایتی افسانے نہیں ہیں بلکہ اِن افسانوں کوروایتی افسانہ نویسی سے بغاوت کہا جاسکتا ہے۔ واقعی یہ تجریدی افسانے ہیں۔ چونکہ روایتی افسانوں سے الگ ہیں۔مطلب کی بات ان میں براہِ راست کہہ دی گئی ہے۔آنندلہر کے یہ افسانے (Abstract) ضرور ہیں لیکن زندگی کی تلخیاں ان میں موجود ضرور ہیں۔یہ افسانے عام قاری کے لیے نہیں ہیں

کیونکہ پہیلیوں میں کہی بات ان ہی کے دل کو لگتی ہے جو زندگی سے جھوجھتے
ہیں اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو سمجھنا چاہتے ہیں'' ۔ا

آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' ہے۔ چودہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ اسی صفحات پر محیط ہے۔ اس مجموعے کو انھوں نے اپنے دوستوں کے نام کیا ہے۔ اس افسانوی مجموعے پر ان کو بہار اُردو اکادمی اور کئی دوسری ادبی انجمنوں نے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل افسانوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) سرحد کے اُس پار (۲) سپیرن (۳) گوری (۴) شکست (۵) واپسی (۶) رشتے (۷) چھوٹی سی آواز (۸) پھول والی (۹) زندگی (۱۰) منو (۱۱) تندور (۱۲) جسم بستی (۱۳) بنجارن وغیرہ وغیرہ ہیں۔

''سرحد کے اس پار'' افسانوی مجموعے کا دیباچہ شرون کمار ورما نے لکھا ہے۔ جو بحیثیت شاعر، افسانہ نگار اور قانون دان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کا سن اشاعت 2001ء ہے ۔اس کو سیمانت پرکاشن نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

''سرحد کے اس پار'' افسانوی مجموعے میں ایک طرف عورت کو موضوع بنایا گیا ہے تو دوسری طرف سرحد پر بحث کی گئی ہے۔ آنند لہر اس بات کو جانتے ہیں کہ لیڈروں، کھلاڑیوں، سیاست دانوں اور چوروں کی طرح عام آدمی بھی سرحد کے اُس پار لوگوں سے ملیں ۔ وہ کوئی بھی سرحد نہیں چاہتے۔ انسانوں کی بنائی ہوئی سرحد بارڈر وغیرہ سب فضول ہیں۔

''کورٹ مارشل'' آنند لہر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل (۲۲) بائیس افسانے ہیں۔ انسانی زندگی میں درپیش آنے والے مسائل کو اُنھوں نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے ان کہانیوں میں پیش کیا ہے ۔اس مجموعے کا دیباچہ نامی انصاری نے تحریر کیا ہے۔ یہ مجموعہ 2006ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ افسانوی مجموعہ 150 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کو لہر نے محلّہ سرائے (پونچھ) کے اُن پڑوسیوں کے نام کیا جن کی محبت آج بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کے نام یہ ہیں۔

ا۔ انور کمال حسینی۔ ''انحراف'' ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ ۔نئی دہلی ۔2002ء۔ص۔۷

(۱) اب تھانہ چل پڑے گا (۲) دادی اماں (۳) کورٹ مارشل (۴) سپاہی (۵) دُعا (۶) سنہرا کفن (۷) کھیر (۸) گواہوں کا بیوپاری (۹) چند لمحے (۱۰) ویشیا (۱۱) برف اب بھی سفید ہے (۱۲) گوتم بدھ سڑک (۱۳) صرف ایک آدمی (۱۴) کرایہ کا مریض (۱۵) خالی ہاتھ (۱۶) ٹھنڈا چہرہ (۱۷) اگر ایسا ہوا (۱۸) فائر بریگیڈ (۱۹) تیروں کا کھیل (۲۰) تیاگ (۲۱) ایک خبر (۲۲) انسان کب جیتے گا وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام کہانیوں میں ہمارا سماج سسکیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی ''اب تھانہ چل پڑے گا''۔ ہمارے سماج کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کہانی میں لہر نے ایک پرسکون گاؤں کی زندگی کو جہنم میں بدلتے ہوئے دکھایا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ وہاں پر ایک پولیس چوکی قائم کی جاتی ہے۔ بعد میں وہ چوکی تھانہ بن جاتا ہے۔ اور جب یہ تھانہ قائم ہوا تو اُس وقت سے اس کا ہر نوجوان جرم کرتا ہے یعنی کہ ہر بُرائی وہاں سے جنم لیتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

> ''صاحب بونی ہوگئی۔ لگتا ہے کہ تھانہ چل پڑے گا''۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک یہاں کی نوجوان لڑکیوں کے جسم ننگے ہیں۔ گویا انھوں نے کپڑے پورے پہنے ہوئے ہیں۔ یہاں کا ہر نوجوان جرم کرتا ہے۔ پولیس چوکی کے بعد اب یہاں تھانہ بنا ہے۔ اور پولیس ہیڈ کوارٹر ہے اس لیے تمام سیاسی وقانونی میٹنگیں یہاں ہوتی ہیں''۔[۱]

اس طرح کی ایک اور کہانی ''سنہرا کفن'' ہے۔ جس میں ایک غریب گھرانے کی زندگی کو پیش کر کے غربت میں دبے ہوئے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''کھیر'' ایک ایسی کہانی ہے۔ جہاں ایک طرف غربت کا پرچا ہے۔ وہاں دوسری طرف غریب لوگوں کی عزت کا کھلواڑ بڑے لوگوں کے ہاتھوں نہ ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی نوعیت کا افسانہ ''فائر بریگیڈ'' بھی ہے۔ الغرض زیر بحث افسانوی مجموعے کی تمام کہانیاں انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر قاری کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ آنند لہر نے اپنے اِن افسانوں میں سماج کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں زبان

---

[۱] آنند لہر۔ کورٹ مارشل (مانوی پرکاشن پنج تیرتھی، جموں)۔ ص۔ ۱۹۱

وبیان کے حوالے سے بھی عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔

آنند لہر کی افسانہ نگاری کے حوالے سے نامی انصاری یوں رقمطراز ہیں۔

''آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں کے تانے عموماً چست و درست ہوتے ہیں اور ان میں شاذ و نادر ہی کو بھول ہوتا ہے۔ وہ ہر موضوع کو اس کے منطقی انجام تک بخوبی پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پامال موضوعات کو نہیں چھوتے۔ بلکہ افسانوں کے لیے نئے نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانیت کی اکائی پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اس کو ملکوں اور مانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے۔ کیونکہ ذہن کی سرحدیں بناوٹی ہیں۔ اور انسان کی انسانیت کو سرحدوں سے نہیں ناپا جاسکتا'' ۔ [۱]

آنند لہر عصری اُردو افسانہ کے افسانہ نگاروں میں آج ایک بلند مرتبہ کے مالک ہیں۔ اور وہ آج بھی انسانی زندگی کے پہلوؤں کو پیش کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں اِن کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ کتابی شکل میں یہ افسانوی مجموعہ 2010ء میں شائع ہوا۔ اس میں 34 افسانے شامل ہیں۔

(۱) بٹوارہ (۲) دادی اماں (۳) سمندر کا پانی (۴) موسم بدلتے رہتے ہیں
(۵) پھیکے آم (۶) رانی رانی غم خوار (۷) دوسری بے انصافی (۸) سنہری مچھلی
(۹) تھوڑی سی غلطی (۱۰) حساب جیومیٹری (۱۱) ایک داغ (۱۲) یہ سرحدیں
(۱۳) انصاف (۱۴) آگ (۱۵) وہ کِدھر جائے (۱۶) دوسرا بٹوارہ
(۱۷) جج صاحب (۱۸) ہتھیار (۱۹) اُس نے سوچا (۲۰) کلفیاں
(۲۱) عشق کی ہار (۲۲) سوال (۲۳) سونامی (۲۴) اور انتظار

۱۔ نامی انصاری۔ پیش لفظ (کورٹ مارشل) از آنند لہر۔ 2005ء۔ ص۔۱۲

(۲۵) اُن کے بچے (۲۶) ہار کی جیت (۲۷) درمیان میں وہ (۲۸) بیراگن

(۲۹) تپسیا (۳۰) لوگ لوگ ہیں (۳۱) گھر (۳۲) زمین کی فروخت

(۳۳) دوسری سوچ (۳۲) ایک اور ہجرت

اس مجموعے میں زیادہ تر کہانیاں انسانی زندگی کے مسائل، انسانی اقدار کا زوال اور دوسرے کئی موضوعات پر مبنی ہیں۔ گویا یہ تمام کہانیاں آج کے سماج کا عکس نظر آتی ہیں۔

آنند لہر نے کسی بھی تحریک یا ازم کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک نہیں رکھا۔ البتہ ان کی کہانیوں میں پریم چند۔ منٹو، بیدیؔ، اور کرشن چندرؔ کے فن کی چھاپ ضرور دکھائی دیتی ہے۔ بقول آنند لہرؔ۔

''میرے مطالعے میں سب سے زیادہ افسانے کرشن چندر کے رہے۔

اور سب سے زیادہ متاثر مجھے بیدیؔ کی کہانی ''لاجونتی'' نے کیا''۔ [۱]

آنند لہرؔ کے افسانے اکثر ملکی و گیر ملکی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں ماہنامہ ''شاعر، ممبئی، حیات، نئی دہلی۔ روزنامہ ہندوستان۔ بارباں، پاکستان، ہماری زبان۔ دہلی، سبق اُردو، پروازِ ادب، اُردو دُنیا، انساب وغیرہ کی فہرست ہے۔ اس کے علاوہ دورِ حاضرہ میں کچھ رسائل و جرائد آنند لہرؔ کے نام سے خصوصی گوشے نکل رہے ہیں۔ ان میں تحریک ادب، کلکتہ، مژگان، بنارس، شاعر، رنگ، آنند لہرؔ شخصیت اور فن سبق اُردو وغیرہ ہیں۔

اس کے علاوہ ''بٹوارہ'' کہانی پر حال ہی میں ڈی ڈی کاشر نے ایک سیریل نشر کیا۔ جس کو عوام نے بہت پسند کیا۔ ان کی کہانیوں پر ٹیلی فلمیں، اور ریڈیائی ڈرامے بھی بنے ہیں۔ آنند لہرؔ کے کچھ افسانے ہندی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہوئے ہیں۔ لہرؔ کی فن کاری کی عظمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' انگریزی میں ''گل بدن'' کے نام سے ترجمہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اور اب کویت میں اس ناول کا عربی زبان میں ترجمہ ہو رہا ہے۔

آنند لہرؔ کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ملک کی بہت ساری اکادمیوں اور ادبی تنظیموں نے انہیں

---

[۱]۔ ان خیالات کا اظہار۔ آنند لہرؔ نے راقم کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران کیا۔

انعامات اوراعزازات سے بھی نوازا ہے۔جن میں راجستھان اُردواکادمی انعام، اترپردیش اُردواکادمی انعام، بہاراُردواکادمی انعام، میراُردواکادمی لکھنوانعام، پراچین کلاکیندرچندی گڑھ انعام، جموں وکشمیراُردورائٹرفورم انعام ۔ لالہ جگت نارائن جالندھرانعام ،نمی ڈوگری سنستھاانعام، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اُردوڈیپارٹمنٹ اعزاز، اُردوپروفیشنل اعزاز، امریکن بائیوگرافیکل انسٹی چیوٹ کامین آف دی ایوارڈ، ادیان اکادمی اُڑیسہ اعزاز، انتر راشٹریہ سمن اپادھی سنستھان کی طرف سے ''ساہتیہ من'' اعزاز، صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ڈراما ''بٹوارہ'' پر-/50,000ہزارروپے بطورانعام دیئے گئے۔اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی میں افسانوی مجموعہ ''انحراف'' اور ''بٹوارہ'' اورتین ناولوں پرایم فل کروائی گئی ہے۔

آخر میں مجموعی سطح پر یہ کہاجاسکتا ہے کہ آنندلہر دورحاضرہ کے ایک نمائندہ افسانہ نگارہیں۔جن کے افسانے اُردوافسانہ نگاری کی روایات میں افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے روایتی افسانوں کے ساتھ علامتی اورتجریدی افسانے بھی لکھے ہیں۔اسی وجہ سے ان کے افسانوں مجموعے ہرطرح کے موضوعات سے لبریز نظر آتے ہیں۔اور ہر موضوع ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔اب تک آنندلہر نے تقریباً (104)افسانے لکھے ہیں۔

اسیر کشتواڑی آنندلہر کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''واقعی یہ تجریدی افسانے ہیں۔بنیادی طور پر روایتی افسانوں سے الگ ہیں۔تجریدی افسانوں اورعلامتی سے بغاوت کرکے چندروایتی افسانوں میں بھی تجربے کیے ہیں۔جوکامیاب ہیں۔جن کی کامیاب مثال افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار''۔بدلتے ہوئے حالات کی تیزی اورمعاشرے کی شکست وریخت میں جونئے مسائل اُبھرکرسامنے آئے ہیں۔انھوں نے انسانی ذہن میں انتشارپیداکردیاہے۔ آج کے افسانہ نگاروں کواس انتشار سے پیداہونے والی صورت حال سے اثرلےکراپنی تحریر میں اوراندازِ بیان میں وسعت پیداکرنی چاہیئے ۔لہر سے اس ضمن میں اُمیدیں وابستہ ہیں

کہ وہ قانون کی مصروفیات سے وقت نکال کر کچھ اور کارنامے سرانجام دیں گے''۔[۱]

اس کے علاوہ آنند لہر کی افسانہ نگاری کا دوسرے نقادوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ رسالہ، آب جو، (کشتواڑ) آنند لہر نمبر میں فدا کشتواڑی نے مستند حضرات کے مضامین کو یکجا کر کے ''آنند لہر، فن اور شخصیت'' کے نام ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی، آنند لہر کی افسانہ نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

''آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اب کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ انھوں نے تین دہائیوں کی مدت افسانہ نگاری میں صرف کی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ فیشن کی ہوائیں بے راہ روح نہیں ہوئے۔ شروع سے ہی انھوں نے جو استعارتی اور علامتی لیکن سہل اور آسانی سے دِل میں بیٹھ جانے والا ادب اختیار کیا ہے۔ اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے''۔[۲]

آنند لہر موجودہ دور میں بھی اپنے تجربات اور مشاہدات کو افسانوی رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آنند لہر اپنی کہانیوں میں موجود دور سیاسی، سماجی، نفسیاتی، اور ہمدردی کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ کمار پاشی ایک جگہ لکھتے ہیں۔ جن لوگوں کو نئے اُردو افسانے میں کہانی پن کی تلاش ہے۔ وہ آنند لہر کے افسانوں کو ضرور پڑھیں۔ جن میں عصری صداقتوں کو تخلیقی فن کاروں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

آنند لہر کا شمار اُردو کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ اب تک لہر صاحب کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''انحراف''، ''سرحد کے اس پار''، ''کورٹ مارشل'' وغیرہ ہیں۔ جہاں تک ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' کا تعلق ہے۔ اگر چہ اس مجموعے میں 33 افسانے شامل ہیں لیکن کچھ افسانے ایسے

---

[۱] اسیر کشتواڑی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

[۲] شمس الرحمٰن فاروقی، آنند لہر کی افسانہ نگاری۔ رسالہ ''آب جو''۔ ص۔ ۸۴

ہیں جوقاری کو پڑھنے کے بعد بے حدمتاثر کرتے ہیں اوراس کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑتے ہیں۔اُن افسانوں کامختصر جائزہ لیناضروری سمجھتا ہوں۔

''انحراف'' کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

''انحراف'' آنند لہر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ 1975ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ مقبولیت کی وجہ سے اسے 2002ء میں ملک بک ڈپوئی دہلی نے اس افسانوی مجموعہ کو دوبارہ شائع کیا۔ 96 صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعے میں 33 افسانے شامل ہیں۔ کتاب کے فلیپ پر ایک طرف مصنف کی خوبصورت تصویر اور ساتھ میں مختصر حالات زندگی تحریر کی ہوئی ہے۔ کتاب میں شامل افسانوں کے نام یوں ہیں۔

(۱) سولھواں برس (۲) راستے کا پہاڑ (۳) وجود (۴) سفر
(۵) جواب (۶) پانی کی لکیریں (۷) دائرہ (۸) زندگی کے زخم
(۹) آندھی روشنی (۱۰) الجھن (۱۱) بے چہرہ (۱۲) لوگ
(۱۳) ریت کا چشمہ (۱۴) سورج کا قتل (۱۵) گولائی (۱۶) نروان
(۱٦) قیدی (۱۷) لمحے (۱۸) بے معنی صدا (۱۹) وجود کی جنگ (۲۰) بکھرے لفظ
(۲۱) اندھی لکیریں (۲۲) گھر (۲۳) عمر (۲۴) زاویے (۲۵) سراب
(۲٦) زخم (۲۷) بے بس لوگ (۲۸) الفاظ (۲۹) چیخ (۳۰) پڑوسی
(۳۱) رفتار (۳۲) سڑک اور (۳۳) عدالت

آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' میں شامل تقریباً افسانے نفسیاتی نوعیت کے ہیں۔ ان افسانوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں لہر صاحب نے عصرِ حاضر کے مشینی نظام میں جکڑے ہوئے انسان کی بے بسی، مصنوعی پن، بدلتی ہوئی اقدار، روایت، زندگی کا کھوکھلا پن اور ذہنی کش مکش کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر چہ لفظوں کے اعتبار سے زیر بحث مجموعے میں شامل افسانے مختصر ہیں لیکن فنی اور معنوی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ گویا لہر صاحب سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ زیر تبصرہ افسانوی مجموعے کے بارے میں انور کمال حسین رقمطراز ہیں۔

> ''انحراف'' میں روایتی افسانے نہیں بلکہ اِن افسانوں کو روایتی افسانہ نویسی سے بغاوت کہا جا سکتا ہے۔ واقعی یہ تجریدی افسانے ہیں۔ چونکہ روایتی افسانوں سے الگ ہیں۔ مطلب کی بات ان میں براہ راست کہہ دی

گئی ہے۔ آنند لہر کے یہ افسانے Abstract ضرور ہیں لیکن زندگی کی
تلخیاں ان میں موجود ہیں۔ یہ افسانے عام قاری کے لیے نہیں ہیں کیونکہ
پہیلیوں میں کہی بات اِن ہی کے دِل کو لگتی ہے۔ جو زندگی سے جھوجھتے ہیں
اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو سمجھنا چاہتے ہیں''۔ [1]

جیسا کہ انور کمال حسینی نے لکھا ہے کہ آنند لہر نے تجریدی انداز اپنا کر اپنے بناوٹی اور کھوکھلے معاشرے پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے مختصر افسانے لکھ کر ایک طرف طنز کے نشتر پھینکے ہیں تو دوسری طرف معاشرے کے ناسوروں کو بے نقاب بھی کیا ہے۔

لہر صاحب کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے چند افسانوں کا مختصراً جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔

سولھواں برس: سولھواں برس آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' کا پہلا افسانہ ہے۔ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ جس میں سماج میں بسنے والے شریف النف اشکال میں چھپے انسانوں کے مزاج کا تجزیہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کہانی کار نے انسانی زندگی کے ایام شباب کو موضوع بنایا ہے۔ انسان کی زندگی میں جوانی کا حصہ بڑا اہم ہوتا ہے یعنی سولھواں برس میں انسان کی جوانی شباب پر ہوتی ہے۔ اس عمر میں انسان اچھے بُرے غرض دونوں طرح کے کام سرانجام دیتا ہے۔ کئی بار اُس سے انجانے میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے یا پھر کوئی اسے بہکا دیتا ہے۔

افسانے کے شروع ہی میں کہانی کار نے یہ نصیحت کی ہے کہ راستے جہاں مڑتے ہیں انسان کو بھی ویسے ہی موڑ کاٹنے چاہیئے کیونکہ کوئی بھی چیز جو چلتی ہے وہ طے شدہ راستے پر ہی چلتی ہے۔ لہذا انسان کو بھی وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے۔

چوں کہ تبدیلی ایک قدرتی عمل ہے لہذا ہر شے میں
ایک لازمی عنصر ہے بلکہ قانونِ فطرت ہے۔ بقول شاعر

---

[1]۔ انور کمال حسینی، مقدمہ مشمولہ ''انحراف'' ملک بک ڈپو نئی دہلی۔ سن۔ 2002۔ ص۔ 17

بدلتے دور میں جس نے بدل جانا نہیں سیکھا
اُس کو ڈالتی ہے گردشِ ایام خطرے میں

اس زمانے میں آنند لہر نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کسی بھی حالت میں بھی دوسرے انسانوں کی تعداد معلوم کر سکتا، انسان کا وجود اس دُنیا میں اتنی تیز رفتاری سے عمل میں آرہا ہے کہ یہ بات سوچ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انسانوں کی تعداد ایک راز ہے۔ کون کب شامل ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ لہر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

> ''دوسرے آدمی کا جواب سن کر پہلے نے مسافروں کو گننا شروع کر دیا۔ ایک، دو، تین، چار، کیوں گن رہے ہو۔ یہ جاننے کے لیے کہ ہم کتنے تھے اور کتنے رہ گئے۔ کیونکہ کون کب شامل ہوا۔ اس بات کا شامل ہونے والے کو بھی، کون کب بچھڑا اس بات کا بچھڑنے والے کو بھی علم نہیں۔۔۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لہر صاحب، علامتی افسانہ نگار، انتظار حسین سے بھی متاثر ہیں۔

اس افسانے میں زمانے کی نوعیت کو بیان کیا گیا ہے۔ بالخصوص دورِ حاضرہ میں لوگوں کے ذہنوں میں جس قدر تبدیلی آئی ہے۔ اس بات کو کہانی کار نے موضوع بحث بنایا ہے جو کچھ حال کے دور میں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے اُسے ایک معتبر آدمی یا عام شخص بھی اپنی زبان سے دہرا نہیں سکتا لیکن اس کے باوجود دیکھ کر محسوس کی ہوئی بات کو فنکار اپنے ہاتھوں سے تصویریں بنا کر ظاہر کرتا ہے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف شناخت کے اعتبار سے یوں تو انسان خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ ننگا دکھائی دیتا ہے۔ کہنے سے مُراد یہ ہے کہ انسان نے ایسے کپڑے پہننے شروع کر دیئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ننگا ہے۔

---

[1] ۔ آنند لہر۔ انحراف (ملک بُک ڈپو۔ نئی دہلی) ص۔ ۱۸

اس کے بعد آہر نے وقت کو علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ وقت ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا ہے اور ہر انسان کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''سولھواں برس'' متبرک برس ہے۔ اس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ ''سورج کے سامنے پہلا قتل اُس وقت ہوا تھا جب چاند سے اس کی روشنی چھین لی گئی تھی۔'' دراصل آہر اس جملے میں سورج کے سامنے قتل ہونے کا اشارہ یہ پیش کر رہے ہیں کہ سورج کو سپریم کورٹ سے منسوب کیا گیا ہے۔ سپریم کورٹ سے کوئی دو چار کلومیٹر کملا مارکیٹ میں روزانہ ہزاروں بے گناہ لڑکیوں کی عزت لوٹی جاتی ہے لیکن سپریم کورت کچھ بھی کاروائی نہیں کرتا بلکہ ایسا جرم کرنے والوں کو لائسنس اور حفاظت مہیا کرتا ہے۔ سورج کے سامنے قتل ہوتے ہیں اور وہ خاموش بُت کی طرح کھڑا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''۔۔۔۔۔اور پھر بڑھیا رات کے سائے میں اپنی عمر کا ''سولھواں برس'' زندگی کی نالی میں ڈھونڈتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاغذ پر لکھی گندی گالی ہو۔ حالاں کہ سبق یہ تھا کہ متبرک برس ہے۔ جسے تمام لوگوں نے سنبھال کر رکھنا ہے''۔[۱]

آہر صاحب نے اس مقام پر اُن لوگوں کا پردہ فاش کیا ہے جو ظاہری طور سیدھے سادھے معلوم ہوتے ہیں لیکن باطنی سطح پر اُن کا رویہ خونخوار بھیڑیا جیسا ہے۔ کہانی کار کو اس بات کا بھی علم ہے کہ موجودہ دور کا انسان لالچی، خودغرض اور ہوس پسند بن گیا ہے۔

افسانے کے کلائمکس میں کہانی کار نے دُنیا کو ایسے کارواں سے تعبیر کیا ہے جس کے نہ آغاز کا پتہ چلتا ہے اور نہ انجام کا۔ یعنی انسان کی دونوں منزلیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود آئے دِن نئے نئے مسافر پہ در پہ شامل ہو رہے ہیں اور اسی کارواں میں ختم ہو رہے ہیں۔ کہانی کار نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

> ''بس ایک کارواں ہے جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ مسافر اس میں شامل ہوتے

---

[۱] آنند آہر۔ انحراف۔ (ملک بُک ڈپو، نئی دہلی)۔ 2002ء۔ ص۔ 10

ہیں اور ختم بھی اس میں ہو جاتے ہیں''۔

اس افسانے میں مصنف نے علامتوں کا سہارا لے کر بہت سارے پوشیدہ رازوں کو بے نقاب بھی کیا ہے۔

راستے کا پہاڑ: ''راستے کا پہاڑ'' آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' میں شامل دوسرا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں کہانی کار نے انسانی زندگی اور ضمیر کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں جنگ اور لڑائی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُن کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ہے بلکہ انسان اسے یوں ہی مول لیتا ہے۔ اس افسانے میں کہانی کار نے علامتی انداز میں سماج کی حقیقتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کہانی کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اور پڑھنے والے کو سوائے 'س' اور 'ش' کے علاوہ کوئی شخصی کردار نظر نہیں آتا۔ یہ کردار گوشت پوست کے نہیں بلکہ صرف حروف ہیں۔

کہانی کار نے لکھا ہے کہ پہاڑ ہی ہمارا سب سے بڑا دُشمن ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جسے سر کرتے ہوئے ہمارے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں۔ آخر اسی نے ہمارے ساتھ دُشمنی مول لی ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> ''دراصل ہم غلط سمجھتے تھے''۔ 'س' نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ پہاڑ جسے ہم دیوتا سمجھ کر پوجتے رہے وہی ہمارا سب سے بڑا دُشمن نکلا''۔ وہ پہاڑ جس کو سر کرتے کرتے ہمارے پاؤں زخمی ہو گئے تھے''۔[1]

آنند لہر نے ہوا کی اصلیت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہوا کی زبان اپنی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ درختوں کے پتوں کو زبان بنا کر اپنی آواز ہم تک پہنچاتی ہے۔ انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اصل میں ساری لڑائی عقل و سمجھ کی ہے لیکن ناقص العقل اِس حقیقت کو سمجھنے میں قاصر ہے۔ دراصل پانی کو آگ اور آواز کو خاموشی ختم کر دیتی ہے۔ اس کیفیت کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

> ''پتے ہواؤں کی زبان ہیں۔ جب ہوا چلتی ہے۔ تو یہ تڑپتے ہیں۔ کیوں کہ ہوا بول سکتی ہے۔ ''زخمی نے تڑپتے ہوئے کہا''۔ ساری لڑائی سمجھ کی ہے ۔دوست ورنہ یہ آگ ہی ہے جو ہمیشہ پانی کو جلاتی ہے۔ یہ خاموشی ہی ہے

---

[1] آنند لہر۔ انحراف (ملک بک ڈپو، نئی دہلی) 2002ء۔ ص۔ 11

جوآواز کواپنے ساتھ بہالیے جاتی ہے۔۔۔''لیکن تم زخمی کیسے ہوئے۔
تمہاری شکل تو 'الف'' سے ملتی جلتی ہے۔اور'الف'تو ہر چیز کی ابتدا ہے''۔ ا

آنند لہر نے اس افسانے میں اپنے خیال کومختلف پیرائے میں بیان کیا ہے۔انھیں سماج پر گہری نظر ہے۔ جہاں ایک طرف وہ حقیقت کی بات کرتے ہیں وہیں دوسری طرف انھیں سماج میں ہورہی بدعنوانیوں اور بُرائیوں پر بھی نظر ہے۔وہ سماج میں ہورہی لڑائی ۔جھگڑے۔دنگے ،اور فساد وغیرہ کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ان کے نزدیک جنگ کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ۔وہ سماج کے ہر فرد پر یہ تنقید کرتے ہیں کہ انھیں یہ جنگ سماجی بُرائیوں کے خلاف لڑنی چاہیئے نہ کہ بلاوجہ جنگیں چھیڑنی چاہییں ۔جنگ کے متعلق کہانی کار نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے انگوٹھی کو انگلی میں پہنا تھا۔ بہت سارے لوگوں نے زور آزمائی کی ۔لیکن بے سود۔جس نے ہی ہاتھ ڈالا۔اُس کی انگلیاں ہی کٹ گئیں یعنی ہر وہ شخص جس نے جنگ میں حصہ لیا، گھاٹے میں رہا۔آپ نے کچھ ایسا ہی منظر اس اقتباس میں پیش کیا ہے۔

''لیکن پھر بھی تم زخمی کیسے ہوگئے ۔اس نے پھر اپنے سوال کو دہرایا۔بے وجہ جنگ لڑتے لڑتے۔لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ جنگ کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ۔
تمہیں شاید معلوم نہیں کہ سامنے محل کے کھنڈروں کی دیواروں پر کبھی نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں پاگل شخص نے لکھا ہے''یہاں پر ایک بار اس لیے سخت جنگ لڑی گئی تھی کہ سامنے پڑی ہوئی انگوٹھی کو کون اپنی انگلی میں پہنے گا۔
اور اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سب کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں''۔ ۲

اس افسانے میں تجریدیت جابجا جھلکتی نظر آتی ہے۔آپ نے لفظوں کو موضوع بنا کر دل کی بات بہت خوبصورتی سے کہی ہے۔آپ کا ماننا ہے کہ زندگی بھر ہمیں لفظوں سے پالا پڑا ہے۔ لفظ دراصل انسان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتے ہیں۔لفظوں کا ہم کچھ بھی نہیں باڑ سکتے۔دُنیا میں ہر چیز فانی ہے لیکن لفظ لافانی ہیں۔

ا۔آنند لہر۔انحراف۔ملک بک ڈپو۔نئی دہلی۔2002ء۔ص۔11
۲۔آنند لہر۔انحراف۔ملک بک ڈپو۔نئی دہلی۔2002ء۔ص۔12

''دراصل لفظ ہمارے ساتھ چپک جاتے ہیں۔اورہم نے اپنے آپ
کولفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور پھراس کش مکش
میں زخمی ہوجاتے ہیں۔ہم مرتے ہیں لیکن لفظ زندہ رہتے ہیں۔ایک شخص
نے لفظوں کو پتھروں کے ساتھ باندھ کرسمندر میں پھینک دیا تھا۔مگر بعد میں
ہوا یہ کہ پتھر ڈوب گئے اور لیکن لفظ سمندر کے اوپر پھیل گئے'' [1]

کہانی کار نے لفظوں سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب بتائی ہے کہ کروڑوں لفظ جنھیں ختم کرنا بہت مشکل ہے لیکن انھیں کاٹ کر چند حروف میں بانٹ دیا جائے۔انھیں مارنا آسان ہوجاتا ہے۔اس پیراگراف میں لہر صاحب نے اتفاق کی بات کی ہے جب تک انسانوں میں یا کسی بھی قوم میں اتفاق ہے اسے ختم کرنا ایک مشکل اور ناممکن کام ہے۔اسے مارنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ انھیں نسل، رنگ، ذات پات یا زبان کی بنیاد پر بانٹ دیا جائے تو آسانی کے ساتھ ایک ایک کر کے ختم ہوجائیں گے۔

افسانہ راستے کا پہاڑ کے آخری حصے میں ''پہاڑ'' کو محافظ بتایا گیا ہے۔دراصل پہاڑ ہی ہماری حفاظت صدیوں سے کرتا چلا آرہا ہے۔اور ہم نے محض شک کی بناء پر اسے اپنا دُشمن تصور کیا ہے۔جب حقیقت کُھلی تو معلوم ہوا کہ اس پہاڑ کے پیچھے وہ چشمہ ہے جس کا پانی پینے سے انسان مرجاتا نہیں بلکہ موت سے نجات حاصل کرجاتا ہے گویا کہ پہاڑ کے پیچھے ''آبِ حیات'' ہے۔

یہ مختصر افسانہ علامتی انداز کی بناء پر تہہ در تہہ معنویت کا حامل ہے۔

جواب: آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' میں شامل افسانہ ہے۔اس میں آنند لہر نے انسانیت کے سارے تقاضوں کو پیش کیا ہے۔لہر کے اس افسانے کو اگر ''انحراف'' کا دِل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اس افسانے کی ابتدائی چند سطور کو پڑھنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کہانی کار کا مشاہدہ وسیع ہے۔آنند لہر نے اس کہانی میں زندگی کے اُن چھوٹے چھوٹے حقائق کو اُبھارہ ہے جو انسان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے وابستہ ہیں۔انسان دانستاً یا نادانستاً ان حقائق سے ٹکراتا ہے۔کہانی کار کی طبیعت کا یہ خاصا ہے کہ وہ سماج میں ہو رہی

---

[1] ۔انحراف۔ملک بک ڈپو۔نئی دہلی۔2002ء۔ص۔12

تبدیلیوں کوبغورد یکھتاہے اورپھران کودوسروں تک پہنچانے کے لیے دلکش انداز میں صفحہ قرطاس پراُتاردیتاہے۔

آہر صاحب نے انسانی زندگی کوایک سوال قراردیاہے لیکن اس سوال کاجواب نہیں ملتا۔ اگرکہیں ملتابھی ہےتووہ صحیح نہیں ہوتا۔ دراصل سوال کااشارہ اُمید کی طرف ہے۔آہر صاحب اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زندگی اُمید ہے۔قائم ہے۔اور ہرشخص اس بھوال کے ساتھ جی رہاہے لیکن کم ہی لوگ ایسے ہیں جواس سوال کاجواب جانتے ہیں۔آہر نے صدی اورلمحہ کوبھی سوال وجواب کی اسی لڑی میں پرویاہے کہ ایک لمحہ مل کرصدی بنتی ہے۔گویااسے ایک ایک لمحے کاانتظارکرناپڑتاہے۔

آنندآہر نے اس افسانے میں اس حقیقت کاانکشاف کیاہے کہ آج کے دورکاانسان خودغرض ہوچکاہےاورتنہائی کاشکارہے۔اس نقطہ نظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنندآہر یوں لکھتے ہیں۔

> ''ایک صدی ایک لمحہ کاانتظارکرتی رہی لیکن لمحہ صدی میں کھویارہا۔صدی لمحہ کے لئے پریشان رہی اورلمحہ اس جدوجہد میں تھا۔کہ کس طرح آزادہو۔ یہ ایک عجیب سی جنگ ہے۔ ہرچیزالگ ہوکراپناوجودبناتی ہے۔لیکن اس کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے۔جدوجہدکرنی پڑتی ہے۔نرگس بہارسے الگ ہوکراپناوجودضروررکھتی ہے لیکن بہارکی دلکشی سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہرچیزاپناجواب چاہتی ہے۔وجودکاجواب سایہ ہےاورسائے کاسایہ ایک سوال ہے'' ۔[1]

آنندآہر نے زیرِنظرافسانے میں ایک جگہ یہ واضح کیاہے کہ کئی بارنسان کسی چیز کامالک ہونے کے باوجوداس سے فائدہ نہیں اُٹھاسکتا۔جس طرح سمندر میں ملاّح پانی نہیں پی سکت، سمندر میں موجودسیپ سمندرسے پانی کاقطرہ تک نہیں لے سکتی ۔ٹھیک اسی طرح انسان کئی بارسامنے کی چیزوں سے فائدہ نہیں اُٹھاسکتا۔ ایک شخص جیسے پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کاایک ٹکڑاچاہیئے لیکن اُس کے سامنے کچے اناج

---

[1] ۔آنندآہر انحراف ۔ملک بُک ڈپونئی دہلی ۔2002ء۔ص۔20

کا اگر ڈھیر لگا دیا جائے تو اُس کے لیے بے سود ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کے سہارے جی رہا ہوتا ہے۔ وہی اس کی موت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ جیسے کائنات میں سارے جاندار ہوا کے سہارے جیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہی ہوا اُن کے لیے مہلک بن جاتی ہے۔ اس نقطہ کی وضاحت موصوف نے یوں کی ہے۔

''وہ کشتی سمندر میں بالکل اکیلی جارہی ہے۔ سمندر شانت اور خاموش پھیلا ہوا ہے۔ لیکن مانجھی پیاسہ ہے۔ تنہا ہے۔ ایک مانجھی سمندر کی پیاس کی وجہ سے مرگیا۔ سمندر بارش دے سکتا ہے جس سے دریا بنتے ہیں۔ لیکن سیپ کو پانی کا ایک قطرہ نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے آسمان کی مہربانی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چند منٹوں کے لیے زمین کو چھوڑ دے تو انسان، حیوان، درخت، سبھی مرجائیں لیکن کبھی کبھی انسان آندھی میں گُٹ کر مرجاتا ہے'' [1]

موصوف نے مختلف مثالیں دے کر انسان کو زندگی کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے باغ کی مٹی ہی گلاب اُگا سکتی ہے۔ صحرا کا ریت اس نعمت سے بے بہرہ ہے کیونکہ اس کا اپنا وجود نہیں ہوتا ہے۔ انسان اگر دوسروں کو اپنا ساتھی بنانا چاہے۔ تو اسے پہلے اپنا وجود سنوارنا پڑتا ہے اور اپنے اندر بہت سی خصوصیات پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ قد وقامت میں چھوٹا بڑا ہونا، شکل وصورت میں خوبصورت یا بدصورت ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ انسان کی عقل اور اُس کے کارنامے ہی اس کی پہچان بنتے ہیں۔ غرض یہ کہ آنند لہر نے تجریدی انداز اختیار کرتے ہوئے علامتوں کی مدد سے بنیادی حقیقتیں واضح کی ہیں۔

دائرہ: ''دائرہ'' آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ کہانی کار نے اس افسانے میں تجریدی انداز اختیار کیا ہے۔ افسانہ کو پڑھ کر یہ عیاں ہوتا ہے کہ لہر صاحب سماج میں ہو رہی بُرائیوں کو نا قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ آپ نے زندگی کی بے ثباتی کو واضح کیا ہے۔ لہر صاحب نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اصل میں فانی ہے۔ اور اس کی زندگی وہیں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں سے اس کی زندگی شروع ہوئی تھی۔ کہنے سے مُراد یہ ہے کہ انسان کو مٹی ہی سے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان

[1] آنند لہر۔ انحراف (ملک بک ڈپو نئی دہلی) 2002ء۔ ص۔ 20-21

اپنے پیٹ کی اگنی بجھانے کے لیے اوراپنے وجود کوقائم رکھنے کے لیے دُنیا کے مختلف ملکوں کا چکر کاٹتا ہے اورایک دائرے کی شکل میں گھومتے ہوئے موت کے ذریعے پھراس مٹی میں چلا جاتا ہے۔لہذاانسانی زندگی ایک دائرہ کی مانند ہے۔جس کا آغاز اور اختتام ایک ہی نقطے پر ہے۔لہذاانسان کواسی اپنی مختصرسی زندگی میں بُرائیوں،فسادات ، اورفتنوں میں نہیں اُلجھنا چاہیئے بلکہ اصلی مقصد پر قائم رہنا چاہیئے۔لَہر صاحب ایک جگہ رقمطراز ہیں۔

''دائرہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں آکر ختم ہوجاتا ہے۔اس لیے زندگی کے آغاز اورانجام کے متعلق لڑائی فضول ہے اورلفظوں کوکھوکہ کتابوں کے خلاف بغاوت کرکے اپنی حقیقت کو پہنچانیں''۔[1]

اس کہانی میں ایک ساتھ کئی موضوعات کوزیر بحث لایا گیاہے۔کہیں وہ زندگی کی بے ثباتی کاذکر کرتے ہیں۔کہیں انسان کے اس دُنیامیں رہنے کوقید خانہ کہتے ہیں۔کہیں وہ دُنیا کی ظاہرداری اوردکھاوے کواپنا موضوع بحث بناتے ہیں۔اس افسانے میں لَہر صاحب نے زندگی کی گہری تصویر پیش کی ہے۔کہانی کااسلوب اچھوتا ہے۔جہاں تک اس افسانے کی زبان کاتعلق ہے۔وہ بالکل سادہ اورعام فہم ہے۔محاورات کابہت کم استعمال کیا گیاہے۔لیکن کہانی کے پلاٹ کواس طرح سے تیار کیا گیاہے کہ سارے واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔کہانی کامفہوم مبہم ہےاور ہرلفظ کے معنی پہ در پہ نظر آتے ہیں۔اورقاری کوپڑھتے وقت مشاہدات کاسامنا کرنا پڑتا ہے۔

مجموعی طور پر لَہر کاایک افسانہ،افسانہ نگاری کے اُن تمام تقاضوں کوپورا کرتا ہے۔جوایک کامیاب افسانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔نیز تجریدی افسانے کی کسوٹی پر بھی پورا اُترتا ہے۔

پانی کی لکیریں:

''پانی کی لکیریں'' آنند لَہر کے افسانوی مجموعہ ''انحراف'' میں ایک خوبصورت اورعلامتی افسانہ ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے زندگی کی مختلف پرتیں کھولی ہیں۔ ہر پرت ایک نئے راز کی عکاسی کرتی

---

[1]۔آنند لَہر۔انحراف۔ملک بک ڈپوئی دہلی۔2002ء۔ص۔25

ہے۔کہیں وہ انسان کو ریت کا بنا ہوا گھر قرار دیتے ہیں تو کئی لڑکیوں کے وجود کو پانی کا وجود قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ انسانی وجود کو ایسی چیز سمجھتے ہیں۔جس کی کوئی پابندی نہیں۔انھوں نے بڑھاپے میں جا کر بچپن کے دِنوں کی کہانی دہرانے کا منظر پیش کیا ہے۔فن کار اُس دور کی بات کی ہے کہ جب انسان بالکل بے بس ہوتا ہے۔اسے ہر کام کے لیے دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔تب وہ اپنی زندگی کے اُن دنوں کو یاد کر کے افسوس کرتا ہے۔کہ میرا بچپن کہاں گیا۔بچپن کے کھیل کو دکون چرا کر لے گیا۔

> ''آخر کھلونے بنانا اور توڑنا بھی سو سال کے بوڑھے بچے نے اس وقت سیکھا تھا جب اس کی جوان ماں اُس کے بوڑھے باپ سے روٹھ کر مان جایا کرتی تھی اور اس کا جگڑا اسی بات پر تھا۔ کہ بچپن کے کھیل کو دکون چرا کر لے گا۔اور سامنے والی دیوار پر کس نے لکھا کہ تمام رشتوں کی حقیقت صرف لفظ ہیں۔ جو اپنا مطلب بدلتے رہتے ہیں۔اور پھر دادی اماں اپنے پرانے دنوں کو یاد کرنے کے لیے اپنے نوجوان پوتے کو یہ صلاح دیا کرتی ہے کہ ''لڑکیوں کے پیچھے نہ گھوما کر۔'' حالاں کے اس کے پیچھے وہ کنکر ہے۔جوان کے لڑکپن کی یاد ہے''۔[1]

آنند لہر نے لالچ، حرص ،فساد اور لڑائی وغیرہ کو فضول قرار دیا ہے اُن کا ماننا ہے کہ زندگی کا آغاز اور انجام ایک دائرے کی مانند ہے۔ جو ایک نقطہ سے شروع ہوتا ہے اور طویل مسافت طے کرنے کے بعد پھر اُسی نقطے پر ختم ہو جاتا ہے۔زیر بحث افسانے میں دوڑتی۔اُبھرتی۔سسکتی زندگی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ اسے بغیر لاگ لپیٹ کے صفحۂ قرطاس پر اُتارتے رہتے ہیں۔

آنند لہر نے اس افسانے میں زندگی کی بے ثباتی کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔ ریت کے گھروں کا مقصد بکھرنا اور پتھر کے گھروں کا مقدر ٹوٹنا ہے۔اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہانی کار نے انسان کو مشورہ دیا ہے کہ آپ جہاں بھی ہو۔زندگی کے جس مقام پر ہو۔رختِ سفر باندھ کر اپنی اُس زندگی کی تیار کرو۔جہاں

---

[1]۔آنند لہر۔انحراف۔ملک بُک ڈپو نئی دہلی۔2002ء۔ص۔22

آپ کو جانا ہے۔ یہ دُنیا محض ایک کہانی ہے۔ایک سراب ہے۔اس لیے ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنا دامن بچاتے ہوئے منزل کی طرف بڑھے۔چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔

''ریت کے گھروں کا مقدر بکھرنا ہے اور پتھر کے گھروں کا مقدر ٹوٹنا ہے۔
اس لیے جہاں بھی ہو سامان باندھ کر تیار رہو۔ بوڑھے پتے جوان درختوں
جسم پر زخم ہیں۔اور اُن کی وہ کہانیاں ہیں۔ جو وہ دوسروں کو سناتے رہتے
ہیں۔جسم زخموں کی مرہم تو نہ بنے مگر داغ دار ہو گئے اور شبنم مٹی کے داغوں
کو کبھی دھو نہ سکے گی'' ۔ ۱

زندگی کے زخم: زندگی کے زخم آنند لہر کا اہم افسانہ ہے۔اس میں دُنیاداری۔حقیقت شناسی،لالچ اور حرص تنگ نظر اور خوردنوش جیسے موضوعات پر کھل کر بحث کی گئی۔

زیر نظر افسانے کے آغاز میں ہی کہانی کار نے دھوپ اور چھاؤں میں کش مکش دکھا کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔دراصل کہانی کار یہاں پر اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ انسان کو خوشی اور غمی دونوں مواقعوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے ۔لیکن آج کا انسان اتنا مصروف ہو گیا ہے۔کہ اُسے کارواں میں شامل ساتھیوں کی کوئی خبر نہیں رہتی ۔ دوڑ دھوپ میں کئی شخص زخمی ہو جاتے ہیں۔بغیر کسی وجہ سے چیخ اُٹھتے ہیں ۔کہانی کا اقتباس ملاحظہ کریں:۔

''دھوپ اور چھاؤں کی جنگ میں درختوں کے پتے زخمی ہو گئے اور ہواؤں
کے زخم اُن کے چہروں پر نمودار ہونے لگتے ہیں ۔ زخمی پتوں نے چاروں
طرف درد کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر شخص بغیر کسی وجہ کے چیخ
رہا ہے۔'' ۲

اس افسانے میں آنند لہر نے موجود دور کے انسان کو لالچی اور خود غرض دکھایا ہے کہ انسان راستے چلتے

۱۔آنند لہر۔انحراف ۔ملک بک ڈپو،نئی دہلی ۔2006ء۔ص۔23

۲۔آنند لہر۔انحراف ۔ملک بک ڈپو نئی دہلی ۔2002ء۔ص۔26

ہوئے بھی اپنی لالچ بھری آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھتا ہے۔کئی بار وہ لالچ میں اس قدر گم ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا راستہ تک معلوم نہیں ہوتا۔

کائنات میں موجود انسان کا یہ قافلہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کھانا کھاتا ہے۔کچھ اعلیٰ قسم کے کھانے کھاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں کھانا ہی نہیں ملتا۔ایسے لوگوں نے چیزوں کا رُخ بدلنا شروع کر دیا۔بیوپاری بن گئے ہیں لیکن اس تجارت میں انھوں نے لالچ اور حرص کو بھی شامل کر دیا ہے جس سے اُن کے چہرے بھی بدل گئے ہیں۔ان کی زندگیاں اچھائیوں اور بُرائیوں دونوں کیفیت کی مظہر بن گئی ہیں۔لالچ کے دوڑ یہاں تک کہ لوگ سورج کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔اس بات کو آنند لہر نے یوں بیان کیا ہے۔

''وہ سب ٹھوکروں سے زخمی ہو گئے۔ان میں ہر ایک زخمی ہے۔لہولہان ہے۔جگہ تھوڑی ہے اور آدمی زیادہ، کیونکہ لین دین میں یہ اُلجھے ہوئے یہ لوگ آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔گو کے آگے میلوں زمین خالی پڑی ہے۔ان میں سے ہر ایک کی خواہش بن گئی ہے کہ وہ سورج کو پکڑ کر اپنی جیب میں ڈال لے اور ساری زمین پر اندھیرا کر کے پھر اپنی مرضی سے روشنی بانٹے''۔

افسانہ نگار نے اس افسانہ کے آخری پیراگراف میں قارئین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ لوگ جو سورج اور چاند پر اپنی حکومت کرنے کی کوشش کرتے ہیں انھیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔اگر اِن لوگوں نے زبردستی سورج اور چاند پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو خسارے میں رہیں گے۔اگر وہ لوگ اپنی پہچان بنانا چاہتے ہیں تو وہ اپنے گھر کی اصلاح کریں۔چاند، سورج کو پکڑنا ایک فضول عمل ہے۔اس کو پکڑ کر اپنی زندگی زخمی مت بنائیں کیونکہ زندگی کا زخم کبھی مٹتا نہیں۔

اندھی روشنی:

''اندھی روشنی'' افسانوی مجموعہ ''انحراف'' میں شامل ایک دلچسپ افسانہ ہے۔یہ کہانی بنیادی طور پر علامتی ہے۔کہانی کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ دُنیا میں انسان جو بڑے کام کرتا ہے اُن کا اثر نہ صرف اُس کی ذات پر پڑتا ہے بلکہ آنے والی نسل پر بھی۔اس کے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں یعنی انسان

محاشی، شراب نوشی، جواخوری، زناکاری، رشوت خوری، اور گانے ناچ وغیرہ میں مشغول رہتا ہے۔ اس طرح کی زندگی میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے اس کے پاؤں سے جو دھواں اُٹھتا ہے۔ وہ بچوں کے پھیپھڑوں میں ایسی بیماری پیدا کرتا ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ انسان کے یہ کرتوت دیکھ کر پرندے بھی یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دُنیا میں بسنے والے حسین جسم کس لیے ہیں؟ کیا ان کا یہی کام ہے کہ۔ غریبوں، مجبوروں اور لاچاروں کا حق دبائیں۔ وہ مجبور اور لاچار جو اپنے خون پسینے کی کمائی کرتے ہیں لیکن چور اور غدار لوگ ان کے حق کو دبا دیتے ہیں۔ اور انھیں اپاہج کر دیتے ہیں۔ یہ بے بس اور مجبور لوگ دیوتاؤں سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کاغذ کہاں پر ہے جس پر لکھا ہے کہ انسان خدا کا بیٹا ہے۔

یہ افسانہ نہایت ہی مختصر ہے۔ کہانی کار انسان کو اس کے دھندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مشورہ دیتا ہے کہ ونے جو راستہ اختیار کیا ہوا ہے نہایت ہی خطرناک ہے۔ لالچی اور خود غرض انسان کی دوڑ تھوڑی ہوتی ہے۔ وہ وقت کوئی زیادہ دور نہیں ہے جب یہ غریب لوگ اپنا بدلہ لینے کے لیے کھڑے ہوں گے اور یہ سوال اُٹھائیں گے کہ مذہب اور دیوتاؤں کی تعلیم کو پامال کرنے والو، ہمارا حق دبانے والو ہم سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔

وجود: افسانہ ''وجود'' کا موضوع اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس فانی دُنیا میں کسی بھی شے کا وجود پائیدار نہیں ہے۔ ہر زندہ شے کو جلدی یا دیر سے فنا ہونا ہے۔ حتیٰ کہ آسمان کا وجود بھی بے معنی ہے۔ اس دُنیا میں بڑے بڑے شہر، پہاڑ، درخت وغیرہ ریت کی مانند ہیں۔ جسے ہر وقت فنا ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ موسم بھی ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتے۔ یہاں کہانی کار نے انسان کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ خوبصورت زندگی کا باغ اُجڑ جائے۔ ایسا کام کرنا چاہیئے جس سے دوسروں کو بھی فائدہ ہو۔

کہانی کار نے اس حقیقت کو بھی موضوع بحث بنایا ہے کہ اصل میں انسان کا منبع ایک ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے لیکن ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتے ہیں۔ کیوں کہ انسانوں کو ناموں، رشتوں اور ناطوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں انسان، انسان ہی ہے ۔ ناموں، رشتوں، ناطوں کا حامل تین لفظ ہیں۔ میں، تم اور وہ۔ میں تم اور وہ اصل میں مذہبوں کے فلسفے ہیں۔

جنھیں انسان نے تیار کیا ہے۔لیکن بچوں کے سامنے اس کی کوئی قیمت نہیں اور بنا مذہب وملت ،ذات پات، رنگ ونسل باہم ملتے کھیلتے ہیں۔ یہ بچے مذہبوں کے کاغذوں کی کشتیاں بنا کر بہادیتے ہیں۔

اس افسانے میں کہانی کار نے جدید دور کی بات کی ہے۔ جہاں رشتے ،ناطے اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔ مذہب وملت کی کوئی اہمیت نہیں افسانے کی زبان شگفتہ ہے۔لطیف اور شیریں طرز اسلوب مختصر جملے اس افسانے کی شان ہیں۔روزمرہ کے محاورات اور بول چال کی زبان برتی گئی ہے۔جہاں تک اس افسانے کے انجام کا تعلق ہے۔نہایت ہی ڈرامائی اور سبق آموز ہے۔انسان کو اس وقت عقل آتی ہے۔ جب وقت بیت چکا ہوتا ہے۔تب تک دُنیا کی لالچوں میں مگن رہتا ہے۔ اس کو یہ معلوم ہے کہ اس کا وجود ختم ہونے والا ہے ۔پھر بھی اُسے قائم رکھنے کے لیے تنگ و پریشان رہتا ہے۔

یہ افسانے تجریدی کہانی کا بہترین نمونہ ہے۔فن کار نے بہت سی علامتیں واضح کی ہیں ۔جن سے ذہن بہت سی حقیقتوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔اور جدید دور کے انسان کا المیہ ابھرنے لگتا ہے۔

بے بس لوگ:''بے بس لوگ'' آنند لہر کی ایک علامتی کہانی ہے۔اس میں لہر نے انسان کی بے بسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔دُنیا کو قید خانہ بتایا گیا ہے۔ جب کہ بنی نوع انسان اس میں قید ہے۔کوئی بیماری تو کوئی رشتوں کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس طرح کوئی ملازمت کے بندھنوں میں پھنسا ہے۔ گویا ہر شخص کسی نہ کسی طرح قید ہے۔

کہانی کار نے زیر بحث افسانہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمام مذاہب سچائی پر زور دیتے ہیں اور ایک ہی منزل مقصود کی طرف لے جاتے ہیں۔انسان کو اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کو بھی توقیر کی نظر سے دیکھنا چاہیئے ۔اس افسانے میں کہانی کار نے موسم کو استعارہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس لافانی دُنیا میں جو لوگ دُکھوں میں قید ہیں ۔وہ رہائی پانا چاہتے ہیں کہ ہمیں آزاد کرو۔اُسی وقت ایک بچہ باہر آتا ہے اور دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے اور یہ الفاظ پکارتا ہے کہ ان لوگوں کو رہائی چاہیئے ۔اس افسانے میں آنند لہر نے لفظوں سے کرداروں کا کام لیا ہے۔کہانی کا ہر ایک بند ایک الگ مفہوم واضح کرتا ہے۔افسانے کا انجام نہایت دلکش ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

''وہ دروازہ کھٹکا تا رہا ہے اور وہ شخص اس کے قریب زور سے چیخ رہا ہے

۔ ان لوگوں کو رہائی چاہیئے ۔ اور وہ اس دور کا پیغمبر ہے کیونکہ

آواز بلند کر رہا ہے اور یہ دور آواز بلند کرنے والوں کا ہے اور کمرے کے

اندر لوگ دُعا کر رہے ہیں کہ کاش ہمیں بھی آزادی مل جائے''۔[1]

اُلجھن: ''الجھن'' ایک مختصر سا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں کہانی کار نے لالچ کو موضوع بنایا ہے کہ انسان لالچ کے چکر میں اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ ایسا گھر بنائے جس میں ساری دُنیا سما جائے۔ لالچ میں وہ رشتے، ناطے، پیار و محبت سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک ہوس کی آگ جل رہی ہے۔ جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

انسان حقیقت کو بھول گیا ہے کہ اس کا وجود فانی ہے۔ یعنی کہ اس کے وجود کو ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی تین حصوں پر محیط ہے۔ بچپن، جوانی، اور بڑھاپا۔ جس کو کہانی کار نے ماضی، حال اور مستقل سے تعبیر کیا ہے اور تلقین کی ہے کہ انسان کو ہمیشہ ماضی، حال اور مستقبل کو یاد رکھنا چاہیئے۔

زیرِ نظر افسانے کی زبان سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ کہانی کار نے کرِداروں اور مکالموں کے بغیر افسانے کی عمارت کھڑی کی ہے۔ افسانے کا انجام نہایت ہی موثر اور سبق آموز ہے۔

نرِوان: نروان مختصر اور دلچسپ افسانہ ہے۔ بنیادی طور پر یہ بھی علامتی کہانی ہے۔ نروان میں زندگی کے سفر کا ذکر کیا۔ زندگی اصل میں ایک سفر ہے۔ اس سفر کے دوران انسان مختلف مراحل سے گذرتا ہے۔ خواہشات کے جال میں انسان اس قدر پھنسا ہے کہ اُسے اپنے حواس پر قابو نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ جو وہ اعمال کر رہا ہے اُن کا انجام کیا ہوگا۔ دُنیا میں انسان کے ساتھ ساتھ زندہ چیزیں بھی تخلیق کی گئی ہیں جن کا کنٹرول صرف خُدا کی رات کے ہاتھ میں ہے۔ کسی سفر کے دوران انسان خوش رہتا ہے۔ لیکن جوں ہی منزل کے قریب آتا ہے اس کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اپنی بیوی بچوں کا بھی خیال نہیں

---

[1]۔ آنند لہر۔ انحراف۔ ملک بُک ڈپوئی دہلی۔ 2002ء۔ ص۔ ۷۶

رہتااور وہ اپنے سفر کی تیار میں لگ جاتا ہے۔

گھر: افسانہ ''گھر'' میں اس جنگ وجدل اور قتل وغارت کا کہانی کار نے ذکر کیا ہے کہ انسان دوسروں کے گھروں کو تباہ وبرباد کر کے بچوں کو قتل کر کے فتح کا جشن مناتا ہے۔ حالاں کہ بزرگوں کی نصیحت تھی کہ معصوموں کا قتل ہرگز نہ کرنا کیوں کہ بچے وقت کی خوشبو اور آنے والے کل کے رہنما ہیں لیکن ظالم انسان بچوں کی خواہشوں کو، بیویوں کی آرزوؤں کو اور پھولوں کی خوشبوؤں کو روندتا چلا جارہا ہے۔ کہانی کار یہاں پراس بات کو عیاں کرنا چاہتا ہے کہ انسان کو دوسرے کے گھر کے ساتھ اتنی ہمدردی ہونی چاہیئے جتنی ماں اور بچے میں ہوتی ہے۔ انسان دوسروں کا خون صرف ایک لفظ ''یت'' کے لیے بہاتا ہے لیکن وہ اپنی ہار سے بے خبر ہے۔

اس افسانے میں دورحاضرہ میں ہورہی قتل وغارت، تباہی، بربادی اور انتشار کی طرف اشارہ کیا ہے ۔اس دور میں انسان، انسان نہیں رہا ہے بلکہ درندہ بن گیا ہے۔ وہ بے کس، بے سہارا، عورتوں، بچوں اور نہتوں پر ظلم ڈھاتا چلا جارہا ہے۔ وہ خُدا کے خوف سے بھی بے خبر ہے۔

ریت کا چشمہ: آنند لہر کا یہ افسانہ بھی مختصر اور دلچسپ ہے ۔ اس افسانے میں لہر نے مختصراً مگر بلند خیالی سے اس دُنیا کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ قدرت کے کارناموں اور کارخانوں کو انسان اپنے بس میں نہیں لاسکتا۔ اس دُنیا کا ازل سے وجود شروع ہوا ہے اور اس کا اختتام قیامت کے دن ہوگا۔ جب تمام مردے زمین (قبروں) سے باہر نکالے جائیں گے ۔ سورج سوا نیزے کے قریب ہوگا۔ گویا ایک ریگستان ہوگا۔

الغرض اس مختصر سی کہانی میں حشر کے دِن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جہاں ہر ایک کو اپنے کیے ہوئے کا حساب دینا ہوگا۔

''سرحد کے اُس پار'' افسانوی مجموعہ کے چند افسانوں کا تنقیدی جائزہ

''سرحد کے اُس پار'' آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعہ میں تمام افسانے روایتی انداز کے ہیں۔یہ افسانوی مجموعہ چودہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔اس کے کل اسی صفحات ہیں۔اس مجموعہ کو سیمانت پرکاشن نئی دہلی نے 2001ء میں شائع کیا ہے۔مجموعے کا نام شامل کہانیوں میں پہلی کہانی کے نام پر رکھا گیا ہے۔''سرحد کے اس پار'' کا دیباچہ شرون کمار ورمانے تحریر کیا ہے۔جو ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر، افسانہ نگار اور قانون دان ہیں۔لہر صاحب نے اس مجموعہ کو اپنے ان اہم جماعتوں کے نام کیا ہے۔جو انھیں اکثر یاد آتے ہیں۔''سرحد کے اس پار'' میں شامل چند نمائندہ افسانوں کا جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔

سرحد کے اس پار: یہ افسانہ تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں آنند لہر نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو سرحدیں بنائی گئی ہیں۔بالخصوص ریاست جموں وکشمیر کے علاقوں میں جو سرحد ہے اس کو موضوع بحث بنایا ہے۔لہر نے سرحد کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ایک سنگین انسان بھی یہ بات سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سرحدیں بے معنی ہیں۔جن کی حفاظت کے لیے سپاہی کھڑے کردیے گئے ہیں۔دونوں اطراف کے لوگوں کی خواہش، آرزوؤں اور اُمنگیں ہیں۔دونوں اطراف کے لوگوں کے سینوں میں دِل دھڑکتے ہیں اور دونوں ملکوں کے رہنے والے لوگوں کے دِل میں سرحد کو جھانک جھانک کر ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا چاہتے ہیں لیکن ہو نہیں سکے۔کیونکہ درمیان میں سرحد ہے۔دونوں ملکوں میں جو کام ہو رہا ہے وہ ایک ہی طور طریقے سے ہو رہا ہے۔جیسے دونوں طرف کے لوگ ایک طرح ہنستے ہیں۔ایک طرح روتے تھے۔لڑکیاں بھی ایک ہی انداز سے جوان ہوتی تھیں۔بھوک و پیا بھی ایک جیسے طریقے سے لگتی ہے۔غرض ہر کام ایک جیسا ہوتا ہے۔

''سرحد کے اُس پار'' افسانے میں گوپی اور روشن دو کردار ہیں۔جن کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان کی سرحد۔عوام کے جذبات اور دونوں ملکوں کی ہر چیز برابر بتائی گئی ہے۔گوپی ہندوستان میں رہنے والی ایک نوجوان لڑکی ہوتی ہے اور روشن پاکستان کا ایک نوجوان لڑکا ہوتا ہے۔دونوں جوانی میں آجاتے ہیں۔سرحدوں پر دونوں ملکوں کے فوجی جوان سخت پہرہ دے رہے ہوتے ہیں۔سرحدوں پر دونوں ملکوں کے فوجی جوان سخت پہرہ دے رہے ہوتے ہیں۔گوپی اور روشن دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں

اورسرحد کی پرواکیے بغیر گوپی روشن سے ملنے سرحد کے اُس پار جاتی ہے۔ اس طرح سے دونوں کا سرحد اِدھر سے اُدھر سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی روشن اور کبھی گوپی سرحد پار کرتی ہے ۔دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔اس بات کو آنندلہر نے اس طرح سے پیش کیا ہے۔مثلاً

> ''پھر ایک دِن وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔گوپی کی آنکھیں روشن کی آنکھوں سے لڑ گئیں۔ بیچ میں فوج کھڑے رہے۔ٹینکوں نے بھی سینہ تان رکھا تھا۔ہوائی جہاز بھی سرحدوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ملکوں کے نقشے بھی قائم تھے ۔ پھر آنکھوں نے دعوت دی تو اُنھوں نے سرحد کو اس طرح پار کیا جیسے کوئی عام راستہ ہو''۔[1]

آخر کار ایک دِن گوپی کی ماں کو کینسر ہو جاتا ہے۔وہ اس بات سے بڑی پریشان ہو جاتی ہے لیکن جب روشن کو اس بات کا پتہ چلتا ہے تو اُس کو بھی بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے اس کا باپ بھی اس بیماری کا شکار ہوا تھا ۔ یہ کینسر کی بیماری سرحد کے اس پار بھی اور سرحد کے اُس پار بھی ۔اس کا علاج نہ اِدھر اور نہ اُدھر ہے۔ سرحد کی اس طرف بھی غربت ہے اور اُس طرف بھی۔ اس بات پر روشن اپنے آپ سے سوال کرتا ہے؟۔آخر کار یہ سپاہی کس کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب انسان کو مارنے کے لیے کینسر پہلے ہی سے موجود ہے۔یہ فوجیں اور ہتھیار کس لیے ہیں؟۔

پھر کافی عرصہ تک ایک دوسرے کی ملاقات نہیں ہو پاتی ۔پانی اور ہوا میں وہ ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہوا اور پانی کی کوئی سرحد نہیں ہوتی ۔ایک دِن روشن اپنے محبوب سے ملاقات کرنے کے لیے سرحد پار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن وہ سرحد پر پکڑا جاتا ہے۔اس کو قیدی بنا کر سرحد کے فوجیوں کے راز پوچھے جاتے ہیں۔وہ اس بات سے حیران ہے کہ فوج کے راز کیا ہیں۔ مار پیٹ کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ دوسرے دِن جب اُسے ہوش آتا ہے۔تو وہ اپنے آپ کو ایک فوجی عدالت میں پاتا ہے۔ جہاں پر ایک فوجی افسر اُسے پوچھتا ہے۔آنندلہر نے کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے۔

---

[1] آنندلہر۔سرحد کے اس پار (سیمانت پرکاشن نئی دہلی)،2001۔ص۔12

''جب دونوں ملکوں کے لیڈر ملتے ہیں ۔ چور ملتے ہیں ۔ سمگلر ملتے ہیں
۔کھلاڑی ملتے ہیں ۔تو عام لوگ کیوں نہیں ملتے ہیں'' ۔[1]

آنند لہر کا یہ فسانہ بڑا دلچسپ اور خوشگوار ہے ۔ اس میں ایک سیدھی سادھی کہانی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اگر انسان سرحد پار کرنا ہی چاہیئے تو وہ کون کون سی سرحد پار کرے گا۔فرقوں کی سرحد، مذہبوں کی سرحد، قوموں کی سرحد، قدم قدم پر سرحد ہے ۔ لہر ایک جگہ سرحد کو بے معنی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ کہ انسان کو مارنے کے لیے اگر کینسر جیسی بیماریاں موجود ہیں ۔ پھر یہ سرحدیں فوجیں اور ہتھیار کس لیے ہیں ۔انسانوں کو مارنے کے لیے یہی کافی ہیں ۔

یہ افسانہ شدید طنز کرتا ہے ۔ ان ارباب اختیار پر جنھوں نے انسانوں میں سرحدیں بنا کر تقسیم کردیا ہے ۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ یہ فوج اور ہتھیار بنانے کے بجائے ۔ دونوں ملکوں کی غربت کو دور کرتے ۔ اور بیماریوں اور لاچاریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ۔

لہر صاحب کی یہ کہانی دل کو مولینے والی کہانی ہے ۔ اس کہانی میں جو کردار ہیں ۔ وہ بھی بے مثال ہیں ۔ صرف دو ہی کرداروں پر ساری کہانی کا دارومدار ہے ۔ دونوں کردار ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں ۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے ۔ اس میں روزمرہ میں استعمال ہونے والے محاوروں کا استعمال خوبصورت طریقے سے کیا گیا ہے ۔ زبان میں لطافت، روانی، شیرنی، اور جدت پائی جاتی ہے ۔ کہانی کا انجام اتنا اثر انداز ہے کہ ایک پتھر دِل انسان بھی موم ہوجاتا ہے ۔ اس مقام پر قاری کی ساری ہمدردیاں عام آدمی کے لیے ہوجاتی ہیں ۔ لہر نے دونوں کرداروں کی کش مکش کو اِس انداز میں پیش کیا ہے کہ کہانی کا انجام بے مثال بن گیا ہے ۔

رنگ ساز: ''رنگ ساز'' افسانوی مجموعے ''سرحد کے اُس پار'' میں شامل دوسری کہانی ہے ۔ اس کہانی کا موضوع بھی کچھ روایتی انداز کا ہے ۔ اس کہانی میں ایک طویل عشقیہ بات اور ذات پات کی سرحدیں بیان کی گئی ہیں ۔ کہانی کار اس ساری کائنات کو مختلف زاویوں، رنگوں اور قدرت کی گنا گنیت سمجھتا ہے ۔ وہ اِن

---

[1] ۔ آنند لہر ۔ سرحد کے اُس پار، سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۔ 2001 ۔ ص ۔ 15

رشتوں کوانسانی قربت سے تعبیر کرتا ہے۔زندگی اور موت کووہ آنکھوں کا دھوکا سمجھتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ آنکھیں دُنیا کے حُسن و جمال کو کس انداز سے دیکھتی پرکھتی ہیں۔رنگوں کی کمی اور زیادتی بھی اسے پسند نہیں ہے۔

مختلف رنگوں کومختلف ساڑیوں پر جووہ رنگتا ہے ان سے وہ نفسیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے۔اور وہ یہ جان کر اپنے ندر ایک تشفی پیدا کرتا ہے کہ یہ رنگوں کی ساڑیاں حسین وجمیل لڑکیوں یا عورتوں کی ہوتی ہیں۔بچپن کی خواہشیں اور اس میں بڑھاپے کا عکس اس پر نمایاں نظر آتا ہے۔نرملا اور کرشنا کی ساڑیاں وہ اچھی طرح سے دھوتا ہے لیکن شاردہ کی ساڑی بھی اسے موہ لیتی ہے ۔ وہ ہرحال میں اُسے بدلتے ہوئے موسموں سے تعبیر کرتا ہے ۔ گوپی اور آشا کی ساڑی کووہ اکٹھے اس لیے نہیں سوکھاتا تا کہ دونوں ساڑیوں کا ایک دورے کا رنگ نہ لگ جائے۔اس میں اُسے طنزن ثریا کی ساڑی کا رنگ پسند نہیں آتا ہے۔آشا کی گلابی ساڑی اسے عجیب سی لگتی ہے۔کسی بوڑھے کے احساسات اِسے یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔

''شام کوآسمانی رنگ کی ساڑی پہنتے ہو۔شرم نہیں آتی ہم بوڑھے لوگوں کے سامنے چلتے ہو''۔

عمر گذرنے کا کہانی کارکوایسے لگتا ہے جیسے مچھلی جال میں پھنس جاتی ہے۔ایک دریا کوسمندر میں مل جانے کا حادثہ رہتا ہے۔نرملا کی گفتگو رنگ ساز کے ساتھ کیسے ہوتی ہے۔جب وہ اُس کی اُنگلیوں کی تعریف شبنم کے پھولوں کی ٹھنڈک یا بدن کی جلن سے تعبیر کرتا ہے۔

افسانہ اس وقت بام عروج کو چھوتا ہے کہ جب نرملا اپنی ساڑی کے بارے میں رنگ ساز کو پوچھتی ہے ۔رنگ ساز کو اُس وقت تشفی محسوس ہوتی ہے ۔ جب وہ ساڑی کو چھپا کر رکھتا ہے۔اور تصوراتی دُنیا میں جیسے وہ نرملا کوہی اپنے پہلو کے قریب رکھتا ہے۔ ایسا کرنے سے اسے ہرروز نرملا کو دیکھنے کا موقع اپنی دوکان پر ملتا ہے۔ اسی اثنا میں ہولی کا تہوار آتا ہے۔''رنگ ساز'' کو نرملا کے گھر جا کر اُس پر رنگ پھینکنے کا بہانا بھی ملتا ہے۔نرملا کا باپ اُس کے آنے پر چونک جاتا ہے ۔لیکن رنگوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا ہے۔ ایک طرف نرملا اپنی آنکھوں کا تیور بدلتی ہے۔دوسری طرف رنگ ساز بھی رنگوں کے ذریعے اپنی آنکھ مچولی کرنے لگتا ہے۔ رنگ ساز نرملا کے بدن پر نیلا رنگ پھینکتا ہے اور ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے بدن پر سولہ برس کی

خوشبو چھوتی ہے کیونکہ اُس ساڑی کا رنگ بھی نیلا تھا۔ نرملا کے گھر والوں کا اعتراض تھا کہ اگلی بار وہ ساڑھی رنگوانے کے لیے اُس دوکان پر نہ جائے گی۔ عشق کی انتہا اُس وقت ہوتی ہے جب وہ تمام ساڑیوں پر نیلا ہی نیلا رنگ چڑھاتا ہے۔ گلی کے دھرم پال سے التجا کرتا ہے کہ کہنا کہ وہ دس بجے ملے۔ وہ اگلے دن نہیں آئی۔ اُسے اب رنگوں سے بھی نفرت ہونے لگی۔ اپنے سارے تن بدن کو نیلے رنگ سے ہی ملبوس کرتا رہا۔ اور دِن بدن اُس کی محبت میں چور چور ہونے لگا۔ وہ وقت کے ہاتھوں سے بے ہوش ہو جاتا ہے اور اُسے یہ گماں ہوتا ہے کہ وہ دس بجے نرملا سے ضرور ملے گا۔ نرملا کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ تا کہ اُس کو دس بجے کا پتہ نہ چل سکے۔ وہ من ہی من میں سوچتی رہی کہ وقت بھی موسموں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ وہ دیواروں تک پوچھتی رہتی ہے کہ دس کب بجیں گے۔ ایک دن روز کا طوفان آیا۔ گاؤں والوں کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔ ہوا زور سے چلنے لگی۔ نرملا اپنی محبت کے کچے دھاگوں سے تشبیہ دیتی اور رشتوں کو کاغذ کی ناؤ سے مشابت دیتی رہی۔ وقت کو کوستی رہی۔ آخر لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ افسانہ نگار نے نرملا کے باپ کو عقیدوں، بندشوں اور بندھنوں میں جکڑے دکھایا ہے۔

اس میں رنگ ساز کا کچھ قصور نہیں ہوتا، وہ خاموش رہ کر ظلم کے مرتصیب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نرملا سے معافی مانگی جائے۔ اُس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ نرملا کو رہا کیا جائے۔ جب نرملا گھریلو قید و بند سے رہا ہوئی۔ اس نے سب سے سوال کیا۔

''آخر دس کب بجیں گے'۔ ایک نے کہا کہ میں آپ کو گھڑیوں کی دوکان پر لے جاؤں گا۔ تب نرملا گھڑیوں کی دوکان پر چلی جاتی ہے۔

''کیا مجھے معلوم ہو سکے گا کہ دس بجنے والے ہیں''۔

سماج اور والدین کی ہٹ دھرمی اسے اس حالت تک پہنچا دیتی ہے کہ جب وہ یہ دیکھ کر حیرت میں پڑتی ہے۔ کوئی گھڑی دس بجاتی ہے۔ کوئی بارہ۔

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ دس نہ بجیں گے''۔ اس افسانے میں نرملا کا باپ اور بستی کے لوگ بھی اپنا رول اچھی طرح سے نہیں نبھا سکے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک طرف نرملا کی زندگی میں زہر اونڈیل دیا جاتا ہے کہ

وہ اپنی ہوس خمسہ کھو چکی تھی۔ اور گاؤں والے اپنے گناہوں کا افسوس بھی اوپر والے رنگ ساز سے مانگنے لگے۔

زباں وبیاں کے لحاظ سے یہ کہانی اعلیٰ درجے کی ہے۔ اس کہانی میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ عام فہم زبان ہے۔ جس کو ہر ایک آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کہانی کا اہم رول دو ہی کردار نبھاتے ہیں۔ ایک رنگ ساز اور دوسرا نرملا۔ اور یہ پوری کہانی ان دونوں کرداروں کے اِردگرد گھومتی ہے۔ چند ضمنی کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھانے میں اہم رول نبھاتے ہیں۔

گوری: گوری ایک عشقیہ کہانی ہے۔ اس کہانی میں آنؔہر دور حاضرہ کے سماج کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ افسانے میں گوری اور روشن کے عشق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آنؔہر یہاں پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ محبت ہی وہ شے ہے جس کے سامنے سماج کی ساری دیواریں، جس میں مذہب، ملک، امیری، غریبی، ذات پات سب شامل ہیں۔ یہ سب دیواریں بے کار نظر آتی ہیں۔ گوری ایک مسلمان گھرانے کی جوان لڑکی ہے۔ جس کا پیشہ مٹی کے برتن بنانا اور بیچنا ہے۔ روشن ایک ہندو گھرانے سے تعلق رکھنے والا نوجوان ہے۔ جو گوری کے بنائے ہوئے برتن خریدتا ہے اور اکثر گوری کی دوکان پر آتا ہے۔ روشن کا روزانہ کا معمول بن چکا تھا کہ گھڑا توڑنا اور نئے گھڑے کے لیے گوری کی دوکان پر جانا۔ آخر ایک دِن محلے والوں کو اِن دونوں کے پیار کا پتہ چل جاتا ہے۔ گوری اور روشن دونوں کے ماں باپ اِن کی محبت کو قبول کر لیتے ہیں۔ گوری کا باپ یہ سوچتا ہے کہ کاش روشن مسلمان ہوتا اور روشن کا باپ یہ سوچتا ہے کہ کاش گوری ہندو ہوتی۔ ان دونوں کی محبت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ آخر دونوں کی شادی کے بارے میں سوچ وچار ہونے لگتا ہے لیکن بیچ میں مذہب کی مضبوط دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ ان کی محبت میں اتنا جنون آجاتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کا مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ اور شادی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

آنند آنؔہر صاحب نے اس افسانے کا موضوع اپنے سماج ہی سے اخذ کیا ہے۔ وہ ایک حساس انسان ہیں اور ہر چھوٹا بڑا واقع ان کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ اس قسم کے واقعات اکثر سماج میں ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی عکاسی آنؔہر صاحب نے اس افسانے میں کی ہے۔ گوری کا کردار اس افسانے میں مثبت انداز سے اُبھرتا ہے۔ اور یہی افسانے کا مرکزی کردار بھی ہے۔ اس مناسبت سے افسانے کا نام بھی ''گوری''

رکھا گیا ہے۔ افسانے کے ارتقاء میں جو واقعات پیش کیے گئے ہیں جن میں گوری کا برتن بنانا اور روشن کا برتن توڑنا، خریدنا اور پھر توڑنا۔ مذہب تبدیل کرنا وغیرہ نہایت ہی دلچسپ ہیں۔ اس طرح سے پلاٹ میں وحدث ثلاثہ کو بخوبی برتا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ افسانے کے تاثر کو برقرار رکھا گیا ہے۔

جہاں تک افسانے میں کرداروں کا تعلق ہے۔ یہ حقیقی کردار نظر آتے ہیں۔ اور موجودہ معاشرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ قاری کو ان کرداروں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ مذہب کی اتنی بلند دیواروں کے باوجود بھی ان کا تعلق فطری لگتا ہے۔ دونوں کرداروں کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر قاری اپنے آپ کو اس کہانی کی گرفت میں پاتا ہے اور کسی بھی مقام پر اُکتاہٹ کو محسوس نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ تجسس کا عنصر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جو دلچسپی کو قائم رکھتا ہے۔

زبان وبیان کے حوالے سے بھی یہ افسانہ اپنے آپ میں مکمل نظر آتا ہے۔ اور اُن تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے جو ایک کامیاب افسانے کے لیے ضروری ہیں۔

جہاں تک کہانی کے انجام کا تعلق ہے یہی وہ مقام ہے جو کہانی کا مرکزی نکتہ بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں دونوں کرداروں کی محبت کے جنون کو اس طرح اُبھارا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے مذہب کی مضبوط دیواریں توڑ کر مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ اور شادی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر محبت کا وہ مقام دکھایا گیا ہے جہاں پر تمام رشتے دار، دوست، دشمن، ماں باپ، مذہب، امیری، غریبی، ذات پات سب بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ محبت کے سامنے یہ تمام چیزیں بے معنی نظر آتی ہیں۔ ِنہر صاحب کی زبانی مثلاً

> ''محبت کے ایک لفظ کے آگے مذہبی کتابوں کے فلسفے جھوٹ نظر آتے ہیں
> ۔ایک دن دونوں نے سوچا کہ وہ صرف گوری اور روشن ہوتے
> تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ بہن بھائی، چچا، دوست اور دشمن تو آگے تھے پھر یہ
> ہندو مسلمان بننے کی کیا ضرورت تھی۔ آدمی ہندو نہ ہو کر بھی اچھا ہو سکتا ہے۔
> دان دے سکتا ہے۔ اور مسلمان نہ ہو کر بھی اسلام کے اصولوں پر چل سکتا ہے

۔نماز پڑھ سکتا ہے۔غریب کی مدد کر سکتا ہے۔یتیموں کا سہارا بن سکتا ہے۔
گوری اور روشن کا پیار آگے بڑھا۔مذہبوں کی دیواریں لوگوں کو کمزور بنانے
لگیں''۔[1]

شکست: ''شکست'' ایک مختصر اور دلچسپ افسانہ ہے۔اس افسانے کا موضوع ازدواجی زندگی کی کشمکش ہے۔آنند لہر نے یہاں میاں بیوی کے درمیان آئے دن ہونے والی تکرار اور کشمکش کی تصویر کشی بڑی فنکارانہ انداز میں پیش کی ہے۔

افسانے کا موضوع اس بات کے عین مطابق ہے کیونکہ افسانے کا مرکزی خیال شکست ہی ہے۔آنند لہر نے افسانے کا آغاز رومانی جملوں سے کیا ہے۔جس کی وجہ سے افسانے میں دلچسپی شروع سے ہی قائم ہو جاتی ہے۔اس طرح کہانی بڑے خوبصورت انداز سے اختتام تک پہنچتی ہے۔

زیر نظر افسانے میں رومانی انداز میں ازدواجی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے۔خاوند اپنی بیوی کو چھونے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس سے دور بھاگتے ہوئے اس سے اپنے لیے ساڑھی کی فرمائش کرتی ہے۔وہ اس کی فرمائش پوری کرتا ہے۔وہ اپنی قلیل سی آمدنی سے اس کے لیے ایک خوبصورت ساڑھی خرید کر لاتا ہے۔اس طرح سے اس کی فرمائش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔اور خاوند بھی اس کی ہر فرمائش پوری کرتا ہے۔ایک دن وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔لیکن یہاں پر بھی یہ شرط لگائی جاتی ہے اور زندگی کا یہ کارواں خواہشوں، اُمنگوں اور شرطوں سے آگے چلتا ہے۔وہ خاوند کے ماں باپ کی بھی خوب عزت کرتی ہے۔ایک اچھی بیوی، ایک اچھی بہو اور ایک اچھی بھابی کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے روٹھ جاتی ہے۔وہ اسے منانے کے لیے سسرال جاتا ہے۔پورا دن وہاں رہا۔اسے اس کے ماں باپ کے دکھاوے کی محبت بھی دکھانی پڑی۔اس کے رشتے داروں کے کام کرنے کے وعدے بھی کرنے پڑے اور پھر وہ مانی اور شام کو گھر واپس آئی۔

ایک دِن وہ سیر و تفریح کے لیے بمبئی کا رُخ کرتے ہیں۔وہاں وہ مختلف سمندروں اور عمارتوں کا نظارہ

---

[1] آنند لہر۔سرحد کے اُس پار۔(سیمانت پرکاشن نئی دہلی)۔2001ء۔ص۔31

بھی کرتے ہیں۔لوگوں کو دیکھتے ہی اُنھیں لا کہ یہ شہر ایک ہی ساتھ جیتا ہے اور ایک ہی ساتھ مرتا ہے۔ایک ہی وقت پر یہ شہر چکا چوند بھی رہتا ہے اور سلا بھی دیتا ہے۔ وہاں نوجوان لڑکیاں مردوں کو اپنی طرف بلاتی ہیں۔جب ان نوجوان لڑکیوں کی آوازیں دونوں میاں بیوی سنتے ہیں ۔تو حیران ہو جاتے ہیں۔ وہ فوراً گھر واپس لوٹتے ہیں ۔رات کو بچوں کے سونے کے بعد خاوند بیوی کو چھونے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس بار وہ بغیر کوئی احتجاج کیے مان جاتی ہے اور وہ اپنی شکست کے پسینے میں شرابور ہو جاتی ہے۔

اس کہانی میں ایک نفسیاتی موضوع کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شروع سے لے کر آخر تک افسانہ دلچسپی کا منظر ہے۔قاری کسی بھی مقام پر پریشانی کو محسوس نہیں کرتا ہے بلکہ یہ جاننے کے لیے بے تاب رہتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔موصوف نے یہ کہانی اپنے ہی سماج سے اخذ کی ہے۔مصنف نے حقیقت کو پیش کرتے ہوئے واضح اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منٹو اور عصمت چغتائی سے متاثر ہیں۔

کہانی کو پیش کرنے کے لیے انھوں نے میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کو پیش کیا ہے ۔اور ایک وفادار اور جاں نثار بیوی اور طوائف کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔ایک طوائف اور گاہک کے درمیان صرف دس روپے میں سودے بازی کا رشتہ ہوتا ہے۔اگر اکثر بیوی اس طرح کی فرمائشیں کرتی رہے تو اس کے درمیان اور ایک دھندا بازی کرنے والی لڑکی کے درمیان کیا فرق ہوسکتا ہے۔اس اہم حادثہ کا بیان افسانے کے اختتام پر فنکار نے بمبئی کی ایک طوائف کی زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے واقعے سے کیا ہے۔مثلاً

> ''ایک دِن وہ بمبئی چلے گئے ۔وہاں پر بچوں کے ساتھ گھومے پھیرے۔ انھوں نے وہاں پر سمندر دیکھا۔بلڈنگیں دیکھیں۔لوگ دیکھے۔انھیں لگا کہ یہ شہر ایک ہی ساتھ جیتا ہے اور ایک ہی ساتھ مرتا ہے ۔ایک ہی ساتھ یہ شہر جاگا بھی رہتا ہے اور سویا بھی رہتا ہے۔یہ ان کا بمبئی میں آخری دن تھا۔ شام کا وقت تھا۔رات ہونے والی تھی ۔وہ بازار میں گھومنے کے لیے چلے گئے ۔ایک طرف کھڑی لڑکیاں اسے بلانے لگیں۔اشارے کرنے لگیں۔

اس کے اندر بجلی گوندگئی ۔ وہ حیران رہ گیا۔ ’’دس روپے صرف دس روپے
بابو جی‘‘ ۔ یہ دیکھئے میں جوان ہوں۔ سولہ برس کی ہوگئی ہوں‘‘ بیس روپے
صرف بیس روپے میں رات بھر جو جی میں آئے کرتے رہیئے‘‘ ۔[۱]

اس منظر کو دیکھ کر بیوی کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے خواہش کے بدلے فرمائش
کرتی رہی۔ اس طرح وہ پہلی بار ہی اپنی شکست قبول کرتی ہے۔

’’بس وہ گھر آ گئے ۔ بچے سو گئے ۔ رات کو جوں ہی اس نے چھونے کی
کوشش کی ۔ وہ لیٹ گئی ۔ اور کوئی احتجاج نہ کیا۔ اس نے شکست کے پسینے
سے اس کا چہرہ شرابور دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ بُری طرح سے ہار گئی ہو۔
اور اس کی ہر خواہش ریت کے پہاڑ کی طرح ہو‘‘ ۔[۲]

اس افسانے کی زبان نہایت ہی شستہ ہے ۔ روزمرہ محاورت کا استعمال کیا گیا ہے ۔ جملوں میں
خوبصورتی ہے ۔ واقع کی طرح افسانے کی زبان قاری کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ محفوظ بھی کرتی ہے۔
مختصر جملے اور عام فہم الفاظ کا استعمال بڑی مہارت سے کیا گیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے پورے افسانے میں
کہیں جھول نظر نہیں آتا۔

کہانی کا موضوع ’’شکست‘ آخر میں آ کر واضح ہو جاتا ہے ۔ افسانے کے لیے اختصار ایک لازمی
عنصر ہوتا ہے۔ آنند لہرؔ نے اس عنصر کو بڑی چابکدستی سے ادا کیا ہے۔

پھول والی: ’’پھول والی‘‘ نام کا یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ’’سرحد کے اس پار‘‘ میں شامل ہے۔ اس
افسانے میں لہرؔ صاحب نے ایک رومانی کہانی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔ اس افسانہ میں
ہندو مذہب کی ایک مذہبی روایت مندر میں پھول چڑھانا کو پیش کیا گیا ہے۔ ہندو لوگ اپنے اپنے بھگوان
کو خوش رکھنے کے لیے اور اپنے من کی مرادیں حاصل کرنے کے لیے مندر میں پھول چڑھاتے ہیں۔ یہ پھول

۱۔ آنند لہر۔ سرحد کے اُس پار۔ سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۔ 2001۔ ص ۔ 34
۲۔ آنند لہر۔ سرحد کے اُس پار۔ سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۔ 2001۔ ص ۔ 35

ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ جیسے نرگس، گھٹے، موتئے اور دوسری قسم کے اور یہ پھول زیادہ تر لڑکیاں ہی فروخت کرتی ہیں۔ مفلسی کی وجہ سے جوان لڑکیوں کو یہ تجارت کرنی پڑتی ہے۔ لوگ پھول خریدتے ہیں اور مندر میں چڑھاتے ہیں۔ کہانی کار نے اس روایت کو کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ شومندر کے سامنے بہت ساری لڑکیاں ہر روز رنگ برنگے پھول لے کر فروخت کرتی ہیں۔ یہ لڑکیاں جوان ہوتی ہیں اور پھول کی طرح خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو اس حالت میں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنی جوانی کے حسین لمحے بیچ رہی ہیں۔ اور خریدنے والے عمر کے عوض آرزوئیں خرید رہے ہیں۔

بات آگے اس طرح سے بڑھتی ہے۔ پھول فروخت کرنے والی لڑکیوں میں کنول نام کی ایک لڑکی ہوتی ہے۔ جس پر گلاب نام کا ایک لڑکا عاشق ہوجاتا ہے۔ وہ ہر روز پھول خریدنے کی غرض سے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ایک دن پھولوں کے لین دین میں دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں ٹکرا جاتی ہیں۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ حتیٰ کے دونوں ایک دوسرے پر مرمٹتے ہیں اور محبت کا راستہ نکل پڑتا ہے۔ نرگس نام کی ایک اور پھول فروخت کرنے والی لڑکی بھی گلاب کو اپنے دل ہی دل میں چاہتی ہے۔ اس کی چاہت کے باوجود بھی گلاب اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ نرگس اسے کہتی ہے کہ موتیے کے پھولوں پر سانپ بھی آتے ہیں۔

یہ تمام پھول سخت سنگھ نامی ایک بیوپاری کے باغ سے آتے تھے۔ پھولوں والا بیوپاری بھی کنول پر عاشق ہوجاتا ہے اور دوسری طرف گلاب کنول سے پھول خریدنے کی غرض سے اپنی کتابیں، کھیل کود کا سامان، ماں کے گہنے اور یہاں تک کہ اپنے جسم کا خون بھی فروخت کرتا ہے۔ سخت سنگھ کنول کو اپنی کار میں بٹھا کر لے جاتا ہے اور اُسے رشتوں کی زنجیر میں باندھ دیتا ہے۔ اس کے بعد گلاب پھول خریدنے نہیں آتا۔ مگر چوک میں بیٹھ کر کنول کا انتظار ضرور کرتا ہے۔ اس موقع پر نرگس گلاب کو یہ یاد دلاتی ہے کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ موتیے کے پھولوں پر سانپ ضرور آتا ہے۔

آنند لہر صاحب نے دو دلوں کی کشمکش کو افسانے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اور افسانے کے پلاٹ کا تانا بانا جن واقعات سے تیار کیا ہے وہ بالکل حقیقی نظر آتے ہیں۔ لہر کو معاشرے کی ہر باپ پر گہری نظر ہے۔

اور ہر چھوٹی بڑی تبدیلیاں جو آئے دن رونما ہوتی رہتی ہیں۔ایک حساس انسان کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو صفحہ قرطاس پر بیان کر دیتے ہیں۔

آنند لہر کا اس قسم کی کہانیوں کے انتخاب کا مقصد سماج میں ہو رہی بُرائیوں کو اُجاگر کرنا ہے۔مندر میں چڑھائے جانے والے پھول تو اپنی جگہ مقدس تو ضرور ہیں لیکن لالچی اور خودغرض لوگ اس روایت کو غلط استعمال کر رہے ہیں۔

اس کہانی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غریبی کی وجہ سے بے کس لڑکیاں جو پھولوں کی طرح خوبصورت اور نازک ہوتی ہیں ۔ وہ اپنے جسم تک بھی فروخت کرنے میں گریز نہیں کرتی ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار کنول ہے جو اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے پھول فروخت کرتی ہے ۔اسی مناسبت سے آنند لہر نے افسانے کا موضوع ''پھول والی'' منتخب کیا ہے۔حتیٰ کہ اس کے تمام کردار علامتی ہیں لیکن حقیقی زندگی سے بہت زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کہانی بہت آسان اور عام فہم ہے۔لہر صاحب نے روزمرہ کے محاورات کو برتا ہے۔چھوٹے چھوٹے جملے اس کی جان بنے ہوئے ہیں۔مثلاً

> ''آج بھی پھولوں کی ٹوکریاں اپنے آگے رکھے۔رنگ برنگی پوشاکیں پہنے لڑکیاں رنگ برنگے پھول بیچتی ہیں۔گھٹے کے پھول ،گلاب کے پھول، موتیے کے پھول، پیلے پھول، نیلے پھول ،رنگ برنگے پھول ،گلدستوں میں نمایاں پھول، ہاروں میں پروئے ہوئے پھول ، اس چوک میں بکتے ہیں۔جس کے درمیان شِو مندر ہے۔صبح سویرے اِن پھولوں کی ٹوکریاں سجا کر لڑکیاں آوازیں دیتی ہیں۔''پھول لے لو''۔بھگوان کو پھول پسند ہیں۔ بھگوان آپ کی مرادیں پوری کرے گا''۔[1]

> ''افسانے کا انجام ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے۔ گلاب کنول سے محبت کرتا ہے اس کی چاہت میں اسے دن رات ہوش نہیں رہتی ۔ اس سے ملنے

---

[1]۔ آنند لہر ۔سرحد کے اس پار۔(سیمانت پرکاشن نئی دہلی)2001۔ص۔50

کے لیے پھول خریدنے جاتا ہے۔اس کے پاس پھول خریدنے کے لیے
پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ پیسوں کی غرض سے وہ اپنے گھر کی تمام ترچیزیں
فروخت کردیتا ہے۔اس کوحاصل کرنے کے لیے ہرممکن کوشش کرتا ہے۔
لیکن کنول کوسخت سنگھ لے جاتا ہے اوراسے اپنی تیسری بیوی بنالیتا ہے۔
گلاب اورکنول کا ملنا بند ہوجاتا ہے ۔ گلاب مجنوں بن جاتا ہے اوراس
کا انتظارضرورکرتا ہےاورنرگس ہرصبح گلاب سے کہتی ہے۔میں نے کہا تھا کہ
موتیے کے پھولوں کی خوشبو پرسانپ ضرورآتا ہے'' [1]

زندگی: زندگی ''سرحد کے اس پار'' افسانوی مجموعہ میں شامل ایک افسانہ ہے۔یہ افسانہ بھی روایتی افسانوں کے زمرے میں آتا ہے۔اس کہانی میں لہر نے انسانی فطرت کواُجاگر کیا ہے۔موصوف نے اس افسانے میں یہ بات ظاہر کرنے کی سعی کی ہے کہ انسان بنیادی طور پرخودغرض اورلالچی ہوتا ہے جب اس کے پاس دولت کی تھیلی آجاتی ہے تو یہ اپنے دوستوں، ساتھیوں، چھوٹے ملازموں کوتو کیا اپنے خاص رشتے داروں سے بھی نفرت کرنی شروع کرکرلیتا ہے۔یعنی کہ اس میں غروراورتکبرآجاتا ہے۔اسی بات کولہر صاحب نے اس کہانی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ افسانہ تقریباً پانچ صفحات پرمحیط ہے۔لہر نے اس افسانہ کا پلاٹ اس انداز میں تیارکیا ہے کہ دھرم چند ایک دفتر میں چپراسی کے عہدے پرفائز ہوجاتا ہے۔اس سے پہلے لوگ اس کودھرموں کے نام سے پکارتے تھے اوراس کے باپ کا نام کرم چند تھا۔اورلوگ اس کوکرموں کے نام سے پکارتے تھے۔آخرکاردھرم چند کی شادی ہوجاتی ہے۔ بچے بھی ہوجاتے ہیں۔دھرم چند کواپنی وردی پربہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔دھرم چند جس دفتر میں ملازم ہوتا ہے۔اس دفتر کا آفیسر رمیش ہوتا ہے جوڈپٹی کمشنر ہوتا ہے۔دھرم چند اس کا بریف کیس اُٹھانے میں بڑی خوشی محسوس کرتالیکن رمیش کبھی بھی خوش نظرنہیں آتا۔وہ اس کے ہرکام سے تنگ ہوتا ہے۔ہروقت اپنی امیری اورافسری کارعب اس پرجماتا ہے۔

---

[1]۔آنند لہر۔سرحد کے اس پار۔(سیمانت پرکاشن نئی دہلی) 2001۔ص۔53

دھرم چند جب بھی اپنی نوکری سے واپس لوٹتا ہے تو اس کا بڑا احترام اور عزت ہوتی ہے۔ ماں، باپ، بیوی بچے سبھی اس کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ وہ اپنے افیسر کے کہنے پر مہمانوں کے لیے چائے لاتا ہے تو رمیش چائے کا کپ اس کے سر پر مارتا ہے۔ دفتر میں کملا بھی ملازم ہوتی ہے۔ رمیش، دھرم چند کے ساتھ کملا پر بھی اپنی افسری کا رعب جماتا ہے۔ جس کو رمیش پیار کی نظر سے بھی دیکھتا ہے لیکن کملا سمجھداری کا ثبوت دیتی ہے۔ ایک دن رمیش گھر واپس جاتا ہے۔ جہاں پر اس کے گھر کے سارے افراد اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ رمیش کی حالت کو دیکھ کر دھرم چند کو اس پر رحم آجاتا ہے۔

ایک زندگی دھرم چند کی ہے۔ اس کے گھر میں اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف رمیش ہے۔ جو ایک افسر بھی ہے۔ دولت مند بھی ہے لیکن گھر میں اس کی کوئی بھی عزت نہیں کرتا۔ افسانہ نگار نے دو متضاد زندگیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اچھی زندگی ایک چپراسی کی ہے جس کے گھر والے اس کو بے پناہ عزت دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف اس کے دفتر کا افسر رمیش ہے جو دفتر میں تو ہر ایک کو گالیاں دیتا ہے لیکن گھر میں اس کی عزت ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں ہے۔ کہانی کار نے جو واقعات پیش کیے ہیں وہ حقیقت پسندی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ اس طرح کہانی میں واقعاتی تاثر، وحدت زماں و مکاں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ افسانے میں منظر نگاری کی بھی عمدہ مثال ہے۔ کبھی گھر کے ماحول کی عکاسی اور کبھی دفتر کے ماحول کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور امیر آدمی آدمی اور غریب آدمی کے درمیان کے فرق کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

اگر اس افسانے کو کردار نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو کردار نگاری اس کی جان نظر آتی ہے۔ دھرم چند اس کہانی کا ہیرو ہے جو ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ نوکری ملنے پر اس کو اس کے کنبہ کے دوسرے افراد کو بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے پیشے سے بے حد انصاف کرتا ہے۔ مثلاً

> ''دھرم چند دن بھر کام کرنے کے بعد جب گھر جاتا ہے اس کی بیوی اس کا سواگت دروازے پر کیا کرتی ہے۔ جوں ہی یہ بیٹھتا ہے وہ اس کے پاؤں دبانے شروع کر دیتی ہے۔ اس کا لڑکا اس کے لیے چائے لاتا ہے اور لڑکی اس کے لیے کپڑے لاتی۔ دھرم چند جب وردی اُتارتا تو اس

کا دوسرا لڑکا اتنے احترام سے ہینگر میں لگاتا جیسے اس کی عبادت کرتا ہو۔
پھر اس کی نیم پلیٹ صاف کی جاتی ۔ پھر دھرم چند کی ماں اس کو چومتی
۔ ''بیٹا تو تھک تو نہیں گیا۔ دھرم چند کے آنے سے گھر میں خوشی کا ماحول
چھا جاتا ہے اور ہر فرد مصروف ہو جاتا ہے۔ دھرم چند یہاں دھرموں بلکہ
بیوی کا پرمیشور ہے''۔ اپنی ماں کا آنکھ کا تارا ہے ۔ بچوں کا سہارا ہے۔ وہ
پتا بھی ہے چچا بھی ہے اور محلے کے لوگوں کے لیے ایک قابل احترام آدمی
بھی ہے۔ وہ پھوپھا بھی ہے ۔ رشتوں میں الجھا ہوا ہے ۔ یہاں وہ دھرم
چند ہے یا محترم دھرم چند''۔ [1]

اس کے برعکس لہر صاحب نے رمیش کی گھریلو زندگی کا نقشہ کچھ یوں پیش کیا ہے۔

''چھٹی ہوئی تو رمیش گھر چلا گیا۔ دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا کہ
اجازت لے کر میں داخل ہوں لیکن اس نے دیکھا کہ کوئی رمیش کا انتظار نہیں
کر رہا ہے۔ وہ اکیلا چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی آئی اور کہنے
لگی کہ آج لیٹ کیوں آئے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں آج کلب جانا ہے۔ آفس
میں لیٹ ہو گیا''۔

''آفس آفس سن سن کر میں تنگ آ گئی ہوں۔''

تمہارے آفس سے جتنی تنخواہ تم لیتے ہو۔ اتنے روپے میرے پتا جی
نوکروں میں بانٹ دیتے ہیں۔ [۲]

اس افسانے میں قاری کی ساری ہمدردیاں دھرم چند کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ افسانے میں افسانہ نگاری کے وہ تمام پہلو موجود ہیں جو ایک کامیاب افسانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ افسانے کی زبان بے

۱۔ آنند لہر۔ سرحد کے اُس پار۔ سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۔ 2001۔ ص۔ 57

۲۔ آنند لہر۔ سرحد کے اُس پار۔ سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۔ 2001۔ ص۔ 58

حد لطیف ہے۔ اسلوب عجیب وغریب ہیں۔ روزمرہ محاورات کا استعمال نہایت چابکدستی سے کیا گیا ہے۔ مکالمے بھی نہایت ہی موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ افسانے کا انجام بھی نہایت ہی عمدہ ہے۔ صرف انجام ہی عمدہ نہیں بلکہ آغاز بھی ڈرامائی ہے۔ موضوع حالانکہ عام سا ہے لیکن موصوف نے اتنی چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ یہ بے مثال افسانہ بن گیا ہے۔

تندور: اس افسانے کا موضوع بھی رومانی طرز کا ہے۔ جس میں عورت کو مرکزیت بنایا گیا ہے۔ کہانی کا موضوع بے شک معمولی سا ہے لیکن اس کی اہمیت بہت وسیع ہے۔ کہانی میں یہ بات رونما کی گئی ہے کہ عورت کو ہر طرح سے روندھا جاتا ہے اور سماج کا ہر فرد اس کا استحصال کرتا ہے۔ مرد کے اس جبر کو لہر صاحب نے تندور کا نام دیا ہے۔ اسی مناسبت سے اس افسانے کا نام ''تندور'' رکھا گیا ہے۔

''تندور'' میں آنند لہر نے عورت کے استحصال اور جبر کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بوڑھا شخص دھوپ میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہوتا ہے۔ اس کی نظر ''تندور'' پر بیٹھے چند لوگوں پر پڑتی ہے۔ جو عورتوں کی باتیں کرتیں ہیں۔ ایک آواز نے اس بوڑھے کو چونکا دیا۔

''بوبوجی وہ بڑی مزے دار ہے'' اس کی عمر سترہ برس لگی ہے۔ یہ بات اتنے لوگوں میں بیٹھے ہوئے اس کو بُری لگی۔ حالانکہ سننے والوں میں مذہبی رہنما انسانی حقوق کی حفاظت کرنے والے۔ جج، راجے مہاراجے وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں۔ جو عورت کو ماں کے طور پر مانتے ہیں جو متبرک کتاب پڑھ کر ماں کے دودھ کی اہمیت سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو عورت کو سیتا کے روپ میں دیکھتے ہیں۔

ایک بوڑھا خود لڑکی کے پاس جا کر اس کی عمر معلوم کرتا ہے۔ لڑکی اس کو اپنی عمر بتاتی ہے۔ بوڑھے کو اس کی بات پر یقین نہیں آتا ہے۔ لڑکی اس کو اپنے جسم کو ٹٹول کر اندازہ لگانے کو کہتی ہے۔ وہ شرمندہ ہو جاتا ہے اور بوڑھا اس لڑکی کو کہتا ہے۔ کہ تمہاری عمر سترہ برس نہیں ہے۔ بلکہ ہزاروں برس ہے۔ لڑکی اس کو حیرانگی سے دیکھتی ہے کہ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر عورت اس کے سامنے آتی ہے۔ جو یہ بات جاننا چاہتی ہے کہ تم کوئی لیڈر ہو۔ جو اس لڑکی کو ورغلاؤ۔ عورت نے کہا تم بھی یہی دھندا کرتے ہو۔ مگر کالے بازار میں وہ شخص جواب دیتا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا کیونکہ عورت ماں بھی ہے۔ بیٹی بھی ہے۔ بیوی بھی ہے۔

اس کے بطن سے ڈاکٹر، جج، ملک کے بادشاہ، اوتار، پیغمبر جیسی ہستیاں جنم لیتی ہیں۔ نیز عورت وہ شے ہے جس پر جوانیاں بھی پھونکی جاتی ہیں۔ شاعر غزلیں کہتے ہیں۔ مصور تصویریں بناتے ہیں۔ کیا اس کا مقصد صرف یہی تندور ہے جو اس کے لیے صدیوں سے دھک رہا ہے۔

''تندور'' کا پلاٹ روایتی افسانہ نگاری کا نمونہ ہے۔ افسانہ نگار نے واقعاتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ وحدت، تاثر کو بھی برقرار رکھا ہے۔ افسانے کے کردار حالانکہ اتنے جاندار نہیں ہیں اور نہ ہی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی پلاٹ کے ارتقاء میں ان کا اہم رول ہے۔ فن کار دراصل سماج میں ہو رہے اس قسم کے دھندوں کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ سماج میں اس قسم کی بُرائیوں کو ختم کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے اور آج کے اس دور میں ہر ایک شخص اس قسم کی بدکاریوں سے واقف ہے۔ لیکن کوئی بھی شخص کھل کر سامنے نہیں آتا ہے۔ جہاں عورت کے استحصال کی بات کی گئی ہو۔ وہاں عورت کے مقام اور درجے کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ کہانی کار نے بڑے موثر طریقے سے عورت کے مقام کو واضح کیا ہے۔ مثلاً

> ''ہزاروں برس سے دوشاسن تمہاری ساڑھی کو اُتارتا رہا ہے۔ عیسیٰ جو جنم دینے کے بعد تم پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ یگوں سے تمہارا سودا ہو رہا ہے۔ تم بک رہی ہو۔ نیلام ہو رہی ہو۔ تمہاری عمر سترہ برس نہیں ہو سکتی۔ کبھی تمہارا باپ تمہیں بیچتا ہے۔ کبھی خاوند۔ کبھی بھائی۔ اور ایسا تو کئی یگوں سے ہو رہا ہے''۔ [1]

افسانے کی زبان نہایت ہی صاف اور سادہ ہے۔ روزمرہ محاورات اور جملوں کا استعمال کیا ہے۔ جملے اور عام فہم الفاظ کا استعمال بڑی مہارت سے کیا گیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے پورے افسانے میں کہیں جھول نظر نہیں آتا ہے۔

جسم بستی : اس افسانہ کا موضوع بھی رومانی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی عورت کو ہی

---

[1] آنند لہر۔ سرحد کے اُس پار (سیمانت پرکاشن نئی دہلی) 2001ء۔ ص۔ 35

ٹھہرایا گیا ہے۔ جہاں تک ''جسم بستی'' کے پلاٹ کا تعلق ہے۔ ثریا بائی جو اپنے جسم کی تجارت کرتی ہے۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد وہ اپنے اس دھندے سے تنگ آجاتی ہے۔ ایک ہی طرح کی آوازیں سُن سُن کر اُکتا جاتی ہے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر ایک شریفانہ اور مذہبی زندگی گذارنا چاہتی ہے۔ بچپن میں ایک ہزار روپے کے عوض میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ اس کا سودا کرنے والا اس کا چچا تھا۔ جو اس کے باپ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ثریا بائی چھوٹی ضرور تھی لیکن عقل مند تھی۔ اسے یہ سب باتیں بُری لگتی تھیں۔ مگر مرد کے جبر کے سامنے وہ بے بس ہوگئی۔ ثریا بائی خوبصورت تھی۔ اس کے پاس بڑے بڑے لوگ آنے شروع ہوئے۔

ثریا بائی کو عام عورتوں کی طرح مردوں کی ہوس کا نشانہ بننا پسند نہ تھا۔ وہ اپنے جیسی تمام مجبور اور بے بس عورتوں کو اس مصیبت سے بچانا چاہتی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ دوسری لڑکیوں کی زندگیوں کو بچانے کے لیے کچھ نیا کرنے کا سوچا۔ وہ چناؤ لڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی بھی سیاسی لیڈر راکھڑا نہیں ہوتا۔ چنانچہ سب کی حمایت اس کے حق میں جاتی ہے وہ الیکشن میں جیت کر اسمبلی ممبر بھی بن جاتی ہے۔

ثریا بائی اپنی بستی کو چھوڑ کر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ بہت جلد تمام عورتوں کے لیے فلاحی پروگرام بنائے گی۔ انھیں سماج میں اعلیٰ مقام دلائے گی۔ الیکشن کے ہنگاموں کے بعد اپنی جیت کی خوشی میں وہ اپنے گھر میں مست ہو کر بیٹھی ہوئی ہے۔ کہ اسے پھر وہ پرانی آوازیں گھیر لیتی ہیں۔ لاکھ روپے، دو لاکھ روپے۔ اگر جاگر ناتھ کا چیف منسٹر بنا تا ہے اور ثریا بائی حیران ہو جاتی ہے۔ اور اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بھی ضمیر بکتے ہیں۔ آتما بکتی ہے۔ وہ اس سوچ میں گم ہو جاتی ہے۔ کہ عورت کے پاس صرف ایک جسم ہے۔ وہ چاہے منسٹر ہو جائے۔ کسی بھی روپ میں ہو۔ حوالہ سسٹم ختم نہیں ہوگا۔ یہ سسٹم چاہے پردے میں ہو۔ یا بظاہر لیکن چلتا رہے گا۔ ثریا بائی پھر اپنی بستی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ آہر صاحب کی زبانی سُنیے۔

''ثریا حیران رہ گئی۔ پھر وہی آوازیں۔ حوالے ہو جاؤ''۔ میری
ہو جاؤ جو چاہو گی۔ وہ ملے گا۔ شہزادی بن جاؤ گی۔ منسٹر سے آگے

بہت آگئے''۔ ا

اس افسانے میں آنند لہر نے عورت کے استحصال کی کہانی بیان کی ہے کہ عورت حالات سے بے بس اور لاچار ہوکر یہ دھندا قبول کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں عورت کے اپنے رشتے دار کہیں چچا۔ کہیں باپ۔ کہیں بیٹا۔ اور کہیں خاونداس کا سودا کرتے ہیں۔ کم عمر لڑکیوں کو محض چند سکوں، روٹی کپڑا اور کہیں جائیداد چھڑانے کے عوض عمر رسیدہ مردوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے ۔ عورت کے استحصال کا سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ افسانہ ''جسم بستی'' کا انجام اس طرح سے ہوتا ہے کہ ایک عورت جو الیکشن جیت کر ممبر اسمبلی بنتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ عورت کا استحصال کرنے والوں کو سخت سزا دلوائے گی اور مظلوم لڑکیوں کو سماج میں اعلیٰ مقام دلوائے گی اور اُن کی فلاح کے لیے مناسب اقدامات اُٹھائے گی لیکن اس کے کانوں میں پھر وہی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں جن سے وہ تنگ آجاتی ہے اور مجبور ہوکر پھر اسی معاشرے میں دھنس جاتی ہے۔

سپیرن: ''سپیرن'' آنند لہر کی ایک علامتی کہانی ہے۔ جس کا موازنہ کہانی کار نے براہ راست انسانی نفسیات سے جوڑا ہے۔ اور سپیرن کہانی کے سانپ جیسے کردار کو اتنا زہریلا نہیں سمجھا ہے جتنا کہ نفرتوں اور رنجشوں سے بھرے ہوئے انسان کو ڈستے ہوئے دکھایا ہے۔ انسان کی تشبیہ وہ سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہے۔ جو اپنے اوپر مذہبوں اور عقیدوں کی چادر اوڑتا ہے اور اس طرح سچائی، انسانی ہمدردی، اور انسانی قربت سے دور بھاگنا چاہتی ہے۔ یہاں تک سانپوں نے اب انسان سے دور بھاگنے کی ٹھان لی ہے۔ سپیرن کا گلی گلی اور گاؤں گاؤں گھوم کر اس طرح گھومتی ہے جیسے انسانوں وسانپوں کا رشتہ دائمی ہو۔ کیونکہ ڈنگ مارنا سانپ کی فطرت ہے۔ اور سراپا جسم کو کریدنا انسان کی فطرت ہے۔ بڑی ذہنیت اور سمجھ داری سے سانپوں کو انسان کے روپ میں کہانی کار نے پیش کیا ہے۔

یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گلے میں سانپوں کو رکھ کر اس کو اپنی عبادت کا ذریعہ مانتا ہے۔ جس طرح انسان دوسرے انسان کو نیست ونابود کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ اس طرح کہانی میں سانپ نے علامتی طور پر سپیرے کو ڈنگ مارا۔ ان الفاظ کا براہ راست تعلق انسان کی گناؤنی فطرت سے ہے۔ جو انسان کو مار کر بھی

ا۔ آنند لہر۔ سرحد کے اس پار (سیمانت پرکاشن نئی دہلی) 2001 ص۔ 73

شرم سار نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کہانی میں سانپ ڈنگ مار کر اپنی شرمندگی کا اظہار کرتا ہے۔

انسان اپنی حرکتوں سے ہر وقت کسی نہ کسی طرح سے کاغذ کے ذریعے، کبھی مقدموں میں پھنسنے کے ذریعے، کبھی جھوٹ اور عبس کا سہارا لے کر انسان کو ایسے زمین سے بھٹک کر زمین دوز بنا دیتا ہے۔ اور اس کا وجود بھی کہیں نیست و نابود ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کاغذات اور فائلوں کے چکر میں کس طرح انسانی شوق اس کے جذبے اور ولولے کو مٹی میں ملا دیتا ہے اور اس کے بدلے انسان کو اپاہج بنا کر چوراہے پر لاوارث لاش سمجھ کر خود چلا جاتا ہے۔

کہانی کا دِل خراش اور آزردہ کرنے والا سین اس وقت اُبھر آتا ہے۔ جب سانپ کے بدلے سپیرا ہی مر جاتا ہے۔ اور وہ خواب چور چور ہو کر ٹوٹ جاتا ہے۔ جس کے لیے سپیرن زندگی میں کامرانی اور کامیابی پانے کے لیے عمر بھر جستِ وخیز کرتے ہیں لیکن ظالم زمانے کے لوگ اسے بجانے والی بین کو خاموش کر دیتے ہیں۔ جس کے اندر سات سراخوں میں اس کی زندگی روزی روٹی چھپی ہوئی ہے اور وہ آہیں بھر کر ابدی نیند سو جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔

بنجارن: ''بنجارن'' سرحد کے اس پار افسانوی مجموعے میں شامل ایک عشقیہ کہانی ہے۔ اس کہانی میں کہانی کار نے آسمان کا رشتہ ریت کے ذروں سے اور ذرات کا رشتہ انسان کی بقاء سے اس طرح جوڑا ہے جس طرح سمندر کی موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں اور ریت کے ذرے کسی جگہ اپنی مستقل ساخت نہیں بناتے۔ اسی طرح انسان ایک بنجارا ہے۔ اور وہ دُنیاوی بازار میں خود کو کھویا کھویا سا پاتا ہے اور اپنے آپ کو گم پاتا ہے۔

کہانی کار نے ذرا سی آہٹ سے ٹوٹنے والی مختلف رنگوں کی چوڑیوں سے انسان کی خوبصورتی کو تشبیہ دی ہے۔ اور اس خوبصورتی کو ایک بھرا بازار مانا ہے۔ جہاں کہانی کا مرکزی کردار مینا بنجارن ہوتی ہے جس کی تلاش کہیں نہ کہیں کسی کو ہوتی ہے۔ جس کی دلکشی اور مختصر سی مسرت چوڑیوں کی کھنک ہوتی ہے۔ اور زمین کے سائے یعنی آسمان کو عاشق سمجھتا ہے لیکن ساتھ ہی ایک مسلسل خیال سے وہ کائنات کو عارضی سمجھتا ہے لیکن ساتھ ہی ایک مسلسل خیال سے وہ کائنات کو عارضی سمجھتا ہے۔ اور زندگی کو بکھرنے والی قطار سمجھتا ہے۔ وقت کو اپنا مقدر سمجھ کر اپنی تقدیر سمجھتا ہے۔

کہانی کار اس دُنیا کو اتنا مختصر سمجھتا ہے ۔جتنی مختصر چوڑیوں کی عمر۔آخر کانچ کی چوڑیاں پتھر کی لکیر تو نہیں ہوتی ۔چوڑیوں کا مقصد ٹوٹنا ہے۔اُس وقت کہانی کا کردار ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے ۔جب اس کے بدن میں ایک جوش اور ولولہ محسوس ہوتا ہے جب اس کی آنکھیں مینا بنجارن سے ٹکراتی ہیں۔ جذبات کے داؤ میں بہنے والا شخص مینا سے اپنی باہوں سے چوڑیاں چڑھانا پسند کرتا ہے اور وہ حیرانگی کے عالم میں جانے کہاں کھو جاتی ہے۔اور اسے رادھا کا کالا بدن اور کنہیا کا گورہ بدن ۔لیکن یہ سارا سپنا اُس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب اس کا والد اُسے آواز دیتا ہے ۔وہ کہتا ہے کہ یہ شخص اگر مرد ہے تو کیا ہوا''ہم بنجاروں کو پیسوں سے غرض ہے۔نکہ باہوں کا'' مینا کا باپ اپنی بیٹی سے رنگ برنگی چوڑیاں دوسروں کو چڑھاتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے اور اپنے فن کا مظاہرہ اس طرح کرتا ہے ۔کہ چوڑیوں کا کاروبار بھی بڑھے ۔لیکن اندر سے چوڑیوں کے ٹوٹنے کا بھی اُسے احساس ہوتا ہے۔

یہ ایک صداقت پر مبنی بات ہے کہ انسان کا دوسرا نام ہی محبت ہے ۔اور اسی محبت کو بیرونی عملاً کے لیے خدا نے اس کائنات میں انسان کو بھیجا ہے ۔لیکن اس شرط پر کہ وہ آپسی محبت ، بھائی چارے اور شفقتوں سے دُنیا میں رہے۔

یہاں پھر ایک جگہ کہانی کار ہیر اور رانجھا کے بیچ کھڑی کی ہوئی دیواروں کا بھی ذکر کرتا ہے۔آخر کون سی کشش تھی جو مینا کو دیپک میں دکھائی دیتی تھی ۔شاید اس لیے کہ اس کا والد بچپن میں ہی جھوٹی دُنیا کو لات مار کر چلا گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی امی بھی اسے بے حد پیار کرتی تھی۔

دیپک ، مینا کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو چکا تھا کہ وہ ہر روز مینا سے چوڑیاں چڑھاتا ہے۔محلے کی لڑکیوں کو روپے دیتا ہے تاکہ بنجارن انھیں چوڑیاں چڑھائی جائے ۔اس طرح دیپک کا روز وشب گذرتا تھا۔ ایک دن ایسا بھی ہوا کہ دیپک کی باہوں کو چومتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ اس کا مطلب اس بات سے اخذ کیا جاتا ہے کہ مینا کی رگ رگ میں دیپک کے لیے کتنی محبت تھی ۔لیکن کیا کیا جائے۔بنجاروں کا کہیں ٹھکانا نہیں ہوتا۔ دوسری طرف گلو نام کا کردار کہانی میں ایسے گھس جاتا ہے کہ اُس کے اندازے کے مطابق بنجارا بنجارا ہی ہوتا ہے۔

ایک دن دیپک بازار آتا ہے بڑھی ہوئی داڑھی اس کے چہرے سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ جو مینا کے پیار میں پاگل ہو چکا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بنجاروں کا بازار گم نہ ہو جائے۔ بنجارے چلے نہ جائیں۔ دیپک اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا جو بچپن میں ہی یتیم بن چکا تھا۔ ماں نے کچھ روپے اس کی شادی کے لیے رکھے تھے۔ اس کے برعکس دیپک محلے کی لڑکیوں کو اکٹھا کرتا اس لیے کہ یہ لڑکیاں چوڑیاں خریدیں۔ اور چوڑیوں کا بازار بھی بند نہ ہونے پائے۔ دیپک کے دِل کی دھڑکنیں مینا کے ساتھ جڑ گئیں۔ اُسے وہ بنجارن نہیں سمجھنے لگا۔ اور وہ دیپک کی ماں کو اپنی ماں سمجھنے لگی۔

ایک دن وہ بازار چلی گئی۔ اُسے یہ چلاتے ہوئے سنا گیا۔ کہ چوڑیاں خریدو۔

''دس روپے کی چوڑیاں ایک روپے میں''

بھیڑ اس کے ارد گرد جمع ہوئی اور پیسے برسنے لگے۔ دیپک وہاں سے گذر رہا تھا۔ مینا نے چیخ کر کہا۔

''دیپک تمہاری ماں کا علاج میں کراؤں گی یہ لو پیسے، یہ لو روپے، گھبراؤ مت''۔

دراصل دیپک کی ماں بیمار تھی۔ گلو نے سردار کو کہا

''سردار میں نے کہا تھا کہ مینا کو پیار ہو گیا ہے۔ دیکھو نہ مینا دیپک کے لیے جینا چاہتی ہے۔ اور دیپک مینا کے لیے۔ یہ بنجاروں کے بازار کے اصول کے خلاف ہے''

سردار نے مینا کو پکڑا اور اعلان کیا کہ اب بازار کسی دوسری جگہ لگے گا۔ تب سے آج تک دیپک گلی گلی گھومتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ بنجارے کب تک آئیں گے اور بازار کب سجے گا۔ ایک دِن ایسا ہی ہوا۔ بنجاروں کی ایک ٹولی اس جگہ اُس گاؤں آئی۔ انھوں نے بازار لگایا مگر مینا اُن میں نہیں تھی۔ معلوم ہونے پر یہ پتہ چلا کہ بنجاروں کی کئی ٹولیاں مختلف جگہوں پر بازار سجاتی ہیں۔ جب کہ اُن کے بازار سجتے بھی ہیں اور مٹتے بھی ہیں۔

اس کہانی میں انسانی نفسیات کو کہانی کار نے انتہائی سلیقے سے پیش کیا ہے۔ دیہاتی رواجوں اور نسل پرستی سے لوگوں کا قافلہ یا کہیے بنجاروں کا قافلہ اپنی سوچ کے دائروں سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ یا مجبوریوں کی سلاخوں کے پیچھے پیار و محبت کو قربان ہونا پڑتا ہے۔ جیسا کہ مینا کے مقدر میں ہوا اور دیپک کے پاگل پن پر آتے آتے ختم ہوا۔

افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' کے
چند افسانوں کا تنقیدی جائزہ

آنند لہر کی افسانہ نگاری کا ایک اہم ثبوت ''کورٹ مارشل''، تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس افسانوی مجموعے میں کل 22 کہانیاں شامل ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ 150 صفحات پر مشتمل ہے۔اس مجموعہ کو مانوی پرکاشن پنچ تیرتھی نے 2006ء میں شائع کیا۔اس کتاب کا پیش لفظ نامی انصاری نے تحریر کیا ہے۔اس مجموعے کا نام شامل کہانیوں میں سے ایک کہانی کورٹ مارشل کے نام پر رکھا گیا۔زیر بحث مجموعہ میں لکھی گئی کہانیاں ہماری سماجی زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔انسانی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو بھی انہوں نے فنکاری سے مجموعے کی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔مجموعہ میں شامل کہانیوں کے نام یوں ہیں۔

۱۔اب تھانہ چل پڑے گا۔	۲۔دادی اماں	۳۔کورٹ مارشل
۴۔سپاہی	۵۔دُعا	۶۔سنہرا کفن
۷۔کھیر	۸۔گواہوں کا بیوپاری	۹۔چند لمحے
۱۰۔ویشیا	۱۱۔برف اب بھی سفید ہے	۱۲۔گوتم بدھ سڑک
۱۳۔صرف ایک آدمی	۱۴۔کرایہ کا مریض	۱۵۔اگر ایسا ہوا
۱۶۔خالی ہاتھ	۱۷۔ٹھنڈا چہرہ	۱۸۔فائر بریگیڈ
۱۹۔تیروں کا کھیل	۲۰۔تیاگ	۲۱۔ایک خبر

۲۲۔انسان کب جیتے گا۔

آنند لہر کے زیر تبصرہ مجموعہ میں شامل اکثر کہانیوں میں ہمارا سماج سسکیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔اس مجموعہ کی پہلی کہانی ''اب تھانہ چل پڑے گا''۔ ہمارے سماج کا بہت بڑا المیہ ہے۔اس کہانی میں آنند لہر نے ایک پرسکون گاؤں کی زندگی کو جہنم میں تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔شروع میں ایک پولیس چوکی قائم کی جاتی ہے جب بعد میں وہ چوکی تھانہ بن جاتا ہے تو گاؤں کا ہر جوان جرم کرتا ہے۔الغرض ہر برائی وہاں پر جنم لیتی ہے۔اسی طرح کی ایک اور کہانی ''سنہرا کفن'' ہے۔جس میں ایک غریب گھرانے کی زندگی کو پیش کر کے غریبی کی چکی میں پسنے والے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ''کھیر'' بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ جہاں ایک طرف غربت کا پرچار ہے وہیں دوسری طرف غریب لوگوں کی عزت کا کھلواڑ بڑے لوگوں کے

ہاتھوں ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔اس طرح ایک اور افسانہ ''فائر بریگیڈ'' بھی اہم ہے۔الغرض اس افسانوی مجموعہ کی تمام کہانیاں ہماری اور آپ کی زندگی سے تعلق رکھنے والی کہانیاں ہیں اور ان کہانیوں کو پڑھ کر قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔لہر نے ان افسانوں میں ہمارے سماج کا بہترین عکس پیش کیا ہے۔

آنند لہر کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے نامی انصاری رقمطراز ہیں۔

> ''آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں۔اس لیے بھی ان کے افسانوں کے تانے بانے عموماً چست درست ہوتے ہیں اور ان میں شاذ و نادر ہی کوئی بھی بھول ہوتی ہے۔وہ ہر موضوع کو اس کے منطقی انجام تک بخوبی پہنچا دیتے ہیں۔ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پامال موضوعات کو نہیں چھوتے ۔ بلکہ اپنے افسانوں کے لیے نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانیت کی اکائی پر کامل یقین رکھتے ہیں۔اس کو ملکوں اور خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے ۔ کیونکہ زمین کی سرحدیں بنتوائی ہیں اور انسان کی انسانیت کو سرحدوں سے نہیں ناپا جاسکتا''۔[1]

اب اس مجموعے میں شامل چند کہانیوں کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔**اب تھانہ چل پڑے گا**۔:آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' میں شامل ''اب تھانہ چل پڑے گا'' پہلی کہانی ہے۔یہ کہانی کافی دلچسپ ہے۔''اب تھانہ چل پڑے گا'' میں ایک پرسکون گاؤں کی تھوڑی سی آبادی ، پرامن زندگی گذار رہی ہے۔گاؤں میں حکومت کی طرف سے امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک پولیس چوکی کھول دی جاتی ہے اور پھر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔جرم اور رشوت کی بافت کاری شروع ہو جاتی ہے۔اور گاؤں کی یہ چھوٹی سی جنت جہنم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کہانی کے شروع میں جدید دور کی عریانیت اور جرائم کی پوری طرح عکس بندی کی گئی ہے کہ کس طرح شہروں میں پائی جانے والی فحش اور جرائم کی لہر گاؤں تک پہنچتی ہے۔

---

[1] ۔نامی انصاری۔پیش لفظ۔کورٹ مارشل۔از آنند لہر۔2005۔ص۔12

یہ عمل مسلمہ ہے کہ دور جدید میں لوگ خاص کر لڑکیاں اپنے چہرے اور جسم کی نمائش میں لگے رہتے ہیں۔اسی طرح اس گاؤں کا بھی ذکر ہے جہاں سیاسی وقانونی میٹنگوں کا انعقاد کیا جاتا ہے

اس قسم کا ذکر ایک بزرگ آدمی نے کیا۔جس کی آنکھوں کے اندر دیکھنے کی طاقت ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔جس نے ہزاروں میلوں کا فاصلہ طے کیا ہے۔مگر ایک قدم بھی چل نہیں سکتا۔ایک دن اس نے ایک محاورے کا استعمال کیا۔

''بجلی گری اچھری مری''۔یہ کہتے کہتے صبح ہوگئی اور سورج طلوع ہوگیا۔اب تمام آسمان پر سورج کا قبضہ ہو چکا تھا اور تمام خلقت اس لمبے چوڑے آسمان کی وسعتوں کے بارے میں ذکر کر رہے تھے۔

اس افسانے میں طنزیہ طور پر افسانہ نگار نے لکھا ہے۔

''آج سورج چونکہ اپنی شادی کرنا چاہتا ہے۔اس لیے اُس نے بادلوں پر پردہ ڈال دیا ہے''۔

ایک بوڑھی نے تو یہ بھی کہا۔

''سورج چھپ پر اپسراؤں سے پیار کرتا ہے۔اس لیے بادل آتے ہیں''۔

یہاں کہانی کار کا مطلب سورج کی مغروریت کو توڑ دینا ہے تاکہ بادلوں کے سائے میں سورج اپنی روشنی کو دھرتی تک نہ پہنچا سکا۔مگر اچھری کی بات دوسری ہے۔یہاں پر اچھری کو کہانی کار نے ایک کردار کے روپ میں پیش کیا ہے اور اچھری سے کہلاونا چاہتا ہے کہ آسمان میں سورگ ہے۔اور یہ دیوتاؤں کی سواری میں کام آتا ہے۔یہاں تک کہ پریاں بھی آسمان میں ہی رہتی ہیں۔

یہاں پر کہانی کا ایک حسین موڑ آتا ہے۔جب ایک نوجوان لڑکی نے اچھری سے پوچھا کہ جنت کی پریاں پیار تو کرتی ہیں لیکن اُن سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا کیونکہ پریاں اُڑتی ہیں ان کا ٹھکانہ کہیں نہیں ہوتا۔لڑکی یہ سُن کر خاموش ہوجاتی ہے لیکن اسی دم کہتی ہے کہ میں ایک ان پڑھ ہوں زمین کی زبان نہیں سمجھ سکتی ۔اور آسمان کی کوئی زبان نہیں ہے۔اس لیے جانتی ہوں۔کہانی کار نے اچھری کا کردار آسمان کے روپ کے ساتھ جوڑا ہے۔گاؤں والے اسے پیار کرتے تھے جو اُن کے پاس فالتو روٹی بچ جاتی تھی۔اچھری کو دیتے تھے ۔شادی بیاہ کے موقعوں پر اچھری خود ان کے گھر میں بن بلائے جاتی تھی ۔اور یہ سمجھ کر یہ بھی میرا گھر ہے۔وہ

وہاں پرناچتی گاتی اورکودتی بھی تھی۔لیکن ساتھ ہی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھی چھلک جاتے تھے۔لوگ اُسے طعنے دیتے تھے کہ اُس کی آنکھوں میں بیماری ہے۔جب وہ لڑکی والوں اورلڑکے والوں کے ہاں گیت گاتی توٹوکا ٹاکی کرتی تھی۔اچھری سچ بولنے کی عادی تھی۔اگر کہیں بہوساس سے لڑتی تھی اور ساس گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتی تھی۔تو بہوساس سے کہتی تھی کہ اگرتم ''نکال دوگی میرے لیے اچھری کا جھونپڑا ایک محل سے کم نہیں''۔پھرایک بار اچھری کی انسانیت کا قرب اُس وقت جاگ جاتا ہے جب گاؤں میں کسی شخص کی موت ہوجاتی تھی۔تو اچھری کی آنکھوں میں ایک دریا بہہ نکلتا۔یہ بات تب ثابت ہوئی جب کرن کی ماں مرگئی۔اس کی بیوی شہرکی تھی۔رونا نہیں جانتی تھی یہی تماشا کرن کی بیوی نے اُس وقت کیا۔جب وہ کرن کی لاش کوٹھکانے لگانے کی جلدی میں تھی۔کیونکہ اُس کی بیوی کا فیشن ڈیزائن کا کورس چل رہاتھا۔کرن کی یہ خواہش بھی تھی کہ اُس کی ماں کے مرنے پرکوئی ضرور روئے۔تب گاؤں والوں نے اچھری کو بلاوا بھیجا۔جب اچھری چلاچلاکرروئی تب گاؤں والوں کومعلوم ہواکہ کوئی گاؤں میں مرگیا ہے۔اچھری کا نرالا انداز رونے کا بھی تھا۔اورہنسنے کا بھی۔

ایک بارگنیش کی بہن کی شادی ہورہی تھی تو گیت گانے والا کوئی نہ تھا۔کیونکہ گنیش کے ماں باپ بچپن ہی میں مرگئے تھے اوراُس کی تائی جائیداد کے جھگڑے کی وجہ سے شادی میں نہیں آئی تھی۔اس لیے اچھری نے جب گیت گائے توسب کومعلوم ہواکہ اُس کے گھرمیں شادی ہے۔اچھری رونے اورہنسنے میں یکساں قدرت رکھتی تھی۔اس طرح جب ہم اچھری کے کردار کو بھانپنے کی کوشش کرتے ہیں توصاف ظاہرہے کہ اُس کے اندرکوئی فرشتہ بیٹھا ہے۔

کہانی کے اس حصے میں ایک پولیس افسر کے ظلم اورنا اہلیت کا اندازہ اُس وقت ہوتاہے جس وقت ایک نئی چوکی کھولنے کے لیے کان چند حوالدار اوراُس کے ساتھ تین سپاہیوں کوبھیجا جاتا ہے۔پولیس کی بربریت اورعامرانہ رویہ تب ظاہرہوتاہے جب اُسے افسروں نے سیدھے سادھے لوگوں کو ہاتھ کڑیاں پہننے اورڈنڈے مارنے کے لیے سپاہی دیئے تھے۔حوالدار کان چند ظلم اورتشدد کرنے کا عادی بن چکا تھا۔اُس کی بدنامی علاقے کے چاروں اطراف اتنی پھیل چکی تھی کہ اگروہ ایس۔ایس۔پی (S.S.P) بھی

بنایا جاتا تو لوگ اسے حوالدار کے نام سے ہی منسوب کرتے۔

رشوت خوری اس کے دل و دماغ میں ایسی سرایت کر چکی تھی کہ ایک بار اُسے کہنا پڑا کہ اگر دوسرے تھانوں سے کمایا ہوا کچھ حصہ اُسے نہ دیا گیا تو اُس کے تھانے کو بند ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ اگرچہ کان چند پولیس چوکی کا حوالدار تھا۔ لیکن اُس چوکی کو بھی لوگ تھانہ ہی کہتے تھے۔ کان چند نے گاؤں کے لوگوں کو قانون سکھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بلند بانگ دعوے کرتا تھا کہ اُس کے پاس 550 دفعات ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اُن میں سے کسی بھی دفعہ کا استعمال کر سکتا ہے۔

اب لوگ اچھری کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ گاؤں کا نمبر دار نہیں چاہتا تھا کہ اچھری کی شادی اُس کے لڑکے کے ساتھ ہو جائے مگر سماج کو ایک طرف رکھ کر نمبر دار کے لڑکے نے اچھری کو گھوڑے پر بٹھایا۔ اور دوڑانے لگا۔ گھوڑے نے اچھری کو گرا دیا۔ خود نمبر دار کا لڑکا دوسرے نمبر دار کے گھر چلا گیا۔ لوگوں کے لیے اچھری مر گئی تھی کیونکہ اچھری نے وہ گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ نمبر دار کے لڑکے نے دوسرے نمبر دار کی لڑکی سے شادی کی تھی اور سارا الزام گھوڑے پر لگایا۔

اس دھچکے کو برداشت نہ کرتے ہوئے اچھری مر گئی۔ سارا گاؤں رو پڑا۔ لوگوں نے اچھری کو جلانے کے لیے کفن اور لکڑیوں کے لیے روپے اکٹھے کیے۔ ایک شخص نے کہا کہ اس کو جلانے سے پہلے پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیئے۔ دوسروں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور تھانے کی طرف چل پڑے۔ کان چند خوش ہوا۔ ایسے لگا کہ اچھری مری نہیں بلکہ پیدا ہوئی۔

ایک شخص نے کہا

''لکھو صاحب! بجلی گری اچھری مری''۔

''اچھری مری بجلی گری'' کان چند نے لکھا اور کہا۔

''ہمارا چائے پانی؟''۔ سب حیران ہو گئے اُس شخص نے اپنی بات دہرائی۔

''نہیں صاحب بجلی گری اچھری مری''۔

اس پر دوسرے سپاہی نے کہا

''اچھری مری بجلی گری یا بجلی گری اچھری مری مگر ہمارا چائے پانی ہر حالت میں قائم رہتا ہے''۔

ایک بوڑھے نے کہا لکڑیوں میں سے ایک بوڑھے نے کہا کہ لکڑیوں کے پیسے میں سے چائے پانی دے دو۔

''نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے''

دوسرے بوڑھے نے کہا۔

''کیوں''

پہلے بوڑھے نے پوچھا

''کیونکہ اگر اچھری کی لعش پوری نہ جل سکی تو چڑیل بن کر گاؤں میں گھومے گی اور اس کا انجام تم سب جانتے ہی ہو''۔

کسی اور بوڑھے نے مشورہ دیا۔

''اچھری پر کفن آدھا ڈالا جائے اور آدھی لعش ننگی رہنے دی جائے''۔

کفن کے پیسوں میں سے آدھے حوالدار کو دیئے گئے۔

''صاحب بونی ہو گئی۔ لگتا ہے تھانہ چل پڑے گا''۔

''اس کے بعد سے لے کر آج تک اس گاؤں کی لڑکیوں کے جسم ننگے ہوتے ہیں۔ اگر چہ انھوں نے پورے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ یہاں کا ہر ایک نوجوان ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کے جسم ننگے نظر آتے ہیں۔ پولیس کا ہیڈ کوارٹر بھی وہاں ہے۔ اس لیے تمام قانونی میٹنگیں بھی یہاں ہی ہوتی ہیں''۔[1]

کہانی کا کلائمکس اُس وقت تجاوز کر جاتا ہے جب جان بوجھ کر اچھری کو گھوڑے سے گرا دیا جاتا ہے اور بجلی گرنے سے اُس کی موت کا ناٹک رچایا جاتا ہے لیکن اُس کا صحیح چاہنے والا نمبردار کا لڑکا ہے۔ اچھری کے

---

[1] آنند لہر۔ کورٹ مارشل۔ ص۔ 19

جھونپڑے کے گرد گھومتا ہے۔ جس اچھری کو نمبردار کی حویلی کے اندر بہو بن کر جانے سے زمانے کی بے رحم گردشوں نے جانے نہیں دیا۔

دادی اماں: آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' میں شامل ایک مختصر کہانی ہے۔ ''دادی اماں'' لہر صاحب کی ایک ایسی کہانی ہے جو قاری کے دِل و دماغ کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ دادی اماں کے دو پوتے ہوتے ہیں۔ جن کے نام راجہ اور گوپی ہے۔ جب یہ چھوٹے تھے تو ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کا سہارا دادی اماں ہے۔ دونوں لڑکے بہت ہی پریشانی کی زندگی گذارتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی زندگی کا ہر نیا دِن ایک نئی پریشانی کو دعوت دیتا ہے۔ دادی اماں نے ان دونوں کی پرورش بڑے ناز و نخرے سے کی اور رات کو خود باہر سوتی تا کہ اندر کوئی نہ جاسکے۔ دراصل ان دونوں بھائیوں کا سب کچھ دادی اماں ہی تھی۔ اور یہ دونوں پوتے دادی اماں کے لیے سب سے بڑھ کر تھے بلکہ دادی اماں اُن کے لیے ہی جیتی تھی۔ اور اُن ہی کے لیے مرنا چاہتی تھی۔ راجہ کو باہر کے دیش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا ہوتا ہے اور اُن کے پاس اپنے دادا کی دولت ہے۔ لیکن دادا نے وصیت نامہ میں لکھا ہے جب تک اُن کی دادی زندہ ہے اُس وقت تک وہی اس کی وراثت کی حقدار ہے۔ دادی کی موت کے بعد اُن کے پوتے اُس کی وراثت کے حقدار بن سکتے ہیں تو اس لحاظ سے ایک دن وہ بہت پریشان تھے اور انہیں زندگی بہت ہی پریشان نظر آ رہی تھی۔ انھیں یہ خیال بھی آتا ہے کہ ان کی دادی اِن کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب وہ اس کو کسی طرح مارنے کے منصوبے بناتے ہیں لیکن ساتھ ہی انہیں دادی اماں کی ہمدردیاں یاد آتی ہیں۔ رات کو سونے کے بعد جب وہ صبح جاگتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دادی اماں مر گئی ہوتی ہے اس کے پاس ایک تحریر ملتی ہے جو دادی اماں نے لکھی ہوتی ہے۔ بقول آنند لہر

> ''صبح ہوئی۔ اچانک جاگ گئے۔ دادی اماں کو انھوں نے وہاں نہ دیکھا۔ گھبرائے ہوئے چارپائی کے نزدیک گئے۔ انھوں نے دیکھا وہ مری پڑی ہے۔ جیسے صدیوں سے سو رہی ہو۔ پھر نیچے ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔

''پیارے بچو''

''کپڑے کچھ دیر کے لیے دھو چکی ہوں۔ سویٹر دوسرے بڑے ٹرنک میں
ہیں ۔ راجہ تمہیں کہہ دوں کے بدیش جا کر اپنی صحت کا خیال
رکھنا اور کھانا بنا پڑا ہے۔ جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھالینا۔ بھوکے نہ رہنا'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس بے حد متاثر کن ہے۔ یہاں ہمیں اس بات کی جانکاری ملتی ہے کہ عورت کے دل کے اندر ممتا کا کوئی اندازہ نہیں۔ چاہے وہ کسی بھی صوت میں ہو۔ یہاں تو صرف دادی اماں کے روپ میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک طرف پوتے اُسے مارنے کے منصوبے میں سوچتے سوچتے سوجاتے ہیں۔ اور دوسری طرف دادی اماں اپنے آپ کو مار کر بھی اُن کی خیر خواہی کی طلب گار ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ایک خوبصورت کہانی ہے۔ ایک طرف غربت کی جھلک بھی موجودہ ذہن کی جھلک اور دوسری طرف عورت کی دردمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

کورٹ مارشل: افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' کا نام ہی اسی کہانی کے نام پر رکھا۔ یہ ایک خوبصورت اور دلچسپ کہانی ہے۔ فوج کی دو ٹکڑیاں جن کی قیادت میجر اسیم کر رہا تھا لڑ رہی تھیں۔ دھرتی کو لہولہان کر رہی تھیں۔ بارودی ہوائیں بکھیر رہی تھیں ۔فوجیوں کو خود سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی ۔ فوجیوں کے پاؤں دلدل میں پھنس رہے تھے۔ چشموں کا پانی زہریلا ہو رہا تھا۔ فصلیں تباہ ہو رہی تھیں ۔لڑائی جاری تھی۔

زور سے سیلاب آیا۔ آہ و پکار اور چیخ و پکار کا ماحول پیدا ہوا۔ دونوں سرحدوں پر اچانک طغیانی آ گئی۔ یہ جاننا مشکل ہو گیا تھا کہ کون سی زمین کس کی ہے۔ فوجیوں کی وردیاں اور شناختی کارڈ بھی بہہ گئے تھے۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں کو بچا رہے تھے۔ چیخیں ایک جیسی تھی ۔ پانی نے فصلیں بھاری ۔ دونوں طرف رکھی گئی بندوقیں بھی بہہ گئیں۔ جنگ بندی کا کوئی اعلان نہ ہوا۔ مگر جنگ بند ہو گئی ۔ وقت کروٹیں بدلتا گیا۔ اب کوئی بھی سرحد دکھائی نہ دیتی تھی ۔ فوج ایک دوسرے کی سرحدوں میں خلط ملط ہو گئی ۔ چونکہ اُن

---

[1] آنند لہر۔ کورٹ مارشل۔ ص۔ 25-24

کے پاس وردیاں نہ تھیں۔اس لیے وہ ننگے تھے۔جس سے یہ جاننا مشکل تھا کہ کون کس ملک کا ہے۔ہزاروں کی جانیں چلی گئی تھیں۔سیلاب رُکنے کے بعد وہ دریا پھر ایک چھوٹا نالہ بن گیا۔

عورتیں اس دریا کے کنارے آنے لگیں۔مگر اُن کے گھر تو بہہ چکے تھے۔وہ درختوں کے سائے میں رہتی تھیں۔ان کے جسم ایک ہی طرح کے تھے۔کہیں پر کسی ملک کا نام درج نہ تھا۔مرد مچھلیاں پکڑ کر گذارہ کرتے تھے۔گھر نہیں تھے۔مذہب نہیں تھے۔بس چین تھا۔امن تھا۔کوئی مقدمہ نہیں تھا۔دریا میں روانی قائم تھی۔سب سورج کو پوجتے تھے۔تو وہ ان کو روشنی دیتا تھا۔چونکہ سب فوجیوں کی وردیاں بہہ گئی تھیں۔اس لیے نہ کوئی افسر تھا نہ کوئی فوجی۔

کہانی کا رکازورِ قلم اس وقت نکھرتا ہے جب وہ انسان کی بنائی ہوئی لکیروں سے جھوجتا ہے۔اور انسانی رشتوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے۔کچھ دیر بعد گذرنے کے بعد ایک فوجی ٹکڑی وہاں پر پہنچتی ہے۔جنگ بند ہو رہی تھی لوگ جی رہے تھے۔

کہانی کی کیفیت اس وقت عجیب بن جاتی ہے''جب ایک فوجی نے کہا۔یاد رکھئے۔تمہارے بیوی بچے ابھی ہمارے قابو میں ہیں''۔

یہ سن کر اُنھیں اپنے گھر یاد آگئے۔یہ بھی یاد آیا۔کہ کوئی ہمارا انتظار کرتا ہوگا۔یہ کہہ کر وہ دونوں ٹکڑیاں پھر بن گئیں۔اور ایک کمانڈ میجر اسیم نے سنبھالی۔

وہ ٹکڑی دوسرے پر ٹوٹ پڑی۔

وہ دھرتی کی پہچان نہیں کرتی ہے کیونکہ سیلاب نے تمام نشانیاں ختم کر دی تھیں۔جو لوگوں کو ملکوں کو تقسیم کرتی تھیں۔میجر اسیم والی ٹکڑی نے دوسری ٹکڑی کو پیچھے دھکیل دیا۔میلوں تک وہ دور دھکیلتے۔اب معلوم ہوا جس دھرتی کی میجر اسیم حفاظت کر رہا تھا وہ دُشمن کی تھی۔

میجر اسیم کو کورٹ مارشل کی عدالت میں پوچھا۔تو اس نے جواب دیا۔بقول آنند لہر

''ہر طرف ایک ہی طرح کے درخت تھے۔اور پانی کا رنگ بھی دونوں ملکوں میں ایک جیسا تھا۔چڑیاں چہچہانے کا طریقہ بھی ایک ہی طرح کا تھا۔

جب سیلاب آیا تو دونوں ملکوں کے لوگ ایک ہی طریقے سے چیخے۔ ان کے
گھر بھی ایک ہی طرح سے بہے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دھرتی کا کوئی
سا حصہ کس ملک کا ہے''
میجر اسیم نے آگے کہا۔
''مجھے معلوم ہو گیا کہ ہم تو لڑنے کے لیے لڑتے ہیں کیونکہ زمین تو بس
زمین ہے۔ نہ اس کا کوئی ملک ہے اور نہ ہی کوئی مذہب''۔[1]

سپاہی: سپاہی ''کورٹ مارشل'' میں شامل ایک سماجی کہانی ہے۔ اس کہانی میں ایک سماجی عنصر صاف دکھائی دیتا ہے کہ کس طرح جدید دور نے رشتوں کو پامال کر دیا ہے۔ بڑی مدت کے بعد ہریش کو نوکری ملی تھی ۔اُس نوکری میں نہ کوئی سیاسی اثر و رسوخ کارفرما تھا اور نہ ہی رشوت دینے کے لیے اُس نے روپیوں کا استعمال کیا تھا۔

ایسا ہوا کہ پولیس کے محکمے کو بدنامی سے بچانے کے لیے یہ طے پایا گیا کہ پانچ فی صد لوگ بغیر رشوت کے بھرتی کیے جائیں تا کہ عدالتوں کی غیر جانبداری کا ثبوت میسر ہو۔ ہریش ٹریننگ کرنے کے لیے جاتا ہے۔ پوری تنخواہ ملتی ہے۔ اپنی بوڑھی ماں سے ملنے کے لیے ہر اتوار کو گھر آتا ہے۔

ماں سے مخاطب ہو کر ہریش کہتا ہے۔ مصیبت کے دِن چلے گئے اور اب مجھے معقول تنخواہ ملتی ہے۔ اس کی ماں کافی عرصے سے بیمار تھی ۔اور اس کا کافی خرچہ آیا تھا۔ یہاں تک کے زیورات بھی بیچ ڈالے تھے۔ ہریش اپنی ماں کے لیے زندگی چاہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتی تھی کہ تو اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہے۔ اس لیے میرے آخری سفر کی دُعا کرو۔ ہریش چٹان سا دل رکھتا ہے۔ وہ سراپا خوشیوں سے شرابور ہو رہا تھا۔ اُس کی اُمنگیں آسمان سے چھونے لگتی تھی ۔اس کا مقصد و مدعا ماں کو بیماری سے نجات دلانا تھا۔ اس طرح وہ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا۔ اب وہ محلے کے چوک پر کھڑا ہو کر کسی کو گالیاں نہیں دیتا تھا۔

---

[1] آنند لہر۔ کورٹ مارشل۔ ص۔ 30

دوسرے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کرتا تھا۔

ایک دِن ہریش کی ماں نے بھائی نارائن نے کہا کہ سپاہی بنا ہی کافی ہے۔ پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ جب کے اُس کے باپ نے کبھی پانچ سو روپے بھی نہیں کمائے تھے۔ ہریش اب نظم و نسق کا پابند ہو چکا تھا۔ اپنی وردی احترام سے رکھتا تھا۔ اس طرح ہر لمحہ اپنی زندگی کو سنوارنے کی کاوشوں میں لگا رہتا تھا۔

رشتے آنے لگے۔ اب ٹریفک پولیس کی وردی بھی بدلنے لگی۔ یہ ایک حکومتی فیصلہ تھا کیونکہ ٹریفک والوں کو ایسی وردی دی گئی جو میلی نہ لگتی۔ ہریش نے چھوٹے اور بڑے میں تمیز کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اُس نے عہد کر لیا تھا۔ ٹریفک پولیس میں آ کر کوئی حادثہ ہونے نہیں دے گا۔ پیدل چلنے والوں پر گاڑیوں کی یلغار ختم کر دے گا۔ گاڑیوں میں چلنے والے ان ٹیپ ریکارڈروں کو بند کرے گا۔ جن میں فحش گانے لگتے ہیں۔

اب وہ جینا چاہتا تھا۔ اور من ہی من میں سوچتا تھا کہ ایمانداری اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔

کان چند ایک مشہور پولیس حوالدار تھا۔ اس کی مونچھیں تنی رہتی تھیں۔ اُس کے ہاتھوں میں ڈنڈا رہتا تھا۔ لوگ کان چند کے حوالدار کے نام سے بلاتے تھے۔ یہاں تک کہ محکمے کے افسران بھی کان چند سے ڈرتے تھے۔ جبکہ کان چند اسسٹنٹ سب انسپکٹر بنا تو لوگ اُسے انسپکٹر کے نام سے پکارتے تھے۔

ہریش کان چند کے پاس چلا گیا۔ وہ بہت خوشی تھا۔ اُس نے سوچا کہ کان چند سے ٹریننگ لینے سے وہ ایک مکمل پولیس والا بن جائے گا۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں رہے گی۔ اور وہ لوگوں کی خدمت اچھے طریقے سے کرے گا۔

کان چند نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"بیٹھو"

ہریش کھڑا رہا

کان چند نے غصے سے کہا

"بیٹھو"۔

وہ بیٹھ گیا۔

حوالدار نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے ہریش سے کہا۔

''لگاؤ''

ہریش گھبرایا۔ پریشان ہوا۔

مگر دوسرے ہی لمحے کان چند نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہا جب چوک میں کھڑے ہو جاؤ تو آتی جاتی گاڑیوں کو اشارے کرو۔ تمہارتیں ہو گئے ۔ تمہارے چالیس ہو گئے۔ پھر شام کو سب میں برابر تقسیم کرو۔ پھر اوپر کا حصہ اوپر پہنچا دو۔

کان چند نے اُسے وہ سب طریقے بھی سکھائے جن سے آفیسروں کی بیویاں بھی خوش رہتی ہیں۔ اور وہ طریقے بھی سکھائے جن سے ترقی جلدی ہوتی ہے۔

ہریش گھر پہنچ کر کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ ماں اُس کے سامنے تھی مگر دیکھ نہیں رہا تھا۔ اُسے اپنا گھر چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔ مرحوم باپ کی تصویر بھی اُسے ایک فضول چیز نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں اس کا دوست گوور دھن آیا۔

ہریش کی ماں کو زور کی کھانسی آئی۔ گوور دھن نے پوچھا۔

''کیا ہوا ماں کو''

''جانے کب مرے گی بوڑھیا۔ اس سے میری خلاصی ہو گی''۔

ہریش نے جواب دیا۔

کہانی میں آج کل کا سماج اور بے ایمانی کا پیسہ ہے۔ اس کہانی کا مفہوم یہ ہے کہ کس قدر انسان بے ایمانی کی کمائی کر کے رشتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ بھی اس مقدس رشتے کو جو ایک ماں اور اولاد کے درمیان ہوتا ہے۔

سنہرا کفن: یہ ایک غریب خاندان کی درد بھری داستان ہے۔اس کہانی میں کہانی کار نے انسان کی خواہشات اور ضروریات کو قلم بند کیا ہے۔ گوبند کی تنخواہ صرف پانچ ہزار روپے ہوتی ہے۔ جبکہ ضروریات اس سے زیادہ۔ ماں باپ کی ضرورت الگ ہوتی ہے۔ جبکہ گوبند کو حساب پڑھانے والا استاد صرف ایک کرتے پاجامے کا انتظار کررہا تھا۔ تمام رشتے داروں کو آدھا آدھا کلو کے مٹھائی کے ڈبے اُسی تنخواہ سے بھیجے جانے تھے لیکن گوبند کا خیال یہ تھا کہ وہ اس بار اپنی بہن راکھی کو زیادہ پیسے دے گا۔

گوبند کی شادی کو ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا۔ شادی کے فوراً بعد اُس کی نوکری لگ گئی تھی اور وہ بھی پانچ ہزار روپے پر۔ گھر میں مسرتوں کا بول بولا تھا اور سچ بھی یہی ہے کہ گوبند کی ماں نے اپنی تمام عمر میں پانچ ہزار روپے اکٹھے نہیں دیکھے تھے۔ اس نے مفلسی، بیماری، غربتوں کے ڈھیر اور امیروں کے براتیں دیکھی تھی۔ غریبوں کے جنازے دیکھے تھے۔ پتیلیوں میں ختم ہوئے چاول دیکھے تھے۔ بچوں کو کتابیں نہ ملنے والے واقعات دیکھے تھے۔ جوان کنواری لڑکیاں دیکھی تھیں۔

گوبند کی بیوی ریکھا بڑے افسر کی بیٹی ہے۔ باپ نے اُس کی شادی اپنے مقابلے کے افسر کے بیٹے کے ساتھ کرنے کے بارے میں سوچا تھا اور ریکھا بھی اُس لڑکے کو دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی مگر ایک دن اُس کی نوکری چلی جاتی ہے۔ اُسے رشوت کے جھوٹے مقدمے میں پھنسایا گیا۔ اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اس لیے گوبند ایک اچھے کردار والا لڑکا ہی چننا پڑا۔

شالنی ریکھا کی پرانی سہیلی تھی۔ دونوں ہم جماعت تھیں۔ شالنی کی شادی ایک امیر گھرانے میں طے ہوئی تھی۔ ریکھا خوددار تھی۔ اُس نے کبھی اپنی مجبوریوں کے بارے میں اپنی سہیلی سے بات نہیں کی تھی۔ ریکھا بار بار پیسے گنتی۔ وہ روپے گن ہی رہی تھی۔ کہ شالنی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

ریکھا تم کیسی ہو

یہ دِن تمہارے ناچنے گانے کے ہیں مگر ریکھا کبھی بھی اپنے کو شالنی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ بازار جانے کے لیے ریکھا نے گوبند سے اجازت لی۔ دونوں سہیلیاں بازار چلی گئیں۔ شالنی نے اپنی گاڑی سارتھی کی دوکان کے باہر لگائی۔ سارتھی شال بیچنے کا کام کرتا ہے۔ اس کے گاہک افسر ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ چیف

منسٹر کا خاص آدمی ہوتا ہے۔ سارتھی شالنی کا سواگت کرتا ہے۔

''میری بچپن کی سہیلی ہے''۔ ریکھا۔ شالنی نے کہا۔ اتنے میں نوکر چائے لے کر آتا ہے۔ ریکھا اور شالنی چائے پیتی ہیں۔ ٹیلی فون کی رنگ بجتی ہے اور سارتھی نے ٹیلی فون اُٹھایا۔

''ڈی سی صاحب کی میم صاحب''

چیف منسٹر کی میم صاحب کے لیے!

حضور یہ دوکان آپ کی ہے سارا مال حاضر ہے بندہ خدمت گار ہے''

اس دوکان پر چھوٹے ججوں کی بیویاں اور بڑے ججوں کی بیویاں بھی آتی تھیں۔ سارتھی اپنے اثر رسوخ سے چھوٹے ججوں کے تبادلے بھی کرواتا تھا۔ شالنی ایک شال خریدتی ہے۔ اور بعد میں ریکھا بھی لالچ میں آ کر ایک شال خریدتی ہے۔ دوکاندار اپنی چالاکی سے ریکھا کو عجیب تبذل میں ڈالتا ہے۔ جبکہ اُس کی سہیلی شالنی ایک بڑے قیمتی شال پر ہاتھ رکھتی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ غریب ریکھا بھی اپنی چھوٹی شان شوکت کو قائم رکھتے ہوئے۔ بنا شال کی قیمت پوچھتے ہوئے ایک شال پر ہاتھ رکھتی ہے۔ اور اس طرح سودا طے ہوتا ہے۔ ریکھا شال والے سے اس کی قیمت کا تقاضہ کرتی ہے۔ شال والے نے پانچ ہزار کی قیمت بتائی۔ ریکھا اندر سے پریشان ہوگئی۔ لیکن جھوٹی شان وشوکت اور اپنی انفرادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پانچ ہزار روپے کے پسینے میں شرابور تھی کہ کیا کیا جائے۔ دوسری طرف گھر پر ساس انتظار کر رہی تھی جو بیسویں نہیں بلکہ اکیسویں صدی سے تعلق رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ فلم کا شو دیکھنے کے لیے بے تاب تھی اور بیچارہ سُسر ایک وقت ایک سے زیادہ رس گلے کھانے کا شوقین تھا۔ ریکھا نے ساس کو مندر میں چڑھانے کے لیے کچھ پیسے بھی دیئے تھے۔ رشتے داروں کو مٹھائی بانٹنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جب ریکھا گھر کے اندر چلی گئی۔ تو اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں خالی پرس۔

''ہائے یہ کیا ہوگیا؟۔ ریکھا کی ساس چیخی۔

گوبند اُس کی لاش پر گرا۔ ہر طرف آہ و پکار چیخ و پکار تھی۔ تم پر ہزاروں شال قربان ہوں۔ سب کچھ تیار ہوا۔ جس کے ساتھ گوبند کی ارتھی بھی تھی۔ ارتھی کے اوپر پانچ ہزار کا شال بھی رکھا گیا۔ ریکھا اس شال کے

ساتھ جل گئی۔

''کیسی پسند تھی ریکھا کی''۔

دوسرے دن سارتھی نے یہ اشتہار اخبار میں دے دیا۔

''سارتھی شال سینٹر''۔ ''کفن کے لیے تشریف لائیے''۔

''اگر آپ اپنے رشتے داروں کی لاش سجانا چاہتے ہیں ''تو سارتھی شال سینٹر پر تشریف لائیں''۔ جھوٹی شان وشوکت کو قائم ودائم رکھنے کے لیے اس کہانی میں کلاس سٹرگ درشایا گیا۔

کھیر: ''کھیر'' ایک غریب پریوار کی دُکھ بھری نفسیاتی کہانی ہے۔ جس میں انسان کی ہار اور جیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہانی کے دو اہم مرکزی کردار دھنیا اور اُس کی بیوی کا نتا ہے۔

اُس روز گھر میں مدتوں کے بعد ''کھیر'' پکنے والی تھی۔ کھیر پکنے کی خوشی میں دھنیا کی سب سے بڑی بیٹی دیوو ''کھیر'' بنانے کے برتن صاف کرنے میں مصروف ہوگئی۔ جب اُس کی ماں کھیر بنایا کرتی تھی لیکن جب آج کے نقلی دودھ اور کھانڈ کے بارے میں سوچتی ہے تو ذارسی پریشان ہوتی ہے۔ اس خوشی میں اُس کا بڑا لڑ کا دودھ، چھوٹا چاول اور بیٹی دیوو چاول لاتی ہے۔ اور پھر چاول دھونے لگتی ہے۔ کھیر بنتی ہے اور پھر وہ مزے سے کھاتی ہے۔

دراصل کا نتا کا شوق یہ تھا کہ پڑوسیوں میں اس کے کھیر بنانے کی خبر پھیل جائے۔ وہ ایک پھٹے پرانے ٹینٹ میں رہتی تھی۔ بچے بھی ٹینٹ میں پیدا ہو گئے تھے۔ ٹینٹ کے قریب ہی سیٹھ کا ایک بڑا مکان تھا۔ سیٹھ کے لڑکے کی نظریں دیوو پر پڑی۔ سیٹھ کا لڑکا کسی حد تک دیوو کے عشق کے جال میں پھنس گیا تھا۔

دھنیا ایک مزدور تھا۔ ہر وقت مٹی میں گرا رہتا تھا۔ سمجھو اسے یہ مٹی کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔ چار پیڑیوں سے دھنیا کے گھر میں یہی کام تھا۔ جب مٹی تھوڑی سی بھی دیوو کے چہرے پر پڑتی تھی۔ تو مٹی کی مورت جیسی بن جاتی تھی۔ کئی بار اُس سیٹھ کے لڑکے نے یہاں تک کہہ دیا۔ بڑی سخت مٹی سے بنی ہے۔ اسی وقت دھنیا نے دیوو سے زور سے کہا۔ کہ کھیر اچھی بنانا۔ دیوو نے جواباً کہا کہ میٹھی ہی نہیں بلکہ مزے دار کھیر بناؤں گی۔ یہ کہہ کر دیوو کھیر بنانے میں مصروف ہوگئی۔ سیٹھ کے لڑکے کے عشق میں پھنس جانا دیوو کے

لیے آگ سے کھیلنے کے برابر تھا۔

زیرِنظر کہانی میں کہانی کار نے مزدوروں کی مزدوری اور موٹی موٹی تنخواہیں پانے والوں کا استحصال کرنے کی عکاسی کی ہے۔ کیونکہ دہاڑی پر کام کرنے والے محنت کش ہمیشہ زندگی میں ایک تو پیسہ بہاتے ہی ہیں ۔دوسری بات یہ ہے کہ اُن کی آنکھوں میں ہمیشہ مقدس گنگا بہتی رہتی ہے۔یعنی آنکھوں سے بہنے والی ندی رُک جائے تو مان لیجئے اُس وقت ان کے گھر کا چولھا نہیں جلے گا۔

دھنیا نے ایک بار سنا کہ ممبران اسمبلی کی تنخواہیں بڑھادی گئیں۔اسی طرح IAS کیڈر میں کام کرنے والے پارلیمنٹ کے ممبران اور عدالت کے ججوں کی تنخواہیں بھی بڑھادی گئی ہیں لیکن دھنیا کی مزدوری نہیں بڑھ سکتی۔دھنیا کو مٹی سے جھوجھنے کا شغف زندگی بھر نہیں چھوٹا وہ مٹی کا مادہ بن چکا تھا۔دھنیا کا یہ ماننا ہے کہ انسان مٹی کا بنا ہوا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر مٹی مٹی میں مِل جائے۔اس اثنا میں کھیر تیار ہوگئی۔

سیٹھ کے لڑکے نے یہ لفظ سنے اور خوشی سے کہا ''آج میں کھیر کھاؤں گا''۔اس کے من میں ایک شیطانی خیال آتا ہے کہ دیو اس کی ہوس مٹانے کے لیے دُنیا میں آئی ہے۔سیٹھ کا لڑکا نیچے دیکھنے لگا کہ وہ آج اخلاقی جرم کر کے ہی رہے گا۔اسے بچانے کے لیے پولیس موجود ہے۔گناہ بھی کرے گا تو کفارہ ادا کرنے کے طریقے بھی موجود ہیں۔

کھیر کی خوشی میں دھنیا یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کی بیٹی جوان ہے۔اور ٹینٹ میں سوراخ بھی نہیں ۔ اسی اثنا میں ''مارومارو'' کی آوازیں آنے لگیں۔دھنیا کے ٹینٹ میں فسادیوں نے فساد بپا کیا ہے۔دھنیا کے بڑے لڑکے چلا کر کہا۔''ویل میں آؤ''۔دھنیا کی بیوی پوچھتی ہے ویل کیا ہوتا ہے ۔ دھنیا جواب دیتا ہے ۔ شاید کنواں۔دیو نے کہا جو کونے میں چھپی تھی۔پھر شور ہو جاتا ہے۔

''اب فسادی یہاں تک آگئے ہیں''۔دھنیا کی بیوی نے پوچھا۔

اب آگے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کہیں رام مندر کا جھگڑا یا ہندو مسلم فساد آتا ہے۔لیکن دھنیا کی بیوی بھگوان سے یہی کہتی ہے کہ امن قائم ہو۔بغیر کسی سوچ کے گالیاں ایک دوسرے پر برسائی جارہی تھیں۔ اس پریشانی میں دھنیا کی بیوی کہتی ہے کہ یہ فسادی کہاں سے آیا''شاید۔سیٹھ نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ

کیا ہوگا''۔

کہانی کا رُخ اس وقت بدل جاتا ہے جب سیٹھ کا لڑکا آتا ہے۔ اور دیوو کے بدن کو چاٹنے لگتا ہے پھر اُسے توڑنے لگا۔ یعنی سراسر حماقت اس دوران سیٹھ کا کُتا کھیر کھانے لگا۔ اب سیٹھ کے لڑکے نے دیوو کے بدن کو چاروں طرف گھمایا۔ اور پھر غصے سے اُسے پھینکا۔ دوسری جانب کُتے نے اسی طرح برتن کو چاروں طرف سے چاٹنے کے بعد اُلٹا سیدھا کیا اور اُلٹا کر کے چلا گیا۔

صبح ہوتے ہی دھنیا ساری بات سمجھ گیا۔ لوگوں سے پوچھنے لگا رات بھر کیا ہوا تھا۔

''کچھ بھی نہیں''

پھر سب سے پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ سیٹھ کا لڑکا خود دھنیا کے پاس آیا اور اُسے پوچھنے لگا۔

''دھنیا کیا بات ہے رات کو کافی شور تھا؟''۔ اتنے میں دوسرا پڑوسی بھی وہاں آگیا۔ کوئی فسادی آیا تھا۔ ہاں یہ لوک سبھا کی کاروائی عدمی اعتماد پر بحث چل رہی تھی۔ میں نے ٹی وی ذرا اونچا لگا رکھا تھا۔ سیٹھ کے لڑکے نے کہا ''مگر لوک سبھا تو دہلی میں ہے''۔ دھنیا نے جواب دیا۔

عصمت دری کی بات چھپاتے ہوئے۔ سیٹھ کے لڑکے نے کہا۔ یہاں بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ دھنیا کی بیٹی کی عزت سیٹھ کا لڑکا لوٹ کر لے گیا۔ اور کھیر سیٹھ کا کُتا کھا گیا۔

کہانی کے کلائمکس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جوان لڑکی دیوو اور کھیر کا وہی حشر ہوا جو طاقت اور غربت کے کھیل میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ آنند لہر نے طاقت اور عمارت کے اس کھیل کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اور وہ گواہی اس طرح سے دیتے ہیں کہ۔

> ''اب یہ سیٹھ لوگ چیزوں کو کھاتے نہیں بلکہ نگلتے ہیں۔ جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کی جوانیوں کو، کھیتوں کی فصلوں کو، چشموں کے پانی کو۔ کیونکہ اب پانی ان کی پیاس بجھانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ وہ دریاؤں کو پی رہے تھے۔ اور معصوم لوگ بوند بوند کو ترس رہے تھے''۔[1]

---

[1] آنند لہر۔ کورٹ مارشل۔ مانوی پرکاشن پنج تیرتھی جموں۔ ص۔ 53

یہ صرف ایک غریب خاندان کا ہی المیہ نہیں ہے۔ بلکہ ملک کے ایک بڑے طبقے کی دُکھ بھری کہانی ہے۔ استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی کہانی ہے۔ عدم تحفظ اور نا انصافی کی کہانی ہے۔ جسے آنند لہر نے ایک مختصر افسانے کی صورت میں کوزے میں بند کر لیا ہے۔ وہ مسائل کو سنگینی کو پوری مہارت کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں اور قاری کے ذہن کو متحرک کر دیتے ہیں۔ وہ مسائل کا حل نہیں بتاتے، بتا بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمارا پورا سماجی اسٹرکچر اس طرح کا بنا ہوا ہے کہ ہمیشہ برزخ میں ہی رہنے کے لیے مجبور ہیں۔

گواہوں کا بیوپاری: ''گواہوں کا بیوپاری'' ایک سماجی اور طنزیہ کہانی ہے۔ کہانی میں سدھیر سنگھ جموال بدنام تھانے دار کا ذکر کیا گیا ہے۔ تھانے دار کے کھانے پینے کا انتظام باہر سے ہی ایک دوکان سے کیا جاتا ہے۔ یہ تھانہ سارے شہر میں بدنام ہو چکا تھا۔ تھانے دار کی تقرری نئی نئی ہوئی تھی۔ اس لیے ایمانداری کا بھوت اس کے سر پر سوار تھا۔ تھانے کو جانے کی سڑک پر گوشت کی بڑی بڑی دوکانیں، لذیذ کھانے والے ریستوران، سنیما حال اور شالوں کی دوکانیں بھی تھیں۔

رمیش، راجہ اور گوپی تین لڑکے ایسے تھے۔ جو اسکولوں کے گیٹوں پر شام کو کھڑے ہو جاتے اور لڑکیوں کو چھیڑتے۔ راجہ چونکہ جج کا لڑکا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی لڑکیوں پر ہاتھ بھی مار دیتا تھا اور باقی لڑکے صرف لڑکیاں چھیڑنے تک ہی محدود تھے۔ اخبارات میں بھی اس قسم کی باتیں بہت اُچھالی تھی۔ تھانیدار قاضی حسن دین کچھ لڑکیوں کو چھیڑنے والے لڑکوں پر یوں ڈنڈے برسائے تھے۔ گویا کہہ رہا ہو۔

''افسروں کے لڑکوں کی موجودگی میں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کا کیا حق ہے''۔ جب تھانے دار کی تبدیلی یہاں ہونے لگی تو ڈی آئی جی صاحب نے کہا تھا کہ ایسے خطرناک آدمی کو یہاں نہ لگایا جائے۔ کیونکہ بڑے بڑے آفیسر اور سیاستدان اس تھانے کی حدود میں آنیوالے ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ اس علاقے میں بے ایمان سیاست دانوں کو بے ایمانی کرنے کی خواہش ہوتی تھی۔ پہلے پہلے سدھیر سنگھ جموال تھانیدار ایمانداری کے دم بھرتا تھا۔ ایک دن جج صاحب کا لڑکا حوالات بھیج دیا گیا۔ جج صاحب نے فوراً آئی جی کو ٹیلی فون کیا اور کہا۔

''ہمارا ہی لڑکا رہ گیا تھا''

پھر دوسرے ہی لمحے میں آئی جی نے سدھیر سنگھ جموال کو فون پر کہا۔

''عدلیہ پر ہاتھ مت ڈالو''

جموال سنگھ حیران ہو گیا۔ سب نے اسے ڈرایا۔ کہ وہ توہین عدالت میں پھنس جائے گا۔ اور دوسرے ہی لمحے معلوم ہوا کہ یہ مقدمہ دوسرے افسر کو دیا گیا۔ چلان تیار کیا گیا۔ جموال بازار گیا اور پھر جن دوکانداروں کے سامنے اُس لڑکی کو چھیڑا گیا۔ اُنہیں گواہی دینے کے لیے کہنے لگا۔ ایک دوکان دار کشمیر سنگھ نے احتجاج کیا تھا۔ اور چالان نہ پیش کیے جانے کی وجہ سے جو جلوس نکالے گئے تھے اُن کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اسی طرح دوکانداروں نے عدالت میں جا کر گواہی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ دوکانداروں نے سرکاری وکیل سے سوالات کے جوابات دینے کے گُر سیکھ لیے تھے۔

''گواہی دینے کا کیا فائدہ جج پیسے کھا کر ملزم کو چھوڑ دے گا''

اس میں چیف جسٹس کی رشوت ستانی کا ذکر بھی ہے۔ اور اس طرح کہانی کار عدلیہ کے سبھی آفیسروں کو رسوا کرتا ہے۔ کہانی کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ آئی جی صاحب کی بیوی اور کمشنر صاحب کی بہن بھی تو وکالت یہیں کرتی ہیں۔ اور پولیس کے افسروں کو اُن کی وکالت بھی چلانی ہوتی ہے۔

تھانے دار نے بہت کوشش کی کہ کوئی گواہ مل جائے لیکن بے سود

''چلان پیش کرو''

''چلان پیش کرو''

''پولیس والے ہائے ہائے''۔

''جموال ہائے ہائے''

''اگر کل تک چلان پیش نہ ہوا تو سارا شہر بند کر دیا جائے گا''۔

سدھیر سنگھ جموال گھبرا جاتا ہے۔ ایس۔ ایس۔ پی کہتا ہے کہ پولیس والوں کو پرانے حوالداروں سے بھی ٹریننگ لینی چاہیئے۔ اب سدھیر سنگھ جموال نے سیکھ لیا کہ جب بڑا حاکم دوسرے چھوٹے حاکموں کو حکم

دیتا ہے تو ماننا پڑتا ہے۔ کہانی کا رُخ اُس وقت دلچسپ سا لگتا ہے جب جموال تھانے جاتا ہے اور گوپی کو ملزم بنا کر رمیش کو گواہ بنا دیتا ہے۔ رمیش پیچام کوئی اثر نہ ہوا۔

''گھبراتا کیوں ہے والد صاحب جج ہیں''

چلان پیش ہوتا ہے۔ عدالت میں رمیش سرکاری وکیل کے پاس جاتا ہے۔ وہاں اسے اپنا پرانا دوست حمید ملتا ہے۔ حمید اُسے باہر لاتا ہے۔ حمید کا بھائی ایک مقدمے میں پھنسا تھا۔ اُس کی ضمانت کی تاریخ تھی۔ حمید کا وکیل نیا نیا ہوتا ہے۔ اُس نے سنا تھا کہ وہ بطور سرکاری وکیل رشوت تو کھاتا ہے مگر چونکہ وہ ڈی ایس پی بن گیا تھا۔ ممکن ہے بڑے عہدے پر آنے کے بعد چھوٹے مقدموں میں رشوت لینی چھوڑ دے۔ ڈی۔ ایس۔ پی ایک شخص سے کہہ رہا تھا۔

''اب میں ڈی۔ ایس۔ پی ہو گیا ہوں۔ روپے میرے عہدے کے مطابق دینا''۔

حمید نے رمیش کو یہ سب بتا دیا۔ پھر رمیش کو سرکاری وکیل نے سمجھایا تو خوب طریقے سے ملزم کے خلاف بولنا۔ جب دوسرا وکیل جرح کرے تو ملزم کو پہچاننے سے انکار کر دینا۔

ڈی۔ آئی۔ جی کی بیوی بطور وکیل پیش ہوتی ہے۔ رمیش نے وہی کیا جو اُسے سمجھایا گیا تھا۔ اور شک کی بنیاد پر ملزم بری ہوتا ہے۔ ڈی۔ آئی۔ جی کی بیوی کا نام اخبار میں آتا ہے۔ اس کی وکالت چمک اُٹھتی ہے۔ ادھر رمیش صرف عدالت کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے اور ہر کیس میں گواہ بنتا ہے۔ پھر اس کی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور بڑے بڑے مقدموں میں گواہی دیتا ہے۔ جن میں قتل کے مقدمے بھی شامل ہیں۔ رمیش کا کام اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اسے اپنے ساتھ اور گواہ رکھنے پڑے۔ اب وہ گواہوں کا بیوپاری بن چکا تھا۔ ہر شریف آدمی اس سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ کسی کے خلاف بھی گواہی دے کر ہلچل پیدا کر سکتا ہے۔ کہانی کار کہانی کے فن سے اور انسانی جبلت سے اس طرح آشنا ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات کو بھی ٹٹولتا ہے اور پیشہ وارانہ مقدمے بازوں کی رسوائی سے بھی لوگوں کو آشنا کرتا ہے۔ یہ کہانی کا کلائمکس ہے۔

ل۔ منصور احمد منصور، مضمون مابعد جدید افسانہ، مشمولہ تسلسل ششماہی مجلّہ (شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی جموں توی، جولائی ۲۰۰۲ء۔ ص ۱۸۷

گوتم بدھ سڑک: ''گوتم بدھ سرک'' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ دلی کا بدنام ترین روڈ جی۔بی روڈ کہلاتا ہے۔ یہ روڈ لڑکیوں کے دلالوں، بدمعاشوں، عصمت دری کرنے والے لوچے لفنگوں کے لیے جانا پہچانا ہے۔لیکن جب پرائے شہر سے آیا ہوا انجان کسی رکشے والے سے یوں کہے۔ کہ میں نے گوتم بدھ سڑک جانا ہے۔ رکشے والا اس انجان کو جی۔ بی روڈ لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

''صاحب مال چاہیے تو دلالوں کے چکر میں مت پھنسیے گا۔ میں بھی تازہ مال دلا سکتا ہوں''۔

اُس نے دل میں سوچا کہ شاید لوگ کتابوں کو مال کہتے ہیں اور اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جب سڑک کے کنارے پر پردھان منتری کا لگا ہوا بت ہاتھ جوڑ کر لوگوں کا سواگت کرتا ہے۔لیکن ایک دم وہ چونک جاتا ہے۔ جب سڑک کے دائیں طرف ایک لڑکی کھڑی ہوتی ہے وہ لڑکی اسے اپنی بہن کے برابر لگتی ہے۔ گوتم بدھ سڑک طاق اور تپسیا کی طرف لے جاتی ہے۔

ایک لڑکی نے اُسے اوپر آنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ سیدھا سادہ شخص شہر کی تباہ کاریوں سے نامونوس تھا جہاں کردار کوشی، ضمیر فروشی، جسم فروشی، بدکردار لوگوں کے ہاتھوں جسم کی نمائش روزمرہ زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

''دھندہ بڑا خراب ہے۔ دو دِن سے کوئی گاہک نہیں آیا ہے''۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نغمہ''

اس لڑکی نے جواب دیا۔

''اس سڑک کا نام گوتم بدھ سڑک ہے''۔

''ہاں اور ٹھیک نام ہے''

نغمہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی ۔ یہ اُس شخص کو تب معلوم ہوا جب نغمہ اُس کے ساتھ گفتگو کرنے لگی۔ خود بھی وہ پی ایچ ڈی کر رہا تھا لیکن شام قسمت کے رکشے والے نے اُسے اس دلدل اور گنوالی راستے

پر لایا جو پوری طرح سے ان باتوں سے نا آشنا تھا۔

ہمارے ہاں اب کام کم ہو چکا ہے۔ کیونکہ بڑے افسروں کے گھروں میں ہی اُن کی من چاہی ملتی ہے اور یہاں تو ویسے نام نہاد شریف افسروں کے چہرے پر کسی نہ کسی طرح سے پولیس کالق لگ ہی جاتے ہیں۔ اس بستی میں دم گھٹتا ہی ہے۔ بدن چھلنی ہوتا ہے اور اس طرح کاروبار چلتا رہتا ہے۔ یہ شخص جس کا نام راجہ ہوتا ہے۔ یہ باتیں سن کر پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ نغمہ کو سخت بھوک لگی تھی۔ راجہ نے اُسے دس روپے کا نوٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ اور وہ باہر کھانے کے لیے چلی گئی۔

کہانی کار نے اس کہانی میں سادہ لوح مردوں کی نفسیات پر ہاتھ رکھ کر ایک بے بس لڑکی کی مجبوریوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اگرچہ نغمہ نے راجہ کو اپنے چنگل میں پھسانے کی بہت کوشش کی لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد ہی اپنا حساب کتاب راجہ کے ساتھ چکانا چاہتی تھی۔ راجہ کی سوچوں میں طلاطم بپا ہوا۔ اور اُس کا ذہن گوتم بدھ سڑک یعنی جی۔ بی روڈ پر اٹکتا رہا۔

نغمہ نے کہا یہاں۔ شرابی، فسادی، ہندو، مسلمان سب قسم کے لوگ آتے ہیں۔ اور یہ دوکان سجا کر چلے جاتے ہیں۔

اس ماجرہ کے بعد نغمہ داؤ پر لگ جاتی ہے۔ راجہ کا گوتم بدھ سڑک اس کے ذہن پر بُری طرح آویزاں ہوتا ہے۔

کہانی کا کلائمکس نفسیاتی کیفیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو آج کے پست سماج میں فحش، ترقی یافتہ اور گیملر کو درختا ہے۔

اُردو افسانے میں روایتی اور تجریدی دو اہم رجحان ہیں جو مغرب کے ذریعے اُردو میں آئے۔ مستند افسانہ نگاروں نے ان رجحانات پر قلم اُٹھایا۔

آنند لہر ریاست جموں وکشمیر کے وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے روایتی اور تجریدی دونوں طرز کے افسانے لکھے۔ اور وہ طرز بیان میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ معاشرے میں عورت کا استحصال ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ اس کے علاوہ دُنیا کی بے ثباتی

،کھوکھلا پن، انتشار، افراتفری، بے قراری، بدعنوانی، نفسیاتی، رشوت خوری، بے ایمانی، ملک کی تقسیم، ان تمام موجودہ دور کے موجوعات پر انھوں نے افسانے تحریر کیے ہیں۔

آنند لہر کے افسانوی مجموعوں کے چیدہ چیدہ افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا سب سے بڑا موضوع عورت ہے۔ سماج میں عورت کا مقام، اس کا استحصال، برتاؤ اور روپ وغیرہ پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ سولھواں برس، بنجارن، جسم بستی، سورج کا قتل، گوری، گوتم بدھ سڑک، کھیر، انصاف، سرحدیں، شکست، جج صاحب، ایک اور ہجرت وغرہ افسانے اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

سرحد کے اس پار، بٹوارہ، کورٹ مارشل، افسانوی مجموعوں میں ایک طرف انھوں نے عورت کو موضوع بنایا ہے تو دوسری طرف سرحد پر بحث کی ہے۔ لہر چاہتے ہیں۔ لیڈروں، کھلاڑیوں، سیاستدانوں، اور چوروں کی طرح عام آدمی بھی سرحد کے اُس پار کے لوگوں سے ملیں۔ وہ کوئی بھی سرحد نہیں چاہتے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے آپسی بھائی چارے کو مضبوط کرنے کے لیے تلقین کی ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ انسانوں کی بنائی ہوئی سرحدیں فضول ہیں۔ وہ بلراج منیرا، سریندر پرکاش، جوگیندر پال وغیرہ افسانہ نگاروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اگر یوں کہا جائے کہ آنند لہر نے تجریدیت کا فن ان افسانہ نگاروں سے سیکھا تو شاید غلط نہ ہوگا۔

افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کا تنقیدی جائزہ

آنند لہر کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے معروف جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو فن کار قلم کو ہتھیار بنا کر اپنی شناخت کے لیے ادب کی جنگ لڑتا ہے۔ وہی سچا فن کار کہلاتا ہے۔ آنند لہر بھی ایک سچے فن کار اور وقت کے نباض ہیں۔ آنند لہر ایک وکیل ہونے کے ناطے بہت ساری مصروفیات کے باوجود ادبی میدان میں لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے جب ادبی دُنیا میں آنکھیں کھولیں تو جدیدیت کا رجحان ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ آنند لہر نے کھلے دِل سے اُس کا استقبال کیا۔ اور ایک نئے افسانوی عہد کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ وہ آج بھی ہمہ تن اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود بھی ادبی دُنیا میں سرگرم ہیں۔ ان کا ایک تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' منظر عام پر آیا۔ جس میں 34 افسانے شامل ہیں۔ 182 صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعے کا دیباچہ اشرف حسین نے لکھا ہے۔ اور اُردو بُک سوسائٹی دریا گنج نئی دہلی نے 2009 میں شائع کیا۔ اس افسانوی مجموعہ کو لہر صاحب نے بار ایسوسی ایشن کے اُن آموز وکیلوں کے نام کیا ہے جن کے آنند لہر کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی ہیں اور ان سے اُنس بھی رکھتے ہیں۔

اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کے نام یوں ہیں۔

(۱) بٹوارہ (۲) دادی اماں (۳) سمندر کا پانی (۴) موسم بدلتے رہتے ہیں
(۵) پھیکے آم (۶) رانی رانی غم خوار (۷) دوسری بے انصافی (۸) سنہری مچھلی
(۹) تھوڑی سی غلطی (۱۰) ہتھیار (۱۱) حساب جیومیٹری (۱۲) ایک داغ
(۱۳) یہ سرحدیں (۱۴) انصاف (۱۵) آگ (۱۶) وہ کدھر جائے
(۱۷) دوسرا بٹوارہ (۱۸) جج صاحب (۱۹) اس نے سوچا (۲۰) کلفیاں
(۲۱) عشق کے ہار (۲۲) سوال (۲۳) سونامی (۲۴) اور انتظار
(۲۵) اُن بچے (۲۶) ہار کی جیت (۲۷) بیراگن (۲۸) درمیان میں وہ
(۲۹) تپیا (۳۰) لوگ لوگ ہیں (۳۱) گھر (۳۲) زمین کی فروخت
(۳۳) دوسری سوچ (۳۴) ایک اور ہجرت

مذکورہ بالا تمام افسانے زندگی کی سچائیوں کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اس افسانوی مجموعہ کے

چندافسانوں کا جائزہ اس لیے لیناضروری سمجھتاہوں تاکہ اس حقیقت کاانکشاف ہوجائے کہ آنند لہر اُردوافسانے کے میدان کوہموار کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

بٹوارہ: اس مجموعہ کی پہلی کہانی ہے جس میں آنند لہر نے ایک گاؤں کوموضوع بنایا ہے۔اس گاؤں کے لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور آپسی بھائی چارے کی علامت بن گئے ہیں لیکن ایک دن ایک معمولی واقعہ رونما ہونے سے آپسی بھائی چارے میں زدپڑے آغاز نظر آنے لگتے ہیں۔جس کی وجہ گاؤں درطبقوں میں بٹ جاتا ہے۔اس افسانے کاایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بات کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی مگر بڑی ہوگئی۔ایک لڑکے کا گیند مٹکی سے ٹکرا گیا۔مٹکی نہ ٹوٹی اور نہ ہی گیند کوکوئی نقصان ہوا۔مگر نفرت کی ہوا کو چلنے کا موقعہ مل گیا''۔

اس کے بعد پنچایت ہوتی ہے اور سرپنچ کسی دوسرے گاؤں کا ہوتا ہے۔اس لیے وہ زبردستی ہمدردی جتاتے ہوئے کہتا ہے۔اب لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔اور پھر لوگ ایک دوسرے سے لڑنا شروع کردیتے ہیں۔ پھر امن کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب خدا کے لیے اکٹھے رہنا تقسیم نہیں ہونا لیکن اس کے باوجود گاؤں کی تقسیم کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رشتے اور تہذیب وثقافت بھی تقسیم کردی جاتی ہے۔اگرچہ کہانی ظاہری طور پر ایک گاؤں کی تقسیم کا المیہ بیان کرتی ہے لیکن اصل میں یہ ایک ملک کا بٹوارہ ہے جس کے دوملک بن چکے ہیں۔ایک کا نام ہندوستان اور دوسرے کا نام پاکستان ہے۔اس افسانے میں آنند لہر نے فنی چابکدستی سے سرحد کے قریب رہنے والے اُن لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو بٹوارے کا شکار ہوتے ہیں۔بیوی ایک طرف شوہر، دوسری طرف ، اسکول ایک طرف اور استاد اور بچے دوسری طرف۔الغرض ہر چیز کا بٹوارہ اس طرح سے ہوا کہ انسانی رشتے اور اقتدار کا جنازہ نکل گیا۔اب دوگز کی دوری پر رہنے والے پڑوسی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔انھیں پاسپورٹ بنانا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ شادی بیاہ رسومات وغیرہ بھی بٹ جاتی ہیں۔اس افسانے میں اس بٹوارہ اور سرحد کی بغاوت بھی نظر آتی ہے۔ملاحظہ ہو کہانی کا اصل متن۔

''فوجیوں کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر دونوں ملکوں کی بھینس اکٹھی ہوگئی۔گویاں کہہ رہی ہوں لڑائی تمہاری ہوگی۔ہماری نہیں ہے۔ہم ایک جیسا دودھ دیتی ہیں۔درخت گویا کہہ رہے

ہوں۔ ہمارا پھل ایک جیسا ہے۔ کتے بھونک کر گویا کہہ رہے ہوں۔ ہماری آواز ایک جیسی ہے۔ چڑیا درخت پر چہچہا کر کہہ رہی تھیں۔ یہ بٹوارہ تمنے کیا ہے۔ زمین کا مگر سبز ادرختوں اور پرندوں کو بھی مل رہی ہے''۔

اس کہانی میں آنند لہر نے بٹوارہ کا اثر آفاقی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ بٹوارہ سے نہ صرف انسا نبے بسی اور بے چینی کی شکار ہوتی ہے بلکہ دریا، پہاڑ اور پرندے بھی اس سے متاثر ہوتیہیں۔ آنند لہر نے فلسفیانہ انداز میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ زمین کو خدا نے صرف انسانوں کے فائدہ کے لیے بنایا ہے۔ نہ کہ تقسیم کرنے کے لیے۔ اس کہانی میں آنند لہر نے بہترین تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ سر پنچ سے مُراد وہ مغرور قوم ہے جو ہندوستانی قوم میں نفرت کو جنم دیتی ہے۔ لہر صاحب نے انگریزوں کو ہندوستانی قوم کے اتحاد، اتفاق اور بھائی چارہ کا سخت دُشمن قرار دیا ہے۔ اس کہانی میں بٹوارہ کا اثر شروع سے آخر تک ہی رہتا ہے۔ اس نقطہ نظر کو آنند لہر نے اس کہانی میں رواں دواں رکھا ہے۔ اگر چہ زیر تبصرہ کہانی میں پریم چند کی کہانیوں کی ہیئت نہیں ملتی لیکن کہانی پن کا عنصر ضرور غالب ہے۔

دادی اماں: ''دادی اماں'' آنند لہر کے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کا دوسرا افسانہ ہے۔ ''دادی اماں'' ایک ایسی کہانی ہے جو قاری کے دِل کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اصل میں ''دادی اماں'' ایک غریب گھرانے کی زندگی کو بیان کرتی ہے۔ اس کنبہ کے لوگ کس طرح سے زندگی کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ''دادی اماں'' کے دو پوتے ہوتے ہیں۔ ایک کا نام راجہ اور دوسرا گوپی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کا سہارا اُن کی دادی اماں ہے۔ اس غریب گھرانے کے دونوں لڑکے بہت ہی پریشان زندگی گذارتے ہیں۔ چونکہ اُن کی زندگی کا ہر نیا دِن ایک نئی پریشانی کو دعوت دیتا ہے۔ اُن کو پہلے اپنی ماں کی ممتا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور پھر اُن کا باپ دوسری شادی کر کے اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ راجہ اور گوپی دونوں ''دادی اماں'' کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے گئے۔ دادی اماں نے اُن کی پرورش بڑے لاڈ و پیار سے کی۔ اور خود باہر سوتی ہے تا کہ کوئی اندر نہ آسکے۔ ان دونوں لڑکوں کا سب سے کچھ دادی اماں تھی۔ اور یہ دونوں پوتے دادی اماں کے لیے سب سے بڑھ کر تھے۔ راجہ جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بدیش جاتا ہے تو اُس کے پاس اپنے دادا کی دولت ہے لیکن دادا نے وصیت نامہ میں لکھا ہے کہ جب تک

اُن کی دادی زندہ ہے تب تک وہی اُس کی وراثت اور حقدار ہے۔ پھر اس کے بعد انھیں یہ خیال بھی آتا ہے کہ ان کی ترقی میں دادی ماں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔ اب وہ کوئی ایسا منصوبہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس سے ان کی دادا اماں مرجائے لیکن ساتھ ہی انھیں دادی اماں کی ہمدردیاں یاد آتی ہیں۔ آخر وہ سوجاتے ہیں ۔صبح جب بستر سے اُٹھتے ہیں تو دادی اماں کا تحریر کردہ نوٹ بھی ملتا ہے۔ بقول آنند لہر۔

> ''صبح ہوئی ۔اچانک جاگ گئے ۔ دادی اماں کوانھوں نے وہاں نہ دیکھا۔گھبرائے ہوئے چارپائی کے نزدیک گئے ۔انھوں نے دیکھا وہ مری پڑی ہے۔ جیسے صدیوں سے سو رہی ہو۔ پھر نیچے ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔
>
> ''پیارے بچو''
>
> ''کپڑے کچھ دیر کے لیے دھو چکی ہوں۔ سویٹر دوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں ۔ راجہ تمہیں کہہ دوں کے بدیش جا کر اپنی صحت کا خیال رکھنا اور کھانا بنا پڑا ہے۔ جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھالینا۔ بھوکے نہ رہنا'' [۱]

مذکورہ بالا اقتباس کہانی کا آخری اقتباس ہے۔ جو بے حد متاثر کن ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ عورت کے دِل کے اندر ممتا بے پناہ ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو۔ یہاں تو صرف دادی اماں کے روپ میں دکھانے کی کوشش کی گئی ۔ایک طرف پوتے اس کو مارنے کے منصوبے سوچتے سوجاتے ہیں اور دوسری طرف دادی اماں اپنے آپ کو مار کر بھی اُن کی خیر خواہی کی طلبگار ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ایک خصوبصورت کہانی ہے۔ ایک طرف غربت کی جھلک ۔موجودہ ذہن کی جھلک اور دوسری طرف عورت کی دردمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ کہانی اعلیٰ درجے کی کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ کہانی کی ہیرو دادی اماں ہے۔ اور اس کے دونوں پوتوں کے اردگرد گھومتی ہے۔ کرداروں کے علاوہ اس میں خوبصورت مکالموں

۱۔ آنند لہر۔کورٹ مارشل۔ص۔25

کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

زبان وبیان کے اعتبار سے بھی یہ کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کہانی میں صاف وسادہ زبان کا استعمال ہوا ہے۔

سمندر کا پانی: ''سمندر کا پانی'' افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' میں شامل ایک ایسا افسانہ ہے جس میں دو دوستوں گھنشام اور رام لعل کی خوبیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ دونوں اچھے ساتھی ہیں۔ دونوں کے پیدا ہونے میں صرف چند گھڑیوں کا فرق تھا۔ دونوں کھیل کود میں بھی برابر کے حصہ لیتے تھے۔ بچپن میں جب دونوں گاؤں میں رام لیلا کا کھیل کھیلتے تھے۔ ایک رام کا کردار ادا کرتا تھا تو دوسرا لکشمن کا۔ لیکن ان دونوں کے دِل میں جو خیال تھے اُن میں تضاد تھا۔ گھنیشام ایک بہت بڑا ایکٹر بننا چاہتا تھا اور رام لعل ایک سماج سیوک بننا چاہتا تھا۔ اس افسانے میں ایک ضمنی قِصہ بستنی اور گوگل کے عشق پر مبنی ہے۔ کہانی کے پس منظر میں کہانی کار نے سماج میں اس حقیقت کا پردہ فاش کیا ہے کہ لوگ کس طرح سے ایک جوان لڑکی کی محبت کو قربان کرتے ہوئے اُس کی شادی کسی دوسرے آدمی سے زبردستی طے کر دیتے ہیں اور پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سچی محبت کرنے والے خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بستنی جب خودکشی کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو اُس کی زبردستی شادی نامدیو سے رچائی جاتی ہے لیکن نامدیو یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ بستنی خوبصورت تو ہے لیکن منحوس ہے۔ اس طرح رام لال بستنی سے شادی کر لیتا ہے اور پھر گھنیشام بھی ایک ڈراما کمپنی کے ذریعے سے ایک بہت بڑا ایکٹر بن جاتا ہے۔ ادھر رام لعل گاؤں میں طرح طرح کے ترقیاتی کام کرتا ہے۔ رام لال گاؤں والوں کو پسندیدہ بلکہ انسانوں کے روپ میں بھگوان تصور کیا جانے لا۔ ایک دن گھنیشام نے گاؤں میں آنے کا اعلان کیا اور پھر رام لعل اس کے استقبال کے لیے دو تین کلومیٹر کی دوری پر گیا مگر بدقسمتی سے رام لعل گھنیشام کی کار سے ٹکرا جاتا ہے۔ دونوں زخمی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر رام لعل کو گاؤں والے اُٹھا لیتے ہیں۔ اُس کا علاج معالجہ کرواتے ہیں۔ اور ادھر دوسری طرف گھنیشام کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اُسے شہر میں لے جایا گیا لیکن وہاں وہ اکیلا ہی بستر پر پڑا رہا۔ اور اس کی بیوی سوچتی ہے کہ اُس کی دوسری بیوی دیکھ بھال کر رہی ہوگی۔

---

[1] ترنم ریاض۔ ابابلیں لوٹ آئیں گی، نرالی دُنیا پبلی کیشنز دہلی۔ ص۔ ۱۸

اور دوسری سوچتی ہے کہ تیسری اور بچے سوچتے ہیں کہ پاپا پیسے والے ہیں۔ خود اپنا علاج کروائیں گے۔

اس طرح سے یہ کہانی اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں کہ انسان کو اپنی ہی سطح کے لوگوں میں اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اُسے اپنی ہی سطح کے لوگوں میں عزت و احترام اور ہمدردی عطا ہوتی ہے۔ رام لعل چونکہ گاؤں کے کام کرتا تھا اس لیے اُن کی ہمدردی بھی رام لعل کے لیے زیادہ تھی۔ دوسری طرف گھنیشام بڑی سوسائٹی کا آدمی ہے۔ اُسے اُسی سوسائٹی میں اہمیت ملے گی لیکن یہاں پر آنند لہر نے بڑی سوسائٹی کے ہاں انسانیت کا زوال دکھایا ہے۔ کہ بڑے لوگوں کے لیے ایک دوسرے کے دُکھ درد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس قسم کا بڑا ہونا بھی عذاب سے کم نہیں ہے۔ اس بات کو زیادہ تر متاثر کن اس کہانی کے آخری جملے بناتے ہیں مثلاً۔

''اور گھنیشام اکیلا بستر پر پڑا، گھنیشام نے نوکر سے کہا ''پانی لاؤ''۔''

صاحب ابھی نکلا نہیں آیا ہے''[1]

گھنیشام نے محسوس کیا کہ سمندر کا پانی اُس کے قریب ہونے کے باوجود اُس کے کام کا نہیں ہے۔

اس افسانے میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان کی عظمت و عزت محض سرمایہ داری پر ہی منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اچھے اعمال کی بدولت ہی اُسے سب سے زیادہ عزت و عظمت عطا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کہانی کے ہر کردار کی نفسیات کو آنند لہر نے اچھی طرح سے اُبھارا ہے۔

موسم بدلتے رہتے ہیں: ''موسم بدلتے رہتے ہیں'' ۔آنند لہر کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ حِنا نام کی ایک لڑکی جو پھول اُگانے کا کام کرتی ہے اور گلّو نام کے شخص جو مٹی کے برتن بنانے کا کام کرتا ہے کی عشقیہ داستان کا المیہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حِنا کے بھائی، سادھو اور گلّو کی بہن نیما کی عشقیہ کہانی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ حِنا اور گلّو کا پیار اِتنا صاف اور شفاف ہے کہ حِنا جب پھولوں کو پانی دیتی ہے تو وہ گلّو کمہار کے برتنوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اِدھر گلّو جب برتن بناتا ہے، پر خود بخود ہی پھولوں کے نقش و نگار بن جاتے ہیں۔ اصل میں یہ احساس محبت کو ظاہر کرنے کا بہترین طریقہ آنند لہر نے اپنایا ہے۔ لیکن یہ کہانی اصل میں اس

---

[1] آنند لہر۔ بٹوارہ۔ 2009ء۔ ص۔ 29

حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ آج کے اِس دور میں غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور امیر امیر تر۔ یہ کہانی ایک طرف عورت کی ٹریجڈی ہے۔ دوسری طرف اس میں غربت کا المیہ بھی ہے۔ ادھر اس کہانی کے آخر میں حِنا اور اسکے بھائی سادھو کو رانی اور اس کا بیٹا لے جاتا ہے۔ اُدھر گلو اور اُس کی بہن اُن کے انتظار میں غم پی کر زندگی گذارتے ہیں۔ اسطرح سے یہ کہانی انسان کو اشک بار کر دیتی ہے۔ چونکہ اس میں غریبوں کو امیروں کے مظالم کا شکار ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو اقتباس

''شہر کے راجہ کے دربار میں اُس بازار کا چرچہ ہوا۔ رانیوں کو معلوم ہوا۔ ایک دِن ایک رانی آئی اور اپنی بانہوں پر چوڑیاں چڑھانے کے لیے بنجارے کو ساتھ لے گئے۔ سادھو چلا گیا۔ کہاں گیا آج تک معلوم نہ ہے۔ کب آئے گا معلوم نہ ہے۔ مگر نیما آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اُدھر دوسری رانی کے بیٹے کو پھول پسند ہیں وہ حنا کو لے گیا اور کہنے لگا کہ اپنی کیاری سجائے گا۔ اس کے بعد آج تک حنا کا کوئی پتہ نہ ہے''۔

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کہانی اعلیٰ درجے کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں لہرؔ نے عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت جملے اس کہانی کی رونق ہیں۔

پھیکے آم: یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس میں آنند لہرؔ نے اس وقت کے سماج کو علامتوں اور اشاروں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں نند اور سریتا کی محبت کی کہانی ہے۔ اور اس کہانی میں آخر پر سُریتا کی محبت کی کہانی ہے اور اس کہانی میں آخر پر سریتا کے ساتھ ٹریجڈی ہوتی ہے۔ نند اس کہانی کا ہیرو ہے۔ اور سریتا ہیروئن اور گملا سنگھ اس کہانی کا ولن ہے۔ لیکن نند ہندی فلموں کے ہیروئنوں کی طرح سریتا کو نہیں بچا سکتا۔ ہوتا یوں ہے کہ نند کو پتہ ہے کہ س کی محبوبہ سریتا کو آم پسند ہیں۔ اس لیے وہ اپنے آنگن میں آم کے درختوں کا باغ لگاتا ہے۔ جب آم کے درخت پر پھل کھانے کے قابل ہو جاتے ہیں تو اُس وقت یہ بلغ گملا سنگھ کو فروخت ہو جاتا ہے۔ اور نند پھر گملا سنگھ کا ملازم بن جاتا ہے۔ ایک دن نند سریتا کو آم پیش کرتا ہے لیکن اسی وقت موقعے پر گملا سنگھ آ جاتا ہے۔ گملا سنگھ بہت سارے آم نچوڑ کر پھینک دیتا ہے اور پھر سُریتا کو بھی

۱؎ شوکت حیات، شکنجہ، افسانوی مجموعہ، گنبد کے کبوتر، ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۰ء۔ ص۔ ۲۸

۲؎ ۲۔ایضاً۔ ص۔ ۳۱

آموں کی طرح نچوڑ کر چھوڑ دیتا ہے۔ سُریتا مر جاتی ہے جو کہ آج کے اس ترقی یافتہ سماج کا المیہ ہے جس میں عورت کے حقوق و رغربا کے حقوق کے بارے میں زبانی بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورت اور غربا مصائب کے شکار ہو رہے ہیں۔ اس کہانی میں یہ حقیقت بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ امیر لوگ کس طرح غریبوں کی خواہشوں کو کچلتے ہیں اور کس طرح نازک سی چیز کو اپنی سخت خواہشوں سے ختم کر دیتے ہیں۔ اور یہی بات ہے کہ آج کے اس سماج میں جینے کا وہ مزہ نہ رہا ہے اور نہ ہی چیزوں میں وہ تاثیر اور دلکشی۔ خوبصورتی ہے۔ غرض یہ کہ اس دور میں گناہ اتنے ہو رہے ہیں کہ ہر چیز پر اس کا اثر ہو رہا ہے۔ بقول آنند لہر۔

> ''اس کے بعد سے لے کر آج تک اس بستی کے آم پھیکے ہیں۔ گویا کہ رہنے والوں کو اس کا کوئی احساس نہیں ہے کیونکہ اُن کے ذائقے ہی پھیکے ہو گئے ہیں''۔ [1]

ساتھ کے گاؤں والے ایسا ہی کہتے ہیں۔

دوسری بے انصافی:

افسانہ ''دوسری بے انصافی'' کا موضوع بھی کافی دلچسپ ہے۔ کہانی کا خلاصہ یوں ہے کہ اجیت سنگھ گاڑی سے اُترتا ہے اور غصے میں آ کر وہ ایک آدمی کو مکّہ مارتا ہے۔ جو بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر اس دُنیا سے رحلت پا جاتا ہے۔ پھر اجیت سنگھ کو بعد میں اپنے کیے پر کافی افسوس ہوتا ہے۔ امیر ہونے کے ناطے وہ عدالت سے بری ہو جاتا ہے۔ بعد میں اجیت سنگھ اس آدمی کے گھر والوں کو دو ہزار روپے ماہانہ ارسال کرتا ہے ۔جس سے ان کی زندگی کا گذارہ چلتا ہے لیکن اس واقع کے پندرہ سال بعد جب اجیت سنگھ کا ایک دوست اجیت سنگھ کی فائل دوبارہ کھولتا ہے تو اجیت سنگھ کو قید کی سزا سنائی جاتی ہے لیکن اس شخص کی بیوی جس کو اجیت سنگھ نے مارا تھا وہ کہتی ہے کہ پہلے ہمارے ساتھ ایک بے انصافی ہوئی تھی اور اب دوسری بے انصافی۔

کہانی کا آغاز نہایت ہی متاثر کن ہے۔ کہانی کے آغاز میں ہمارے سماج کے امراء پر طنز کیا گیا ہے۔

---

[1] آنند لہر۔ بٹوارہ۔ 2009ء۔ ص۔ 40

وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جن کے پاس دولت ہے۔اُن کے سامنے انسان کی قیمت ایک چیونٹی سے بڑھ کر نہیں ہے۔

پلاٹ کے حوالے سے اگر اس کہانی کو دیکھا جائے تو اس کا پلاٹ نہایت ہی عمدہ ہے۔اور کہانی کی روانی میں کہیں پر بھی جھول نظر نہیں آتا ہے۔کہانی منطقی طور پر اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے یہ کہانی اپنی مثال آپ ہے۔اس میں کردار امیر و غریب سب ہی قسم کے لوگ ہیں۔مثلاً اجیت سنگھ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے علاوہ کرداروں کی نفسیات پر آنند لہر کو قدرت حاصل ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھیے۔

"گرداری کا بیٹا تیز رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔تو ساتھ والے دوست نے کہا۔یہ کیا کر رہے ہو؟ اس پر اس نے کہا کوئی بات نہیں پتا جی ایس۔پی ہیں"۔[1]

اِن مذکورہ بالا جملوں سے آنند لہر نے امیر لوگوں کی سوچ کی اچھی عکاسی کی ہے کہ امیر لوگ اپنے آپ کو ہی جینے کا حق دار سمجھتے ہیں۔اس کے بعد آنند لہر نے قانونی نظام پر طنز بھی کیا ہے۔چونکہ اجیت سنگھ کو جب سزا ہونی چاہیئے تھی تب وہ بری ہو جاتا ہے اور جب اُسے بری کرنا چاہیئے تھا تب اسے سزا دی جاتی ہے۔اصل بات یہ ہے کہ عدالت اپنے فیصلے سناتی ہے اور وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتی ہے کہ مرنے والے کے گھر والوں اور قربت داروں کا کیا ہوگا۔قانون صرف اپنا کام کرتا ہے اور عام لوگ اس قانون کے شکنجے میں جکڑ جاتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔افسانے کے آخری جملے۔

''پرم جیت سنگھ کی بیوی نے کہا''جب اجیت سنگھ بری ہوا تھا'' اس وقت ہمارے ساتھ پہلی بے انصافی ہوئی تھی۔آج اسے سزا ہوئی ہے تو یہ ہمارے ساتھ دوسری بے انصافی ہے۔''۔[2]

کہانی کے آخری جملے پر ہی کہانی کار نے کہانی کا نام منتخب کر دیا ہے۔زبان و بیان کے اعتبار سے یہ

۱۔آنند لہر۔بٹوارہ۔2009ء۔ص۔47

۲۔آنند لہر۔بٹوارہ۔2009ء۔ص۔50

ایک عمدہ کہانی ہے۔اس کہانی میں عام طور پر عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

سنہری مچھلی: افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' میں شامل ''سنہری مچھلی'' ایک بہترین کہانی ہے۔اگر چہ یہ کہا جائے کہ یہ کہانی حقیقت پر مبنی ہے۔تو غلط نہ ہوگا۔اس افسانے میں آنند لہر نے سرحد کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے۔سرحدیں قائم ہونے سے انسانی زندگی بے شمار مشکلات کا شکار ہوتی ہے۔جس کا ثبوت اس افسانے کے علاوہ اور بھی بہت سارے افسانے ہیں۔اس کہانی کا ہیرو کام دیونام کا ایک مچھیرا ہوتا ہے۔جو سمندر سے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سرحد کے پار چلا جاتا ہے اور وہاں کے فوجی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔اور اس سے پوچھ تاچھ کرتے ہیں تو کام دیونام انھیں جواب دیتا ہے کہ میری مچھلی یہاں پر آگئی ہے۔اس لیے میں یہاں پر آیا ہوں۔مجھے معلوم نہیں ہے کہ سمندر کی بھی کوئی سرحد ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو اس کہانی کا یہ اقتباس۔

''مگر تم نے سرحد پار کی ہے۔جو جرم ہے'' مچھلیوں کی سرحد نہ ہے اور نہ ہی مجھے معلوم ہے۔کہ پانی میں سرحد کیا ہوتی ہے۔مجھے وہی معلوم ہے جو سمندر میں مچھلی کو معلوم ہے''۔

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرحد انسان نے خود بنائی ہے۔اور یہ بناوٹی سرحد ہے۔ اس کا اطلاق صرف انسانوں پر ہی ہو سکتا ہے۔اور خاص کر عام اور غریب لوگوں پر،ورنہ سرحد کے حفاظتی دستے بھی ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔اس طرح سے اس میں آنند لہر نے فوج پر طنز کیا ہے۔جو جھوتی قسم کھاتے ہیں کہ ہم جیں گے بھی اور مریں گے بھی۔اپنے ملک کے لیے اور اپنے ہم وطنوں کے لیے۔ملاحظہ ہو یہ اقتباس۔

فوجی کرنل چھیرے سے پوچھتا ہے۔

''گھر میں کون ہے''

''صاحب بیوی ہے''

''کیسی ہے؟''

جناب جیسی بھی ہے۔سرحد کے اس پار ہے۔

اور کیا معلوم ہے میرے یہاں ہوتے ہی اُس کا کوئی بلاتکار کر دیئے''۔

''مگر وہ تو تمہارے ملک کی فوج ہے''

صاحب کیا آپ کے ملک کے فوجی یہاں کی عورتوں کے ساتھ بلاتکار نہیں

کرتے؟ اس پر کرنل پریشان ہوگیا''۔[1]

اس کہانی میں غریب عوام اور فوج کے ظلم وستم کا پردہ فاش کیا گیا۔ غریب عوام پر فوج طرح طرح کے ظلم ڈھاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ غریب عوام کافی پریشان رہتی ہے۔ کہانی میں جب مچھیرا راہو جاتا ہے اور سنہری مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ گو اس وقت اس کے گھر میں خوشیاں طول پر ہوتی ہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے یہ تمام خوشیاں کافور کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ بقول آنند لہر۔

''رپورٹ آئی ہے کہ یہ مچھلی اُدھر کی ہے۔ ہمیں واپس کرنی ہے''۔

''نہیں صاحب یہ مچھلی اِدھر کی ہے''۔ ''وہ کرنل صاحب جھوٹ نہیں بولتے''۔

''صاحب آپ ہماری طرف کے کرنل ہیں''۔

کرنل نے مچھلی لے لی اور اپنی بیرک میں چلا گیا۔

اُدھر کے کرنل نے کہا۔ سنہری مچھلی کرنل کے پاس ہی رہے گی چاہے وہ اِدھر کا کرنل ہو یا اُدھر کا''۔

اس کہانی میں استعمال کی گئی زبان صاف سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کہانی کار نے چابکدستی کیساتھ کیا ہے۔

تھوڑی سی غلطی:

کہانی ''تھوڑی سی غلطی'' سادہ بیانیہ میں فلسفیانہ رنگ رکھتی ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان کھائی کا بیان افسانہ نگار نے بڑی ایمانداری سے کیا ہے۔ یہ کہانی بھی ہمارے سماج سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کہانی میں آنند لہر نے یہ بات بیان کی ہے کہ ہمارے سماج کے امراء، غرباء کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ پورن اور چونی۔ ایک دوسرے کو کہانی سناتے ہیں۔ لیکن چونی اسے کہتا ہے کہ آج بھی سننا چاہتا ہوں۔ اس طرح سے پورن

---

[1] آنند لہر۔ بٹوارہ۔ 2009ء۔ ص۔ 54

کی زبانی آنند لہر نے ہمارے سماج پر طنز بھی کیا ہے کہ اس وقت کا سماج کس طرح سے بگڑ چکا ہے کہ یہاں بڑے لوگ اگر کتنا بھی بڑا گناہ کر دیں لیکن وہ اس کی معمولی سے غلطی سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔اس لیے 25ہزار روپے دے دوں گا۔میری اسی قسم کی کہانی میں ایک غریب لڑکا ایک امیر لڑکی سے محبت کرتا ہے۔اور پھر ایک دن وہ اپنی اُس پرانی سائیکل پر جا رہا ہوتا ہے ار اُس کے دل کی رانی ترنم اپنی گاڑی میں سوار ہو کر آ رہی ہوتی ہے۔تو راجہ کی سائیکل ترنم کی کار سے ٹکراتی ہے اور راجہ مر جاتا ہے اور پھر ترنم کا باپ کہتا ہے۔

''ترنم کے باپ نے صرف اتنا ہی کہا کہ تھوڑی سی غلطی اس کی بیٹی کی بھی ہے'' ۔[۱]

لیکن ترنم کا باپ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اس تھوڑی سی غلطی نے ایک گھر کا بہت بڑا خزانہ درم بھرم کر دیا۔اس کہانی میں کہانی کار نے ایک طرف امیروں کے رویہ پر روشنی ڈالی ہے تو دوسری طرف غربت میں مبتلا لوگوں کا بھی بہترین خاکہ پیش کیا ہے۔اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھئے۔

> ''جیسے غریب کے گھر میں کبھی اچھی دال نہیں بن سکتی ۔اس طریقے سے راجہ کبھی سیدھی سائیکل نہ چلا سکتا۔غریب کی دل میں کبھی مرچ کم ہو جاتی ہے تو کبھی نمک زیادہ ہو جاتا ہے۔جس دن ہلدی خرید کر لاتا ہے۔اسی دن تیل ختم ہوا ہوتا ہے۔کبھی نمک کی کمی پوری کرنے کے لیے مرچ زیادہ ڈالتا ہے اور کبھی ہلدی کی کمی پوری کرنے کے لیے مسالہ زیادہ ڈالتا ہے کیونکہ بیس روپوں میں سارا سامان خریدنا ہوتا ہے۔کبھی دوکان دار چیزیں کم یا زیادہ دیتا ہے یا وہ بھی کم یا زیادہ خرید لیتا ہے۔راجہ کی سائیکل بھی غریب کی دال کی طرح چلتی تھی ۔کبھی پیڈل چلانے کی کوشش کرتا تو کبھی پہیہ اپنی رفتار کم کر دیتا کبھی بریک لگاؤ تو سائیکل اور تیسرہ ہو جاتی ۔کبھی پہیے چلتے تو پیڈل رُک جاتا۔کبھی اُس کے اُلٹ ہو جاتا'' ۔[۲]

۱۔بٹوارہ۔ص۔63

۲۔آنند لہر۔بٹوارہ۔ص۔62

مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ آنند لہر کا مشاہدہ بہت ہی وسیع اور گہرا ہے۔ یہ کہانی ایک المیہ پر ختم ہوتی ہے۔اس کہانی میں فکروفن کی چاشنی بھی ملتی ہے اورزبان وبیان کے حساب سے بھی یہ ایک بہترین کہانی ہے۔

حساب جیومیٹری:

''حساب جیومیٹری'' افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' میں شامل ایک عشقیہ کہانی ہے۔ یہ ایک نئے انداز کا افسانہ ہے۔اس افسانے میں آنند لہر نے موجودہ دور کے عاشقوں کے عشق کا حال بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ اپنا سب کچھ اپنے معشوق کی خاطر لوٹا دیتے ہیں لیکن اُن کے معشوق کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ۔اس کہانی میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ ایک غریب آدمی جب زمانے کے رفتار کے ساتھ اپنی رفتار ملانے میں ناکام ہوتا ہے۔تو پھر اُس کا ساتھ سب لوگ چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اپنا معشوق بھی۔جس کے لیے عاشق اپنی تمام خواہشوں کو قربان کرتا ہے۔اس مسئلے کو آنند لہر نے اس افسانے میں موثر انداز میں بیان کیا ہے۔کرشن اور نیرو بچپن سے ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے ۔وہ دونوں پھر ایک ہی اسکول میں داخل ہو گئے ۔صبح تیار ہو کر جاتے۔کرشن کو بند گوبھی پسند تھی اس لیے نیرو اپنے کھانے میں بند گوبھی لاتی۔اور نیرو کو پھول گوبھی اس لیے کرشن اپنے کھانے میں پھول گوبھی ضرور شامل کرتا۔اور نیرو کو کھلاتا۔

یہ سلسلہ درسلسلہ قائم رہا۔ وقت آگے بڑھتا گیا۔ کرشن حساب اور تاریخ میں مہارت رکھتا تھا۔ اور نیرو جیومیٹری اور جغرافیہ میں ۔اس طرح سے ان دونوں کا پیار اُن کو پڑھائی کے میدان میں ترقی دیتا ہے۔ کرشن نیرو کی خاطر حساب اور تاریخ کے سوالات غلط کرتا ہے تاکہ نیرو فسٹ آئے ۔بارہویں جماعت پاس کرنے کے بعد نیرو کو شہر میں ڈاکٹری کی سیٹ مل جاتی ہے اور کرشن غربت کی وجہ سے اپنی پڑھائی کو خیر باد کہتا ہے۔ وہ اپنی لیلا کی یاد میں صحرا صحرا اور گلی گلی گھومتا ہے ۔اِدھر نیرو کو بچپن کا پیار بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اوراس کے دِل میں کرشن کے لیے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی کرشن نیرو کا ہی مجنوں بنا رہتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے تاکہ وہ بیمار ہو جائے ۔انتظار کرتا ہے کہ نیرو جب ڈاکٹر بن کر آئے گی تو پھر حساب اور جیومیٹری کا ملن ڈاکٹر اور مریض کے روپ میں پروان چڑھے گا۔لیکن بیماری کی

حالت میں اسے ہسپتال لیا جاتا ہے وہ بہت ہی خوش ہوتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے تمام ارمان ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اسے کہا جاتا ہے کہ نیرو ہڈیوں کی ڈاکٹر ہے اور کرشن کو پیٹ کی بیماری ہے۔

اس کہانی میں آنند لہر نے وہی روایتی موضوع نئے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں لہر نے اس مادہ پرستی دور کی بھی ہلکی پھلکی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کہانی سے ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے کہ اس دور میں انسانی (اقتدار) کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ مادہ پرستی کی زیادہ قدر و قیمت ہے۔

کردار نگاری اور کہانی پن کے حوالے سے یہ بہترین کہانی ہے۔ اور کہانی کے ختم ہوتے ہی یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا اس کے بعد کرشن کی ملاقات نیرو سے ہوئی یا نہیں۔ یہی تو ایک کہانی کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کریں۔ الغرض یہ کہانی فنی و تکنیکی اعتبار سے ایک بہترین افسانہ ہے۔ اگرچہ واقعہ صرف ہسپتال کا ہے مگر اس واقعہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بہت سارے میدان طے کیے گئے ہیں جو آنند لہر کا اپنا انداز ہے۔ اور یہی انداز ان کی کہانیوں کو انفرادی مقام دلاتا ہے۔

سفید داغ:

افسانہ ''سفید داغ'' میں دو پریمیوں کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں نظر و فکر کے تلاطم کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح آج کے دور کا نوجوان مثبت فکر و سوچ سے محروم ہو کر دُنیا کی رنگ رلیوں میں گھل مل کر اپنی بصیرت کی آنکھ کو اندھا کر چکا ہے۔ اس کا ذہن کس طرح ظاہری پرستی کا شکار ہے۔ یہ سب باتیں اس کہانی میں بیان کی گئی ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ شیلا اور راجہ شادی کے بندھن میں جب باندھ دیئے جاتے ہیں پھر سہاگ رات کی تیاری میں راجہ بڑا خوش ہوتا ہے لیکن جب وہ شیلا کے بستر پر جاتا ہے تو اس کے جسم پر ایک سفید داغ نظر آتا ہے۔ اس کی تمام خواہش غم میں بدل جاتی ہے وہ پریشان ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ اس کام کے لیے آخر میں طلاق دینے کا مقدمہ لڑتا ہے۔ ایک تاریخ کے سلسلے میں وہ عدالت میں جاتا ہے تو اسے عدالت کے آس پاس ایک آدمی ایک عورت کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ اس عورت کا جسم پورا پھلوڑی سے بھرا ہوتا ہے تو راجہ اس آدمی سے کہتا ہے کہ تم نے اپنی زندگی اس عورت کے ساتھ کیسے گذاری تو وہ کہتا ہے کہ جب اس نے میرے جسم کی آگ بجھائی۔ اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیا۔ تو پھر مجھے اس کا داغ نظر نہیں آیا۔ بلکہ مجھے اس کا خوبصورت جسم ہی

نظر آیا۔ یہ تمام باتیں سن کر راجہ بھی طلاق کے کاغذات پھاڑ ڈالتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُس نے صرف ایک داغ کی طرف ہی دیکھا۔ اُس کی باقی خوبیوں کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس افسانے میں متحرک کردار نظر آتے ہیں ۔ راجہ کا ذہن پہلے کچھ سوچتا ہے اور بعد میں کچھ اور فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو دوبارہ اپناتا ہے۔ اس طرح سے یہ کہانی ایک طرف موجودہ دور کی نوجوان نسل کی اچھی تصویر پیش کرتی ہے جو ظاہر پرستی کے شکار ہو چکے ہیں۔ اُن کے لیے کسی مسیحی کی ضرورت ہے۔ جس طرح راجہ کو ایک شخص کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے ظاہر پرستی کا غلاف اُٹھایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس بات کا بھی انکشاف کروایا ہے کہ عورت کس طرح سے مرد کے لیے اپنا سب کچھ وقف کرتی ہے لیکن مرد اُسے وہ سب کچھ نہیں دے پاتا جس کی وہ حقدار ہوتی ہے۔

یہ سرحدیں: اس کہانی میں آنندلہر نے اِس بات کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ سرحدیں انسانی اقدار کی دُشمن ہیں۔ چونکہ سرحدیں انسانی اقدار کو پامال کرتی ہیں ۔ اس افسانے میں ''وہ'' ایک کردار ہے جو وطن کی حفاظت اور رومانیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ ایک دِن اس کو فوج میں بھرتی کر دیا جاتا ہے۔ لگ بھگ ایک سال کی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اسے باقاعدگی سے فوج میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اس کی ڈیوٹی سرحد پر لگائی جاتی ہے۔ سرحد کی دوسری طرف ایک عورت کو بلاتکاریوں سے شکنجے سے بچانے کے لیے وہ سرحد پار کر جاتا ہے۔ سرحد کے پار کے فوجی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ اب اپنے ملک کے لوگ بھی اُسے جاسوس کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس کہانی میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ایک شریف اور ایماندار آدمی کا اِس دور میں جینا حرام ہے۔ خاص کر اُس آدمی کا جو ہر مذہب و ملت کو مانتا ہو۔ اور جس کا دِل صرف خدمت خلق کے جذبے سے معمور ہو۔ کہانی میں عورت کے استحصال کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ عورت کی عظمت سرحد کی عظمت سے زیادہ ہے اور عورت کی حفاظت کرنا سرحد کی حفاظت سے بڑھ کر ہے۔ مذہب کا ماننا ہے کہ عورت عظیم ہے اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس لیے جب وہ (فوجی) سرحد پار عورت کی عزت بچاتے ہوئے پکڑا جاتا ہے تو برجستہ اس کے منہ سے

---

[1] عصمت چغتائی۔ چوتھی کو جوڑا۔ مشمولہ۔ نمائندہ مختصر افسانے۔ مرتبہ محمد طاہر فاروقی، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔ ۲۰۰۱ء ص۔ ۱۲۰۔ ۱۱۹

یہ الفاظ نکلتے ہیں۔

''حضور عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور سرحد کی حفاظت کرنا انسان کا حکم۔۔۔؟۔

''جنگ انسانوں کے خلاف نہیں۔ سرحدوں کے خلاف ہونی چاہیئے
اور لڑی ملکوں کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ عورت کی عزت بچانے کے لیے
ہونی چاہیئے'' ۔[1]

انصاف: یہ طنزیہ کہانی ہے۔اصل میں اس افسانے میں انصاف پر ہی طنز کیا گیا ہے اور خاص کر ہمارا قانونی نظام جس طرح کے انصاف سے لوگوں کو نوازتا ہے۔اس کا صحیح طور پر عکس پیش کیا گیا ہے۔اس کہانی میں بھی ایک عورت کا المیہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت اس وقت کس طرح سے ظلم وتشدد کی شکار ہے۔اس کے علاوہ میڈیا اور عدالتی نظام کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔کہانی میں رانی کے ساتھ پہلے زنا بالجبر کیا جاتا ہے۔ رانی کی جب شادی ہوجاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو بھول جاتی ہے۔کافی عرصہ گذر جانے کے بعد عدالت سے اسے تب انصاف ملتا ہے جب اس کے بلاتکار کرنے والے شخص کو سزا سنائی جاتی ہے۔مگر جونہی سسرال والوں کو رانی کے ماضی کا پتہ چلتا ہے تو سارے نفرت کرنے لگتے ہیں۔کہانی کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ وقت گذرنے کے بعد انصاف انصاف نہیں رہتا بلکہ مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔

دراصل یہ افسانہ موجودہ دور کے عدالتی نظام پر گہرا طنز ہے۔

دوسرا بٹوارہ: اس افسانے میں موجودہ دور کے سماج کو بہترین طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ سماج نے انسان کے بہت سارے رشتوں کو درہم برہم کردیا ہے۔اس افسانے میں ایک خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔اس خاندان کا ماضی نہایت ہی پرامن ہوتا ہے۔پورا خاندان امن وچین کی زندگی گذارتا ہے لیکن بعد میں جب گھر میں بہو آجاتی ہے تو اس گھر کا اور خاندان کا بٹوارہ ہوجاتا ہے۔ایک ہی دادا کے پوتے ایک دوسرے گھر میں جانا الگ بات ہے بلکہ ایک دوسرے کے آنگن میں بھی نہیں جاسکتے۔جبکہ ماضی میں اس

---

[1]۔آنند لہر۔بٹوارہ۔ص۔117

خاندان کا ایک بہت بڑا آنگن تھا اور بچے اکٹھے کرکٹ کھیلتے تھے لیکن اب وہ آنگن مٹ چکا ہے۔ ایک رسوئی کی کئی رسوئیاں بنیں۔ ایک باتھ روم کے کئی باتھ روم بنے۔ ایک بیٹھک کی کئی بیٹھکیں بن گئیں۔ اس گھر کا بزرگ اپنے ماضی کو ٹٹولتے ہوئے کہہ اُٹھتا ہے کہ کیا وہ دن لوٹیں گے۔ وہ کون سے دِن ہیں۔ وہ یہی مشترکہ کنبہ کے ماضی کے دن تھے۔ جب سارا خاندان خوشحال تھا۔ ہر چیز پر ایک دوسرے کا حق تھا۔ اور اب وہ متفرقہ خاندان میں ہر ایک چیز بٹ چکی ہے اور اب نہ ہی وہ زمانہ رہا اور نہ ہی زندگی گذارنے کا وہ مزا رہا۔ غرض یہ کہ اس افسانے میں مشترکہ خاندان کے فوائد اور نیوکلر خاندان کے نقائص بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے گھر کی ہر ایک چیز بٹ جاتی ہے بلکہ پیار و محبت کے رشتے بھی بٹ جاتے ہیں۔ اس طرح سے اس کہانی میں موجودہ سائنسی بلکہ انٹرنیٹ سماج کا خاکہ پیش کیا ہے جس نے اس ایک گھر کے کئی گھر بنائے۔ اس طرح کہانی آخر میں مصنف کے اِن الفاظ سے اختتام پذیر ہوتی ہے۔

''ملک بٹنے سے ایک بٹوارہ ہوا تھا اب گھر بٹنے سے ہم دوسرا بٹوارہ نہ کر سکتے تھے''۔ [1]

غرض یہ کہ اس کہانی میں آنند لہر نے فنی چابکدستی سے مشترکہ خاندان کے فوائد اور الگ الگ بٹے ہوئے خاندان کے منفی پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور یہ فکر قاری کے ذہن میں لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مشترکہ خاندان میں انسانی زندگی خوشحال اور پر امن گذر سکتی ہے۔

جج صاحب: جج صاحب میں اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جہاں بے ایمانی، رشوت خوری اور استحصال نہیں۔ اس افسانے کی کہانی بھی کچھ اس طرح سے ہے کہ تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں گانے اور ناچنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلے کا فیصلہ کرنے کے لیے مشہور سنگر نیرج کمار گپتا نامی ایک شخص کو جج رکھا جاتا ہے۔ تقریب منعقد کروانے والے گرداس مل نے اس دفعہ جج صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا تھا۔ جج کو کہانی میں شروع سے ہی ایک ایماندار شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن مقابلے کے اندر بھی بے ایمانی موجود ہے۔ بقول آنند لہر صاحب

---

[1] آنند لہر۔ بٹوارہ۔ ص۔ 91

کا ایک المیہ پیش کرتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس افسانے میں کشمیری پنڈتوں کے جموں میں آنے اور پھر یہاں پر ان کے رہن سہن میں آنے والی دشواریوں کو بھی فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر چہ کشمیری پنڈت سماجی لحاظ سے یہاں پر ٹھیک طرح سے ہیں لیکن اُن کے اندر کا پنڈت اب بھی کشمیر اور کشمیریت کا دُکھ لیے زندگی گذار رہا ہے۔ اور انھیں یہاں کوئی چین و امن دل کو نصیب نہیں ہے بلکہ وہ مجبوراً اب یہاں بس رہے ہیں۔

اس کے علاوہ اس کہانی میں جھیل ڈل کی منظر کشی بھی بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ الغرض یہ افسانہ فنی لحاظ سے بہترین افسانہ ہے۔ اس کے کردار بھی عام انسان ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ افسانہ حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔

افسانوی مجموعہ بٹوارہ کے چند افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد مختصراًیوں کہا جاسکتا ہے کہ مجموعہ بٹوارہ کی اکثر کہانیوں میں انسانی زندگی کی حقیقتوں اور تلخ سچائیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ بٹوارہ کی کہانیاں محض وقت گذاری کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ ہمارے اِردگرد کے حالات وواقعات کا مجموعہ ہے۔ جو خود کہانی کا موضوع بنتے ہیں۔ ''بٹوارہ'' کی تمام کہانیوں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی واصلاحی مقصد چھپا ہوا ہے ۔ ان کہانیوں کو اُردو ادب کی بہترین کہانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

''جج صاحب اور اندر چلے گئے نیرج جھک کر کھڑا ہو گیا، مگر جج صاحب
نے اسے صرف اتنا کہا۔ میری بیٹی کا خیال رکھنا''۔[1]

اس کہانی میں سیاست دانوں، محکمہ پولیس اور عدالت کے ججوں پر طنز کیا گیا ہے اور پھر اس کہانی میں جس طرح سے فنی خوبیوں کے ساتھ یہ تمام چیزیں بیان کی گئیں۔

بیراگن: یہ افسانہ بھی نہایت ہی دلچسپ ہے۔ اس میں گوتم پرشاد اور سریتا کی کہانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ پوری کہانی ان دو کرداروں کے اِرد گرد گھومتی ہے۔ گوتم پرشاد کہانی کا ہیرو ہے اور سریتا ہیروئن۔ کہانی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کے لیے بہت جفاکشی کرتی ہے تاکہ اُس کا ہر بیراگ بھول جائے۔ آخر کار وہ عورت بھی بیراگ کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح سے اس افسانے میں عورت کی جفاکشی، محبت، وفاداری اور جانثاری کو پیش کیا گیا ہے۔

کلفیاں: ''کلفیاں'' ایک گھرانے کی دُکھ بھری کہانی ہے۔ یہ غریب کنبہ چار افراد پر مشتمل ہے۔ دھنیا، دھنیا کی بیوی اور ان کے دو بیٹے۔ پوری کہانی دھنیا کے ارد گرد گھومتی ہے۔ دھنیا کلفیاں فروخت کر کے اپنے گھر کا گذارہ چلاتا ہے۔ ایک دِن کا قصہ ہے کہ دھنیا نے بھگوان کے آگے دُعا کی آج گرمی زیادہ ہوتا کہ اُس کی کلفیاں زیادہ فروخت ہوں۔ دُعا قبول ہو جاتی ہے لیکن جب وہ اپنی ریڑی کو لے کر روزانہ کی طرح جا رہا ہوتا ہے۔ راستے میں پولیس والے اُسے روک لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پردھان منتری کا دورہ ہے۔ اس لیے اس راستے کو بند کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دھنیا کی تمام کلفیاں پگھل جاتی ہیں۔ کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غریب آدمی کی مُراد کبھی پوری نہیں ہوتی۔ سماج کے بڑے ٹھیکیدار غریب کو اپنے چنگل میں ہمیشہ جکڑے رکھتے ہیں۔ غریب گھرانے کے تمام خواب ادھورے ہی رہ جاتے ہیں۔

ایک اور ہجرت: یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے کی کہانی کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کہانی کشمیری پنڈتوں کی ہجرت

---

[1] آنند لہر۔ بٹوارہ۔ ص۔ ۹۷

کا ایک المیہ پیش کرتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس افسانے میں کشمیری پنڈتوں کے جموں میں آنے اور پھر یہاں پر اِن کے رہن سہن میں آنے والی دشواریوں کو بھی فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر چہ کشمیری پنڈت سماجی لحاظ سے یہاں پر ٹھیک طرح سے ہیں لیکن اُن کے اندر کا پنڈت اب بھی کشمیر اور کشمیریت کا دُکھ لیے زندگی گذار رہا ہے۔ اور انھیں یہاں کوئی چین وامن دل کو نصیب نہیں ہے بلکہ وہ مجبوراً اب یہاں بس رہے ہیں۔

اس کے علاوہ اس کہانی میں جھیل ڈل کی منظر کشی بھی بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ الغرض یہ افسانہ فنی لحاظ سے بہترین افسانہ ہے۔ اس کے کردار بھی عام انسان ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ افسانہ حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔

افسانوی مجموعہ بٹوارہ کے چند افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ مجموعہ بٹوارہ کی اکثر کہانیوں میں انسانی زندگی کی حقیقتوں اور تلخ سچائیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ بٹوارہ کی کہانیاں محض وقت گذاری کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ ہمارے اِردگرد کے حالات وواقعات کا مجموعہ ہے۔ جو خود کہانی کا موضوع بنتے ہیں۔ ''بٹوارہ'' کی تمام کہانیوں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی واصلاحی مقصد چھپا ہوا ہے۔ ان کہانیوں کو اُردو ادب کی بہترین کہانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

باب سوم

آنند لہر کی ناول نگاری

سرحدوں کے بیچ، اگلی عیدسے پہلے ،مجھ سے کہا ہوتا، یہی سچ ہے کی روشنی میں

برصغیر میں اُردوناول کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس صنفِ ادب نے ترقی کے کئی منازل طے کیے۔قدیم شعری ادب اورنثری داستوں میں پریوں، دیووں، طلسماتی محلوں، تصوراتی رزم گاہوں اور مافوق الفطری معرکوں کارواج تھالیکن 1857ء کے انقلاب کے بعدسرسید کے اثرات سے لوگوں میں یہ احساس عام ہوتا گیا۔ کہ ترقی کاراز ذہنی قوت، تلاش وتحقیق اور طبعی علوم کی تحصیل میں پوشیدہ ہے ۔لہذاادیبوں نے تصوراتی وتخیلی دُنیاسے نکل کرحقیقی دُنیاکے موضوعات کواپنی تحریروں میں جگہ دی۔ نتیجہ یہ نکلاکہ ادب نے زندگی کے سماجی اثرات قبول کیے۔اس قبولیت کے اظہارکابیانیہ وسیلہ داستان، کہانی یاقصہ بنا۔ جوزماں ومکاں کے اثرات سے دوچارہوکرادب کی اس مشکل میں دُنیاکے سامنے آیا۔ جسے ناول کہاجاتاہے۔

اُردوکی جدیدنثری اصناف میں ناول ایک ترقی یافتہ صنف ہے۔ناول کی فنی تکمیل اگرچہ پریم چند کے ناولوں سے ہوتی ہے لیکن 19ویں صدی کی ساتویں دہائی سے اُردومیں ناول نگاری کاباقاعدہ آغازہوچکاتھا۔اس دورمیں نذیراحمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرراورمرزاہادی رسوا جیسے قدآورادیبوں نے اس میدان میں طبع آزمائی کی۔ان کے ناولوں کے نہ صرف انگریزی بلکہ دوسری زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔اسی تسلسل کے ناول نگاروں میں محمدعلی طبیب۔سجادحسین کمنڈی۔مرزاعباس حسین ہوش ،مرزامحمدسعید۔مہدی حسین تسکین اورسرفرازحسین عربی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔پریم چندنے اپنے عہد کے سماجی مسائل کوموضوع بنایااورحقیقت پسندفکشن نگارکی حیثیت سے اپنی ایک الگ پہچان بنوائی۔

پریم چندکے بعدترقی پسندناول نگاروں نے جن میں کرشن چندر، راجندرسنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ کے نام خاص طورسے اہمیت کے حامل ہیں نے اُردوناول کے میدان کووسیع ترکیا۔ان تمام ناول نگاروں نے اپنے ناول میں خیالی دُنیاکے بجائے حقیقی دُنیاکی ترجمانی کی۔ مغرب کے زیراثر1960ء کے بعداُردوناول میں تجربے بھی کیے گئے۔تجریدی اورعلامتی ناول کے علاوہ اینٹی ناول بھی لکھے جانے لگے۔ اِن جدیدناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، انتظارحسین، غیاث احمدگدی، انورسجاداورحلاالدین وغیرہ کے نام قابل ذکرہیں۔ جنھوں نے جدیدتجربات کرکے اُردوناول کوترقی کی

راہوں پر گامزن کیا۔ ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں نے بھی تجریدی اور علامتی ناول لکھنے شروع کیے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اگر چہ اُردو ناول کے ابتدائی نقوش 19 ویں صدی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں لیکن اُردو ناول کا باقاعدہ آغاز 1924ء میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ناول نگاروں کی ایک لمبی قطار اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جنھوں نے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول کو فروغ دینے میں اہم رول نبھایا۔ ان ناول نگاروں میں کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، رامانند ساگر، محمد عمر نور الٰہی کے نام سر فہرست ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ 1960ء کے بعد مغرب کے زیر اثر ریاست میں اُردو ناول میں نئے رجحانات کے تحت ناول لکھے جانے لگے۔ اُردو ناول کے ان نئے رجحانات کے اولین تجربے جن ناول نگاروں نے کیے اُن میں تیج بہادر خان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، نور شاہ، شبنم قیوم، محمد مجید، وحشی سید ساحل، بھوشن لال بھوشن، رشید پروین اور جان محمد آزاد کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ آنند لہر کا شمار بھی ریاست جموں وکشمیر کے اُن ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے تجریدی، لایعنی اینٹی ناول نہ صرف تخلیق کیے بلکہ اپنا لوہا بھی منوایا۔

آنند لہر جن کا تعلق ضلع پونچھ سے ہے ابھی تک جو ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں سرحدوں کے بیچ، اگلی عید سے پہلے، مجھ سے کہا ہوتا، اور یہی سچ ہے ہیں۔ سرحدوں کے بیچ آنند لہر کا پہلا ناول ہے۔

چراغ حسن حسرت نے اپنی قلم کی جولانیوں کی وجہ سے ریاست جموں وکشمیر میں خاص کر اُردو افسانے اور اُردو ناول کے چراغ کو مزید منور کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اور اُردو افسانے کو ''کیلے کا چھلکا'' جیسا مجموعہ دیا۔ ٹھاکر پونچھی کے ناول برصغیر کے ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہوئے۔ کے ڈی مینی کے تاریخی اور ادبی مضامین کسی دستاویز سے کم نہیں ہیں۔ اسی پونچھ کی سرزمین سے اُردو کے معروف افسانہ نگار، ڈراما نگار اور ناول نگار شام سندر آنند لہر کا بھی تعلق ہے۔ جن کا بچپن اگر چہ کہ پونچھ کی دلفریب وادیوں میں گذرا لیکن جوانی کی دہلیزیں انھوں نے جموں کے خطے میں کاٹیں۔ جموں یونیورسٹی سے جب ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تو وکالت کے پیشے کو اپنایا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے وکالت کے پیشے میں شہرت حاصل کی۔ ادب سے لگاؤ چونکہ اُن کو شروع ہی سے تھا۔ اس ذوق وشوق کو بھی اُنھوں نے

جاری وساری رکھا۔

وکالت کے پیشے میں تو شہرت کمائی لیکن ادب سے لگاؤ چونکہ شروع سے ہی تھا۔ اسی ادبی ذوق وشوق کی وجہ سے نہ صرف ریاست میں بلکہ ریاست سے باہر پورے ملک کے ادبی حلقوں میں خاصے جانے اور پہچانے گئے۔ ان کی تخلیقی کارکردگیوں کی وجہ سے ریاست اور ریاست سے باہر کے ادبی حلقے انھیں انعامات واعزازات سے بھی نواز چکے ہیں۔ ملک بھر کی مختلف اُردو اکیڈمیوں نے آنند لہر کے ناولوں پر انعامات بھی دیئے ہیں۔ بعض معتبر رسائل کے نمبر بھی آنند لہر کے فن اور شخصیت پر شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی لحاظ سے آنند لہر ایک پہلودار شخصیت کے حامل ہیں۔ اور ہر پہلوؤ سے خاصے مشہور ومعروف ہیں۔ انھوں نے شاعری بھی کی۔ ڈرامے بھی تحریر کیے لیکن ناول اور افسانہ ان کی شہرت کا سبب بنے۔ اور ان ہی اصناف کی وجہ سے وہ ادبی دُنیا میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ''انحراف''۔ ''سرحد کے اس پار''۔ ''کورٹ مارشل'' اور ''بٹوارہ'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ جب کہ ڈراموں کے مجموعوں میں ''تپسوئی کون''، ''نروان'' اور ''سرحدیں'' شامل ہیں۔ ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ''، ''یہی سچ ہے'' اور ''مجھ سے کہا ہوتا''، آنند لہر کے وہ ناول ہیں جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے اُردو ادب کی دُنیا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کا یہ معروف وکیل اُردو زبان کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا ہے۔ اور جہاں اِس تہذیبی اور آئینی زبان سے زیادتی ہوتی ہے تو آنند لہر کی آنکھیں خون کے آنسوؤں بہاتی ہیں۔ وہ چلاتے ہیں۔ قلم کو بھی جنبش دیتے ہیں۔ اور حکومت وقت کے کانوں میں اُردو کی آہ وفغاں پہنچانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ اُردو کو مشترکہ تہذیب کی علامت سمجھتے ہیں اور اسی کو اوڑھنا اور بچھونا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ریاست کی مختلف انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ اور اپنی پلیٹ فارم سے اُردو کو آئینی حقوق دلانے کے لیے آئے دِن آواز بلند کرتے ہیں۔ آنند لہر ہمیشہ ادبی انجمنوں کو مالی امداد سے بھی نوازتے ہیں۔ معروف ومشہور وکیل ہونے کے ناطے امداد سے بھی نوازتے ہیں۔ معروف ومشہور وکیل ہونے کے ناطے ادب کے لیے اِن کو کب وقت ملتا ہے۔ اس کے بارے میں لہر صاحب کا کہنا ہے ایک انٹرویو کے دوران۔

''عدالت میں ہی کسی ایسے کیس کی شنوائی کرتے ہوئے۔ کوئی ایسا واقعہ درمیان میں آجاتا ہے کہ

جو بعد میں کہانی یا ناول کے پلاٹ کا موجب بنتا ہے۔ اور یوں ان کی تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔

مجھے آنند لہر کے ناولوں کا بغور مطالعہ کرنے کا اس وقت موقع ملا جس وقت میرے تحقیقی مقالے کا موضوع ان کی شخصیت پر تھا۔ ''اگلی عید سے پہلے'' کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے کچھ عرصے میں اِن کے دوسرے ناول بھی پڑھ ڈالے۔

مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ آنند لہر ناول لکھنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اس کے اجزائے ترکیبی برتنے کا ہنر لہر صاحب کو اچھی طرح سے آتا ہے۔ ناول کے پلاٹ میں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے حادثات اور واقعات اِن کے ناولوں کے اہم موضوعات ہیں۔ آیئے مختصر جائزہ لیتے ہیں آنند لہر کے ناولوں کا۔

''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور ''یہی سچ ہے'' آنند لہر کے چار ناول ہیں۔ جن کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ ''سرحدوں کے بیچ'' آنند لہر کا ایک شہرہ آفاق ناول ہے۔ 66 صفحات پر مشتمل یہ ناول 2009 میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں ناول نگار نے کشمیر کے ایک ایسے گاؤں کو موضوع بنایا ہے۔ جہاں غربت اور مفلسی عروج پر ہے۔ لوگ سوکھی روٹی اور پودینے کی چٹنی سے گذارا کرتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ پودینے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ سرحدوں کا بٹوارہ تو ہوا لیکن اس گاؤں کے لوگوں کے دِلوں کو کوئی تقسیم نہ کر سکا۔ یہاں پر ناول نگار نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک آدمی کو اپنے وطن سے کس طرح محبت ہوتی ہے وہ اپنی پیدائشی مٹی کے بارے میں فکرمند رہتا ہے اور اس سے جنون کی حد تک پیار کرتا ہے۔

> ''ملک بنا سرحدیں قائم کر دی گئیں۔ مگر لکیروں کا کھیل کھیلنے والے بڑے لوگ اس بات کو نہ جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے لوگ پودینے کی چٹنی کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے کبھی نہ یہ گاؤں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی یہاں کے لوگوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں کو پودینہ پسند تھا۔ اور وہ زمین جہاں پر وہ اُگتا تھا ان کے لیے خاصی اہمیت

رکھتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا نے یہیں کھڑے ہوکر انسان بنانے کے برے

میں سوچا تھا“ [۱]

اس اقتباس میں ناول نگار نے اُن لوگوں پر طنز کیا ہے جنھوں نے سرحدوں کے بیچ لکیریں کھینچیں۔
یہ ناول صرف ایک ہی مرکزی کردار رانی کے اردگرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ جو بے خبری کے عالم میں پودینہ لینے سرحد کے اس پار جاتی ہے۔ اور جاسوسی کے جرم میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ راجہ نام کا ایک پولیس آفیسر اس کی پوچھ تاچھ کے لیے تعینات ہوتا ہے۔ راجہ کو رانی سے بے حد پیار ہو جاتا ہے۔ اور رانی کے والد کے کہنے پر اس کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ ٹیچر بن جاتا ہے۔ رانی سے وہ اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ اسے جیل میں بھی ملنے جاتا ہے۔ ایک بار جب رانی کو چکر آتا ہے تو وہ ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے۔ جانچ کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ رانی حاملہ ہے۔

تو وہ بلاخوف کہتی ہے کہ اس کے پیٹ میں راجہ کا بچہ ہے۔ جسے راجہ قبول کرتا ہے لیکن رانی کی رہائی ہونے کے بعد تو راجہ اور اس کے بچے کو سرحد کے پار آنے نہیں دیا جاتا ہے۔ اور نہ ہی رانی کو وہاں رہنے کی اجازت ملتی ہے۔ اس طرح سے یہ کہانی اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے۔ آنند لہر نے اس ناول کے توسط سے سرحد پر آباد لوگوں کے فطری مسائل کو سدھارنے کے لیے حکومتوں کی توجہ اس طرف مبذول کروائی ہے۔ اس ناول کے ذریعے آنند لہر نے یہ بتایا ہے کہ سرحدوں کی لکیر نے انسانوں کو بھی بے یقینی کی صورت حال سے دوچار کیا۔ یہی وہ لکیریں ہیں جن کی وجہ سے ہندوپاک کی عوام آپس میں گھل مل نہیں سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن سرحدوں نے انسانیت کی بنیادی قدروں کو بھی پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ آنند لہر کے زیر بحث ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے نامی انصاری لکھتے ہیں۔

”سرحدوں کے بیچ“ کا موضوع ہندوپاک کے درمیان کی سرحد کے دونوں طرف کے گاؤں کی انسانی صورت حال ہے جو نہ صرف دردناک ہے بلکہ یہ سرحدیں انسانیت کی بنیادی قدروں کو پامال

---

[۱] آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ناشر ملک بک ڈپو۔ 2001۔ ص۔ ۱۹

کرنے کا موجب بھی بن گئی ہیں'' ۱

آنند لہر کا دوسرا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' میں آپسی بھائی چارے کی عمدہ مثال ملتی ہے۔اس ناول میں ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان کی سوچ،اس کا عمل اور فکر مثبت ہو تو دُنیا بھی بدل سکتی ہے۔ اس ضمن میں محمد معظم الدین لکھتے ہیں۔

''اس ناول کو فنی اعتبار سے پرکھنے کے بجائے ناول نگار کے ذہنی رویے کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔جس کی بناء پر یہ ناول وجود میں آیا۔فن کار نے اس ناول کے ذریعے پیغام دینے کی کوشش کی کہ فکروعمل سے اس دُنیا کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔اس کا یہ جذبہ یقیناً قابل قدر ہے ۔چنانچہ موضوعاتی اعتبار سے یہ ناول اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے'' ۲

اس ناول کی کہانی بھی کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔جہاں پر ہندو اور مسلمان اکٹھے زندگی گذارتے ہیں۔ اس ناول کی بنیاد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے اس قول کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے ، ''شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مُسلم سکھ اتحاد''۔ یہ نعرہ دینے والا کوئی اعلیٰ آدمی نہیں ہے بلکہ ایک متوسط طبقے کا ایک غریب انسان عبدل ہے۔جو کلچے بیچ کر اپنی روزی روٹی کماتا ہے۔بدری اور عبدل کشمیر کے ایک ہی گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔بدری گاؤں کے ایک مندر کا پجاری ہے۔جو ہر صبح مندر میں شنکھ بجاتا ہے۔اس گاؤں کے لوگ آپس میں بھائی بھائی بن کر رہ رہے ہیں جو قبائلیوں کو برداشت نہیں ہوتا۔وہ بدری کے شنکھ کو چراتے ہیں ۔جس سے وہ کافی پریشان ہو جاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''غلام آہستہ سے مندر کے دروازے کے اندر گیا۔اس کی یہ حرکت اس کی آنکھوں نے پسند نہ کی ۔اس کے اپنے ہی کانوں نے اس کے پاؤں کی آہٹ کے خلاف احتجاج کیا مگر اس نے شنکھ چرا لیا''۔

۱۔نامی انصاری ۔مشمولہ شاعر ۔جلد ۶۷ ۔شمارہ ۵ ۔ص ۔۹

۲۔محمد معظم الدین ۔مشمولہ ۔ماہنامہ آج کل ۔نئی دہلی ۔جلد ۔۶۴ ۔شمارہ ۲، ستمبر ۲۰۰۵ ۔ص ۔۴۶

گاؤں اس طرح پریشان لگنے لگا جیسے اس کے موسم اس سے چھین لیے
گئے ہوں۔محسوس ہوا کہ جیسے پھولوں کو کھلنے سے روکے رکھا ہو۔ ہر شخص
پریشانی کے عالم میں تھا۔کوئی مرا نہیں تھا۔اس گاؤں میں نہ ہی کوئی بڑا حادثہ
ہوا تھا۔عام لوگوں کے لیے شنکھ گم ہو جانا شاید معمولی بات تھی مگر اس گاؤں
کے لیے جیسے گاؤں کو ہی کوئی چرا کرلے گیا ہو"۔ [1]

بدری کشمیر سے بھاگ کر جموں میں عارضی سکونت اختیار کر لیتا ہے جہاں پر اس کی بیوی کی وفات ہو جاتی ہے۔ عبدل بدری کی لاش میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے اور آخر کار وہ بدری کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ واپس کشمیر جاتا ہے۔اکثر لوگ عید کی خوشی میں اپنے گھروں کی چھت سے چاند تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔اسی اثنا میں ایک شخص بول اُٹھتا ہے۔اگر بدری ہوتا تو وہ اپنی جنتری سے ہمیں عید کی تاریخ بتاتا۔گاؤں کے لوگ بدری کو اگلی عید سے پہلے کشمیر واپس لانے کا تہیہ کرتے ہیں۔اس طرح ناول کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔یہ ناول اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ناول نگار نے کشمیر میں صدیوں پرانے چلے آرہے ہندو مسلم اتحاد پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔اور ان عوامل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اتحاد میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد رقمطراز ہیں۔

"میرے عزیز دوست آنند لہر دُنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج
نہیں۔ وہ صف اول کے افسانہ نگار۔تمثیل نگار اور ناول نگار ہیں۔شعر بھی
کہتے ہیں لیکن ابھی تک بطور شاعر منظر عام پر نہیں آئے۔منظر خاص تک ہی
محدود ہیں۔جہاں تک فکشن نگاری کا تعلق ہے ان کے افسانے اور ناول ملک
کے بلند پایہ ادبی جریدوں میں شائع ہو کر داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔حال
ہی میں "تپسوئی کون" ہندوستان بھر میں شرفِ قبولیت کی بلند منزلوں تک پہنچ
چکا ہے۔

---

[1] آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے

آنندلہر صاحب کا یہ ناول سرزمین کشمیر کی ایک دردبھری داستان ہے۔ یہ داستان 1947ء سے 1996 تک سرزمین کشمیر کی دردبھری داستان جونصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ۔ایک ایسی روداد ہے جس میں روشنی اوراندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ کہیں کہیں تصادم بھی ہوجاتا ہے اور نتیجتاً کہیں اندھیرا فتح یاب ہوتا ہے۔اور کہیں روشنی لیکن انجام آخرکار روشنی کامران ونصرت یاب ہوتی ہے۔جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصف صدی کا سارا سفر ناول نگار کے اپنے دل کی تجلی سے جگمگا رہا ہے۔ ناول نگار نے تو قنوطی Passimist نہ رجائی (Optimist) بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دُنیا کسی انسان کے ذریعے سے بہتر ہوسکتی ہے۔یعنی اصلاح کا قائل ہے"۔[۱]

آنندلہر کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں جنگ کے حالات، تباہ کاریاں اور ہولناک مناظر کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز سے چرندوں پرندوں کی زبانی بیان کی گئی ہے۔لہر نے یہ ناول امریکہ کی طرف سے عراق پر کیے گئے وحشیانہ حملے کے پس منظر میں لکھا ہے۔ناول نگار کے مطابق اس حملے اور جنگ میں انسانوں کا ہی لہو بہایا اور انسانیت ہی مجروح ہوئی۔جو بھی اس کی زد میں آیا ان سب کا خون ایک جیسا تھا۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس۔

''عراق میں رہنے والے لوگوں کا خون بھی عام انسانوں کے خون کی طرح لال تھا اور لڑائی میں مارے جانے والے سپاہیوں کا بھی''۔[۲]

ناول کی شروعات زمین کے اس حصے سے ہوتی ہے جہاں پر جنگ کے بعد کوئی بھی انسان زندہ نہیں بچتا۔اس تنہائی کے عالم میں جنگل کے سارے چرند پرند جمع ہوتے ہیں اور ان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ جنگ

۱۔جگن ناتھ آزاد، مشمولہ شاعر۔فاران پبلیشرز بمبئی، جلد ۷۶۔شمارہ ۵ مئی۔2005۔ص۔۹

۲۔آنندلہر۔''مجھ سے کہا ہوتا''۔ص۔۱۱

انسانوں نے ہی لڑی ہوگی۔ جنگل کے چرند پرند آپس میں باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ دو آدمی خون میں لت پت ان کے سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں کے بچے آتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں سے اس تباہی کا سبب پوچھتے ہیں۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس کچھ زہریلے ہتھیار تھے۔ اس کو مارنے کے لیے بم اور ٹینک استعمال ہوئے۔ ان پرندوں میں ایک اژدھا بھی خاموشی سے ان کی باتیں سنتا ہے۔ اور جواب دیتا ہے کہ اگر اُس انسان ہی کو مارنا تھا تو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ''مجھ سے کہا ہوتا''۔ میں اپنے زہر سے اسے مار دیتا۔ اور اسی مناسبت سے کہانی کا نام رکھا گیا۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور اس طرح سے یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ دراصل یہ ناول اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ عراق کے لوگوں کو کس بے دردی کے ساتھ مختلف قسم کے ہتھیار استعمال کر کے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہیں بموں اور ٹینکوں کا نشانہ بنایا گیا۔ کیا یہ ہتھیار انسان کو مارنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ اس ناول سے متعلق پروفیسر ظہورالدین اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

''آنند لہر ریاستی اُردو فکشن پر ابھرتی ہوئی ایک نئی آواز ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک نامور ایڈوکیٹ ہونے کے ناطے آپ کی مصروفیات کا جو عالم ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اپنی دلچسپیوں خصوصاً ناول اور افسانہ کے لیے آپ کس طرح وقت نکال پاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ آپ کے جو ناول اس وقت تک چھپ کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں ''سرحدوں کے بیچ'' قابل ذکر ہے۔ جس پر ملک کی اکیڈمیوں نے آپ کو اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔ جس میں آپ نے اپنی افتادِ طبع کے عین مطابق ایک ایسے موضوع کو مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا تعلق اگرچہ ہمارے ہی دور سے ہے لیکن نوعیت کے اعتبار سے ہر دور کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ یعنی ہتھیاروں کی دوڑ اور اس کے استعمال سے پیدا ہونے والے نتائج جس میں انسان تو متاثر ہوتے ہی ہیں۔ وہ چرند پرند بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہتے۔ جس کا اس ماحول سے کسی طرح کا کوئی رشتہ ہو۔ یہ موضوعات جتنے اہم ہیں۔ آنند لہر انھیں اتنے ہی موثر لیکن سیدھے سادے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بہت سی ازلی حقیقتوں پر سے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی فطرت کا ایسا ننگا ناچ شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملے''۔

''سرحدوں کے بیچ'' کا تنقیدی جائزہ

آنند لہر کا پہلا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' 2002ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں ناول نگار نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے دونوں طرف رہنے والے لوگوں کی پریشانیوں کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول 66 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ایک طرف مصنف کی ایک تصویر کے ساتھ ''آنند لہر ایک نظر میں''۔ لہر کا مختصر تعارف شائع ہوا ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ بھی کافی اچھا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ''آنند لہر سرحدوں کے بیچ ایک جذباتی تخلیق'' کے عنوان سے معصوم رضا نے قلم بند کیا ہے۔ جس میں آنند لہر کے ناول ''سرحدوں کے بیچ'' پر کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ لگ بھگ بارہ صفحات پر پھیلا ہوا یہ مضمون اس ناول کی شہرت اور زینت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ آنند لہر کے ناول ''سرحدوں کے بیچ'' پر کھل کر تبصرہ کرنے کے علاوہ معصوم رضا نے دیباچے میں تقسیم ہند کے بعد لکھے گئے ناولوں پہ بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں۔

> ''اُردو ناول میں تقسیم ہند کے متعلق تمام ناول آج بھی خون کے آنسوں رُلاتے ہیں لیکن اس دوران ایک اہم ناول ''آگ کا دریا'' منظر عام پر آیا جسے پریم چند کے ناولوں کے بعد دوسرا اہم پڑاؤ کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کرشن چندر، عصمت چغتائی، اور راجندر سنگھ بیدی نے بھی افسانوی ادب میں نئے نئے موضوعات کا اضافہ کیا لیکن پھر افسانوی ادب کو جدیدیت نے جکڑ لیا اور ایسے ایسے ناول وجود میں آئے جو عام قاری کی عقل و فہم اور شعور و ادراک پر بوجھ بن گئے۔ پھر پرانی روش اختیار کی گئی اور قصہ کہانی کا دور واپس آیا۔ بیسویں صدی عیسوئی میں جو ناول لکھے گئے وہ سماجی اور نفسیاتی مسائل کے ساتھ معاشرتی موضوعات پر بھی اپنی گرفت مضبوط بنائے ہوئے تھے۔ کچھ مسائل ایسے ہیں جو آزادی کے بعد یعنی تقسیم وطن کے بعد منظرِ عام پر آئے اور آج بھی قائم ہیں۔
>
> ان مسئلوں کو سیاسی رنگ دے کر نئے نئے شوشے چھوڑے گئے اور انھیں

الیکشن کا مدعا بنا کر انتخاب میں کامیابی حاصل کی جانے لگی اور ایسی گندی سیاست کی جانے لگی کہ انسانیت شرما گئی'' ۱

۱۹۴۷ء کی آزادی کے فوراً بعد ملک کا جب بٹوارہ ہو جاتا ہے تو دونوں ملکوں کے درمیان سرحدیں لکیریں کھینچی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ہی ملک کے رہنے والے دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں کسی کو سرحدیں پار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ آنند لہر کا زیرِ نظر ناول ملک کی تقسیم کے پس منظر کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے۔

ہزاروں بے گناہوں کو اپنی بھوک کا شکار بناتا ہے۔ آنند لہر صاحب کا تعلق چونکہ اسی سرزمین سے ہے جہاں برسوں سے بم، گولہ، بندوق کی آوازیں ہی عوام کے حصے میں آئی ہیں۔ ایسی صورت حال میں جب کوئی ادیب یا شاعر لکھنے بیٹھے گا۔ تو یہی مسائل اُس کے ذہن میں اُبھرنا ایک فطری عمل ہے کہ آخر یہ ''سرحد'' چیز کیا ہے؟۔ جس کے لیے آئے دِن گولیاں چلتی ہیں۔ بم برسائے جاتے ہیں اور ہزاروں بے گناہوں کی زندگیاں لقمہ اجل بنتی ہیں۔ آنند لہر نے اپنے ناول ''سرحدوں'' کے بیچ میں اسی خوفناک منظر کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول سرحدوں کے قریب رہنے والوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جو لوگ سرحدوں کے قریب رہتے ہیں وہ اس پورے علاقے کو ایک ہی اور اپنا مانتے ہیں۔ انھیں کسی بھی حد یا خطہ کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے آس پاس کے وسائل سے ہی اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور سرحدوں کی حقیقتوں سے ناآشنا نظر آتے ہیں۔

آنند لہر کے ناول ''سرحدوں کے بیچ'' کا موضوع کشمیر کا ایک ایسا گاؤں ہے جہاں ایک غریب کنبہ اپنی گھریلو زندگی غربت اور مفلسی میں گذار رہا ہے۔ اس گاؤں کے اکثر لوگوں کی زندگی سوکھی روٹی اور پودینے کی چٹنی پر انحصار رکھتی ہے۔ اور یہ پودینے کی چٹنی اُن کی روزمرہ زندگی کا معمول اور غربت و مفلسی سے لڑنے کا وسیلہ بن چکی ہے۔ سرحد کیا چیز ہے؟ یہ کب قائم ہوئی؟ اور کیوں قائم ہوئی؟ ان لوگوں کو اس بات کا بالکل

۱۔ ڈاکٹر سعید معصوم رضا۔ آنند لہر کا ناول۔ ''سرحدوں کے بیچ ایک جذباتی تخلیق''۔ مشمولہ۔ ''سرحدوں کے بیچ'' ناشر ملک بک ڈپو۔ 2002ء۔ ص۔ 43

اندازہ تک نہیں ہے۔اس ناول کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے۔نامی انصاری ایک جگہ رقمطراز ہیں۔

"سرحدوں کے بیچ" کا موضوع ہندوپاک کے درمیان کی سرحد کے دونوں طرف کے گاؤں کی انسانی صورت حال ہے جو نہ صرف دردناک ہے بلکہ یہ سرحدیں انسانیت کی بنیادی قدروں کو پامال کرنے کا موجب بھی بن گئی ہیں"۔[1]

آنند لہر کے ناول "سرحدوں کے بیچ" کا پلاٹ نہایت ہی منظم اور مربوط نظر آتا ہے۔اس انول کی کہانی کچھ اس انداز میں شروع ہوتی ہے۔یا پھر اس طرح سے تیار کی گئی ہے۔

رانی ناول "سرحدوں کے بیچ" کا مرکزی کردار ہے جو سرحد کے پار دوسرے ملک میں اپنے کیے ہوئے جرم کی سزا کاٹتی ہے جو اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہوتا ہے۔وہ مجبوری کی حالت پر مجبور نظر آتی ہے اور اپنے لوگوں سے دور بھی ہے اور وہ راجہ کے عشق میں مبتلا بھی ہے۔ناول نگار نے کہانی کا ڈھانچہ رانی کے اردگرد ہی بُنا ہے یا پھر دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پوری کہانی رانی کے اردگرد ہی چکر کاٹتی ہے۔

کہانی کی شروعات ناول نگار رانی کے گھر سے ہی شروع کرتا ہے۔جہاں پر رانی کا باپ رام غلام اپنی بیٹی رانی کے متعلق بہت بڑی گہری سوچ رکھتا ہے اور وہ سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے کہ کس طرح سے وہ اپنی بیٹی رانی کے لیے ایک اچھا دلہا تلاش کرے۔سوچ ہی سوچ میں اس کی نظر اُن لڑکوں کی طرف جاتی ہے جن میں سے وہ رانی کے لیے ایک اچھا دلہا منتخب کرے گا۔

ملک کی تقسیم کے بعد رانی کا گاؤں ملک کا سب سے آخری گاؤں ہوتا ہے۔اس لحاظ سے رانی کا باپ رام غلام ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنے اس گاؤں کو ہنستے ہوئے بھی دیکھا ہے اور تباہ و برباد ہوتے ہوئے بھی۔یہ گاؤں سرحد کی اُس جگہ پر واقع ہے جہاں پر پودینہ اُگتا ہے اور یہ لوگ روٹی کے ساتھ پودینہ کی چٹنی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔پودینے کی چٹنی کا یہ شوق انھیں سرحد کے اس پار لیے جاتا ہے اور وہ لوگ ہر قسم کے خطرے سے ناواقف ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں زیر بحث ناول کا ایک اقتباس درج ہے۔

---

[1] نامی انصاری۔مشمولہ شاعر۔پبلیشرز ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں دہلی۔جلد ۶۷۔شمارہ ۵۔ص۔۹

''ملک بٹا سرحد قائم کردی گئی مگر لکیروں کا کھیل کھیلنے والے بڑے لوگ اس بات کو نہ جانتے تھے کہ اس گاؤں کے لوگ پودینے کی چٹنی کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے یہ گاؤں نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی یہاں کے لوگوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں کو پودینہ پسند تھا۔ اور وہ زمین جہاں پر وہ اُگتا تھا۔ اُن کے لیے خاصی اہمیت رکھتی تھی ۔وہ سمجھتے تھے کہ خدا نے یہاں کھڑے ہو کر انسان بنانے کے بارے میں سوچا تھا''۔[1]

رانی کا باپ رام غلام کا یہ معمول بن چکا ہے کہ وہ ہر روز جنگل سے پودینہ لاتا ہے۔ اور اس چٹنی سے روٹی بڑے مزے سے کھاتا ہے۔ چونکہ رانی کی پیدائش تقسیم وطن کے بعد ہوتی ہے۔ اس لیے وہ سرحد کے نام سے بالکل ناآشنا ہوتی ہے۔ ایک دن اچانک رانی کے والد کو پیٹ میں شدید درد اُٹھتا ہے اور رانی کا باپ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ''سرحدوں'' کا پہرہ سخت ہو گیا ہے۔ رام غلام اپنی بیٹی کو پودینہ لانے کے لیے بھیجتا ہے ۔مگر بدقسمتی سے پودینہ توڑتے ہوئے سرحد کے اُس پار جاسوسی کے جرم میں وہاں کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ گرفتار کرنے کے بعد رانی کو ایک ایسی جگہ پر لایا جاتا ہے جہاں پر ظلم وستم کا منظر ہوتا ہے۔ یہاں پر غلاماں کی شکل میں ایک ایسا کردار نمودار ہوتا ہے ۔ جو بہت ظالم اور سنگین قیدیوں کو جیل میں مارتا پیٹتا اور ان سے پوچھ تاچھ کرنا اس کا پیشہ ہے۔

''کیا کہا''۔ ایک سپاہی نے رانی کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے ۔

''کچھ نہیں''، ''کچھ نہیں''۔ رانی نے آسمانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آسمان کی طرف کیوں دیکھ رہی ہو''۔ رانی نے یہ سن کر زمین کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ کہہ کر اُس نے رانی کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور زور کی لات مارنے ہی لگا تھا کہ اس کے افسر نے اُسے آواز دی۔

---

[1] ۔آنند لہر۔ ''سرحدوں کے بیچ'' ناشر ملک بُک ڈپو۔ اشاعت ۔ 2001ء۔ ص۔۱۹

''غلاماں غلاماں'' ''بولئے حضور''

''اِس چڑیا کو فی الحال چھوڑ دو۔ آؤ ذرا ہاتھوں کی مالش کریں''

''آیا حضور''۔ یہ کہا غلاماں نے پھر رانی کے منہ پر تھپڑ مارا اور افسر کے

پاس چلا گیا۔۔۔[1]

اس مقام پر راجا نام کا ایک اور کردار اُبھر کر سامنے آتا ہے جس کی بحیثیت پولیس انسپکٹر تعیناتی ہوتی ہے۔ راجا نہایت ہی خوب صورت اور رحم دِل نوجوان ہے اور پولیس کے سبھی معاملات سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہے۔ رانی سے پوچھ تاچھ کی ذمہ داری اس کو سونپی جاتی ہے۔ مگر وہ رانی کے ساتھ سختی نہیں برتتا۔ جس کی وجہ سے رانی کو تھوڑی سی راحت ملتی ہے۔ رانی کی خوبصورتی کو دیکھ کر اُسے رانی سے پہلی ہی نظر میں پیار ہو جاتا ہے۔ اب راجا اور رانی ایک دوسرے سے عشق کرنے لگتے ہیں۔ رانی بھی راجہ سے حد سے زیادہ پیار کرنے لگتی ہے لیکن بدقسمتی سے غلاماں کی شکایت پر راجہ کا تبادلہ بڑے جیل خانے میں ہو جاتا ہے۔
کچھ دِنوں کے بعد رانی کو جج صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ رانی اپنا اقبال جرم کر لیتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ راجہ کی تعیناتی اب بڑے جیل خانہ میں ہوتی ہے اور رانی اس سے بے حد پیار کرتی ہے۔ اور رانی کو بھی جج بڑے جیل میں لے جانے کا حکم دیتا ہے۔ اسی دوران راجہ پولیس کی نوکری ترک کر کے ٹیچر کی نوکری جوائن کر لیتا ہے۔ رانی راجہ سے یہ بات دریافت کرتی ہے۔

''راجا نے رانی سے کہا'' مجھے دوسری نوکری مل گئی ہے''

''کون سی نوکری'' رانی نے پوچھا

''مگر تم نے پولیس کی نوکری کیوں چھوڑی''۔ رانی نے پوچھا۔

''پسند نہیں تھی''

''کیوں''۔ ''کیونکہ تم پسند ہو اور تم تو محبت ہو''[2]

---

[1]۔ آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔ 43-42

[2]۔ آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔ 50

راجہ نے پولیس کی نوکری چھوڑ کر دوسری نوکری جوائن کی لیکن اس کی طبیعت نہیں لگتی ۔ وہ روزانہ جیل کے باہر رانی کا انتظار کرتا۔ اسی طرح راجہ اور رانی کی ملاقاتیں جیل میں ہوتی رہتی ہیں ۔ ایک دِن اچانک رانی کو چکر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر کو رانی کی جانچ کے لیے بلایا جاتا ہے اور ڈاکٹر بتاتا ہے کہ رانی حاملہ ہے۔ رانی بے جھجک یہ بات سب کو بتادیتی ہے کہ راجہ اس بچے کا باپ ہے۔ اور راجہ بھی رانی کا ساتھ بغیر خوف کے دیتا ہے۔ کچھ دنوں تک راجہ کے گھر والوں کو رانی ایک کانٹے کی مانند لگتی ہے۔ لیکن ہر ایک دیوار کو بغیر پوچھے گرادیتا ہے اور محبت کا ایک نیا بیج بوتا ہے۔ راجہ کے گھر والے رانی کو عزت سے گھر لانے کی تیاری کرتے ہیں۔ بچے کی وجہ سے رانی کی بقیہ سزا بھی معاف کر دی جاتی ہے۔ راجہ کے ماں باپ اور رشتہ دار بڑی دھوم دھام سے جیل کے باہر ڈولی لے کر آتے ہیں۔

"جیل کے باہر ڈھول بج رہا ہے۔ ڈولی سجا کے رکھی ہوئی تھی۔ عورتیں گیت
گارہی تھیں ۔لڑکے ناچ رہے تھے اور راجہ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا"۔[1]

اب وہ دِن بھی آجاتا ہے جب رانی کو قید سے رہائی ملتی ہے لیکن سرحد ایک بار پھر سے سانپ کی مانند اپنا منہ کھولتی ہے۔ جیل کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ رانی اور اُس کے بچے کو باہر لایا جاتا ہے۔ اور پولیس کی گاڑی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ راجہ ایک سپاہی سے سوال کرتا ہے۔

"راجہ نے ایک پولیس افسر سے سوال کیا۔
"رانی کہاں جارہی ہے"۔ "اپنے ملک میں" افسر نے جواب دیا
"مگر کیوں" راجہ نے اپنا سوال دھرایا۔
"کیونکہ یہ اُس کا ملک نہیں ہے"۔ راجہ گھبرا گیا۔
اُس نے کہا یہ سرحد کتنی مضبوط ہے۔ جو رشتوں کو توڑتی ہے"۔[2]

رانی اور اس بچے کو سرحد پر لایا گیا۔ راجہ اور اُس کے گھر والے بھی سرحد پر پہنچ جاتے ہیں ۔رانی

---

[1] آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔ ۷۹

[2] آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔ ۷۹

کوسرحد کی دوسری جانب چھوڑ دیا لیکن جوں ہی رانی اپنے بچے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتی ہے تو سپاہی اُسے روکتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ اس بچے کے لیے حکم نہیں ہے۔ دوسری طرف جب راجہ بچے کو تھامنے لگتا ہے۔ اس کے ملک کے سپاہی بھی اسی طرح کے الفاظ دھراتے ہیں کہ اس بچے کو ملک میں آنے کا حکم نہیں ہے۔ س طرح سے ناول نگار سرحد کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے اور اپنا مدعا پورا کرتا ہے اور ناول اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

''سرحدوں کے بیچ'' میں کردار نگاری

ناول نگاری میں پلاٹ کے بعد جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ کردار نگاری ہے۔ کردار نگاری صرف ناول کا ہی نہیں۔ بلکہ افسانہ ڈراما بلکہ ہر نثری صنف کا اہم جز ہے۔ کوئی بھی حصہ بغیر پلاٹ کے وجود میں نہیں آسکتا ہے کیونکہ کردار نگاری ہی ایک ایسا جز ہیں جو کہانی کو آگے بڑھانے میں بنیادی رول ادا کرتا ہیں اور ناول نگاران ہی کے ذریعے اپنا مقصد قارئین کے سامنے رکھتا ہے۔

کردار نگاری میں ناول نگار زندگی کے ٹھوس حقائق سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کے کسی بھی جذبے احساس یا واقعہ کی نقاب کشائی کرداروں کے ذریعے ہی کی جاتی ہے۔ کردار نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے علی عباس حسینی کہتے ہیں۔

> ''کردار نگاری ناول میں بہت اہم ہوتی ہے۔ کردار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ابتدا ہی سے پختہ اور پائدار رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ واقعات وحادثات اِن پر اثر نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ خود اُن سے متاثر ہوتے ہیں۔ جیسے نظیر احمد کی اصغری۔ فسانہ نادر جہاں کی استانی۔ فسانہ آزاد کا فوجی، شروع قصہ سے یہ سیرتیں مکمل ہیں۔ مصنف نے جہاں اُن کا نام لیا ہے اور ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ کس طرح کے ماحول میں اُن سے کیا افعال سرزد ہوں گے۔ اس طرح کے ''پختہ مغزانِ جنون'' کے لیے ہمیں کتاب کی ابتدا ہی میں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض کردار شروع ہی سے پختہ نہیں ہوتے۔ ناول کی ابتداء سے انتہاء تک اُن کی سیرت ارتقائی منازل کو طے کرتی رہتی

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ ان میں فوجی اور مہراج کی سی دلچسپی نہ ہو۔ لیکن
انھیں کامیابی کے ساتھ پیش کرنا حد درجہ مشکل ہے“۔[1]

”سرحدوں کے بیچ“ میں کرداروں کی خاصی تعداد ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے ۔ناول نگار نے ہر کردار کو سنوار کر بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور بڑی محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے۔ اس ناول میں ترسیل کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے حالات اور اسی ماحول میں پیدا ہوئے کرداروں کو بڑی چابکدستی کہانی کار نے کہانی کے تانے بانے میں اُلجھا کر ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ناول ”سرحدوں کے بیچ“ کے کردار مختلف طبقہ اور عمر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے کرداروں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ہر کردار اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی لیے ہوئے چلتا ہے۔ اور یہ کہانی کسی دوسرے کردار سے نہیں ملتی ۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ کردار قاری کے ذہن پر اپنا اثر دیر تک چھوڑتے ہیں۔ کوئی بھی کردار اس ناول میں غیر فکری اور غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ کردار اپنی جگہ مکمل نظر آتے ہیں ۔ اور کرداروں کے بنیادی اصولوں پر کھرے اُترتے نظر آتے ہیں۔

مرکزی کردار رانی:

رانی اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اور ساری کہانی اسی کردار کے اردگرد چکر کاٹتی ہے ۔ اس ناول میں رانی کا کردار ابتداء سے آخر تک جامع اور مکمل ہے ۔ یہ کردار اس ماحول اور علاقے کی پوری طرح سے عکاسی کرتا ہے ۔ ناول نگار نے رانی کے کردار کے ذریعے ہی سرحدوں کی حقیقتوں کو سامنے لایا ہے۔ اور ناول کے بقیہ کردار ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ اور اپنی اپنی کہانی سناتے ہیں۔ اس کہانی میں تمام تر واقعات رانی سے منسلک ہیں۔

رانی اس ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو”سرحد“ کے نام سے مکمل طور پر ناواقف ہے۔ رانی ایک غریب گھرانے کی خوبصورت لڑکی ہے۔ جو بچپن میں ہی اپنی ماں کے سائے سے محروم ہوگئی اور اس کی پرورش اور دیکھ بھال اس کا باپ رام غلام کرتا ہے۔

---

[1] علی عباس حسینی ۔ اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔ علی گڑھ ۔ 1998ء ۔ ص ۔ 64۔

یوں تو رانی کا کردار اس پورے ناول میں اپنی روشنی بجلیاں بکھیرتا ہے لیکن بعض اوقات یہ کردار ہمیں کافی حد تک کمزور بھی نظر آتا ہے۔رانی کا سرحد سے ناواقف ہونا، سرحد پر اس کا پودینہ توڑنے جانا، سپاہیوں کا اسے پکڑنا اور جیل تک پہنچانا۔ایک انجان آدمی سے اس کی محبت ۔غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود اس کا حاملہ ہونا۔آخر میں اپنے بچے کو پانے کی کوئی خاص کوشش نہ کرنا۔اس کردار کی یہ تمام اہم کمزوریاں ہیں۔پورے ناول میں اس کردار کی طرف سے کوئی جوش اور ولولہ جیسی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے۔تاہم لہر نے بڑی ذہانت سے اس کردار کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے اور اپنی فنی بصیرت کا ایک عمدہ ثبوت دیا ہے۔

دوسر کردار راجہ: راجہ اس ناول کا ہیرو ہے ۔راجہ پاکستان کے ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا خوبصورت جوان ہے۔اپنے والدین کی نیک کوششوں اور کاوشوں کے بعد راجہ اسکول تک پہنچتا ہے۔ والدین کے کہنے پر وہ پولیس کی نوکری کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔اور راجہ کی تعیناتی آزاد کشمیر کی اس جیل میں ہوتی ہے جہاں پر رانی کو قید کیا ہوتا ہے۔وہاں پر راجہ کو جو پہلا کام تفتیش کے طور پر سونپا جاتا ہے وہ رانی کی پوچھ تاچھ کی شکل میں ہوتا ہے۔ راجہ ایک دردمند دِل رکھنے والا انسان ہے۔ جو کسی پر بھی ظلم وستم نہیں کرنا چاہتا ہے۔اس پوچھ تاچھ کے دوران راجہ کو رانی سے محبت ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن راجہ پوری وفاداری کے ساتھ آخر تک رانی کے ساتھ رہتا ہے۔آخر کار راجہ اور رانی کی کہانی ایک ہی موڑ پر ختم ہو جاتی ہے۔

کہانی کا یہ کردار کافی سلجھا ہوا ہے۔اور رحم دل بھی ہے۔راجہ کا کردار کہانی کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔ اس کی گفتگو سے سادگی کا عنصر جاگتا ہے۔وہ ہر کسی کے درد، جذبات اور مجبوریوں سے واقف نظر آتا ہے۔یہ کردار کہانی کا مقصد پورا کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

رانی اور راجہ کے کرداروں کے ساتھ ساتھ ناول کے دوسرے کرداروں کی ہمدردی بھی برقرار رہتی ہے۔راجہ کا جنوں اور رانی کا صبر وتحمل اس ناول کا مرکزی نقطہ ہے۔ساتھ میں ضمنی کرداروں میں سمد اقصائی کا کردار مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور سزایافتہ مجرم ہونے کے باوجود بھی وہ رانی کی پوری

مدد کرتا ہے۔ وہیں پر ہمدرد خان ایک ظالم اور جابر کا کردار ادا کرتا ہے۔ جس سے رانی ہمیشہ خوف زدہ رہتی ہے لیکن نئے جیلر سدانند کی رحم دلی کی وجہ سے رانی کا جیل میں رہنا کچھ آسان ہوگیا تھا۔ سدانند ایک اصول پسند انسان تھا۔ اس لیے اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بھی تھا۔ لیکن قانونی طور پر وہ رانی کی کچھ مدد نہ کرسکا۔ صرف رانی کی سزا کم کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر بھی وہ رانی پر کی جانے والی زیادتیوں کو برداشت نہ کرسکا اور نوکری کو خیر باد کہہ کر پاگلوں کی طرح سڑک پر مارا مارا پھرنے لگا۔

ان کرداروں کے علاوہ اس ناول کا ایک اہم کردار ثریا ہے جو اس جیل میں کئی برسوں سے رہ رہی ہے۔ جہاں پر رانی بھی ہوتی ہے۔ جہاں پر یہ کردار آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

مصنف نے سادہ اور عام بول چال کی زبان میں کچھ مکالمے ثریا کی زبان سے یوں ادا کرائے ہیں۔

''کب آئی ہو تم یہاں پر''

''میں ابھی دو دن ہوئے ہیں''

''ایک بات ہوں''

''کہو''۔ رانی نے کہا۔

''سب سچ سچ کہہ دینا''۔

''مگر یہ لوگ مان جاتے ہیں''۔

''اصل میں یہ لوگ جو کہیں وہ کہہ ڈالو، ''یہی سچ ہے'' [1]

سرحدوں کے بیچ منظر نگاری

آنند لہر نے اس ناول میں منظر نگاری کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ وہ جس منظر کو پیش کرتے ہیں۔ اُس منظر کا سارا نقشہ قاری کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قاری بذات خود اس جگہ کی سیر کرتا ہے۔ ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں بارڈر۔ فوجی کیمپوں، اذیت گھروں، عدالتوں اور جیلوں کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کی ابتدا میں ''سرحد'' کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچتے ہیں۔

---

[1]۔ آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔ 32

''پہرے سخت کردیئے گئے۔ یہاں سے زہر کی فصل اُگنی شروع ہوئی تھی
۔ اورسرحد نے اپنی پہچان ظاہر کرنا شروع کردی ۔ اورسرحد کی پہچان ہے
گولی۔ بارود، موت چیخ وپکار، سرحد پر گولی بے وجہ چلتی ہے۔ کبھی کبھی نہ
چاہتے ہوئے بھی کسی فوجی کا ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر چل جاتا ہے۔
پھرایک گولی چلتی ہے۔ پھر دوسری اور پھر گولیوں کی بوچھاڑ ہوجاتی ہے۔
اصل میں سرحد اپنے وجودکو قائم رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کراتی ہے۔
''سرحد کا وجود کیسے قائم رہتا ہے''۔ایک سپاہی نے دوسرے سے
پوچھا۔''گولی سے، لاشوں سے''۔دوسرے نے جواب دیا۔ [1]

''ناول سرحدوں کے بیچ''میں جتنے بھی مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ان سب میں آنند لہر نے سادہ صاف اور عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔اس سادگی سے ناول کے حسن میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس ناول کی منظر نگاری میں بہت ساری ایسی مثالیں دیکھنے کوملتی ہیں۔ جوناول نگار کی فنی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہے۔رانی کو جب سرحد سے جیل میں لایا جاتا ہے۔توناول نگار نے اس وقت جیل کے اندر ہورہے ظلم وستم کی دلکش تصویر کشی کی ہے۔ملاحظہ کریں۔

''رانی کوایک جگہ لیے جایا گیا جہاں ہر جگہ چیخ وپکار تھی۔لوگوں کو بے رحمی سے
مارا جاتا تھا۔ایسے سوال پوچھے جارہے تھے جن کا اِن کے پاس کوئی جواب
نہیں تھا۔رانی یہ دیکھ کر ڈر گئی۔اس جگہ پر رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بلکہ یہ
کہا جائے تو زیادہ ٹھیک ہوگا۔ کہ رحم یہاں گناہ تھا۔پاپ تھا۔ رانی نے
دیکھا کہ بڑے بڑے ڈنڈوں سے لوگوں کو مارا جارہا تھا۔ مار کھاتے ہوئے
اگر کوئی مر بھی جائے تو کسی کو کوئی پروانہ تھی ۔رانی نے یہاں صرف موت
کا کھیل دیکھا۔رانی حیرانی بھی اور پریشان بھی ہے۔کیونکہ اُسے یہ سب کچھ

---

[1]۔ آنند لہر۔سرحدوں کے بیچ۔ص۔۲۰

دیکھنا تھا۔ اور مجبوری بھی تھی دیکھنے کی۔ اس نے خدا سے صرف اتنا کہا۔

''اے بھگوان تو نے پودینہ کیوں بنایا'' ۱؎

سرحدوں کے بیچ مکالمہ نگاری:

دوسرے اجزا کی طرح مکالمہ نگاری بھی ناول کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہ ناول نگار ہاتھ میں اظہار خیال کا بہترین آلہ ہے۔ اور اس سے باقاعدہ فائدہ اُٹھانا بہت بڑا کام ہے۔ ناول نگار اپنے کرداروں کی زبان سے جو کچھ اس کا جی چاہے جو وہ ضروری سمجھے یا جو اہم جانے، ادا کرا سکتا ہے۔ اس کا صحیح برتاؤ، بروقت استعمال بہت بڑی کامیابی ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اسے مکالمہ نگاری پر پوری دسترس حاصل ہونی چاہیئے۔ ناول نگار کو چاہیئے کہ وہ اپنے کرداروں کے مکالموں میں وہ تاثیر پیدا کرے کہ قاری ناول کا پورا مطالعہ کرے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' مکالمہ نگاری کے اعتبار سے ایک عمدہ کامیاب اور مکمل ناول ہے۔ آنند لہر مکالموں کے ذریعے اپنا مقصد ظاہر کرنے میں پوری طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں مختلف قسم کے کردار ہیں اور ہر کردار اپنی اپنی زبان بولتا ہے۔ ناول نگار نے مکالمہ نگاری کے ذریعے اپنے ناول کو مزید دلچسپ اور اثر آمیز بنایا ہے۔ حالانکہ ناول کا اکثر و بیشتر حصہ مصنف نے اپنی زبانی پیش کیا ہے۔ اور کرداروں کی زبان بہت کم مکالمے ادا کرائے ہیں۔ تاہم جو کچھ بھی انہوں نے کرداروں کی زبانی کہلوایا ہے۔ وہ اس ماحول سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس ناول کے کرداروں کے مکالمے حقیقت پر مبنی ہیں۔ طرح طرح کے کرداروں سے مختلف قسم کے مکالمے ادا کرانے میں آنند لہر پوری طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ چند مکالمے ملاحظہ ہوں۔

''کیا کہا''۔ ایک سپاہی نے رانی کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں کچھ نہیں''۔ رانی نے آسمانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آسمان کی طرف کیا دیکھ رہی ہو تم۔ رانی نے سن کر زمین کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

۱؎۔ آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔ ۲۲

یہ کہہ کراس نے رانی کے مُنہ پرزور کا تھپڑ مارا۔ اورایک زور کی لات مارنے ہی لگا تھا کہ اُس کے افسر نے اسے آواز دی۔

''غلاماں غلاماں''، ''بولئے حضور''

''اس چڑیا کوفی الحال چھوڑ دو، آؤ ہاتھوں کی مالش کرلیں''۔

''آیا حضور''۔ ہ کہہ کر غلاماں نے پھر رانی کے مُنہ پرتھپڑ مارا،اور افسر کے پاس چلا گیا''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں جہاں ناول نگار نے پاکستانی جیلوں میں ہورہے ظلم وستم کی عمدہ مال پیش کی ہے۔ وہیں دوسری طرف وہاں کی زبان میں بھی مکالمے ادا کرائے ہیں جو اس بات کی روشن دلیل ہیں۔ کہ مصنف کوزبان وبیان اور مکالمہ نگاری پرمکمل دسترس حاصل ہے۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں''، میں تمھاری ہر بات مانوں گی''

''تم جتنا چاہو مجھے مار سکتے ہو''

''نہیں نہیں یہ نہیں کہہ دیا'' راجہ نے کہا۔

''کیوں تم کیا کہنا چاہتے ہو''۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس بیت سے مارو۔
تا کہ باہر پتہ لگے کہ میں تمھیں ماررہا ہوں''

مجھ پر تمھیں اتنا ترس کیوں آرہا ہے''۔ رانی نے پوچھا۔

''ترس نہیں پیار آرہا ہے''۔ راجہ نے کہا۔

''پیار بھی کوئی آنے کی چیز ہے''۔ رانی نے بات دُہرائی۔

''اصل میں آنہیں رہا ہے بلکہ ہورہا ہے''۔

''اگر ہمارے ملک الگ الگ ہیں تو پھر یہ سرحد پیار کرنے والے کوروکتی کیوں ہیں''۔ ۲۔

---

[1] ا۔ آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔۲۳۔۲۲

۲۔ آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔۳۲

آنند لہر نے پورے ناول میں سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اور کہیں بھی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ لہر صاحب کی زبان جتنی صاف اور سادہ ہے۔ اتنے ہی مکالمے دلکش اور دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قاری ناول سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید معصوم رضا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ناول'' سرحدوں کے بیچ''۔ کی کہانی تشفی بخش ہے جو آنند لہر کے مشاہدے، تجربے اور تخلیقی ذہن کا مرکب ہے۔ ناول انسانی زندگی سے بہت قریب ہے۔ اس کے کردار بھی حقیقی زندگی سے بالکل قریب ہیں۔ اس ناول کے تمام کردار سادہ ہیں۔ لیکن قاری کو بخوبی متاثر کرتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ انہوں نے اپنے عہد کے مسائل پر غور وفکر کیا اور اُن کو سیاسی وتہذیبی پس منظر میں سرحد پر آباد لوگوں کے فطری مسائل کو حل کرنے کے لیے سرکار اور سیاست دانوں کی توجہ مرکوز کرانے کی کوشش کی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی خوبصورتی سے سرکاری عملے اور سرحد پر تعیناتی فوجی لوگوں کی کارکردگی کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ جن کی اصلاح ضروری ہے ۔آنند لہر نے ناول کی بنیاد نفسیاتی حقیقت پر رکھی ہے۔ جس میں کردار کے ذریعے سماجی مسائل اور سرحدی افراد کی ذہنی اور جذباتی ترجمانی کی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ناول ''سرحدوں کے بیچ''۔ موضوع زبان وبیان ،منظر نگاری، جذبات نگاری یعنی تمام فنی گہرائیوں اور وسعتِ نظر کے اعتبار سے آج کے ترقی یافتہ دور اور مصروف زندگی کے مطابق ہے۔ جو اُردو ناول نگاری میں ایک بہترین اضافہ ہے''۔[۱]

۱۔ ڈاکٹر سید معصوم رضا۔ آنند لہر کا ناول۔ سرحدوں کے بیچ ایک جذباتی تخلیق۔ مشمولہ۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔۱۴۔۱۳

زبان وبیان۔ایک ناول کی کامیابی میں زبان وبیان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ناول کی زبان صاف اورعام فہم ہو، ناول میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح سے خوبصورت لباس انسان کو دیکھنے کے قابل بنادیتا ہے۔ اسی طرح سے خوبصورت زبان وبیان ناول کی دلکشی اوردلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔ مصنف اگر زبان کی آرائش پرتوجہ نہ دے تو قاری کے لیے ناول کو سمجھنا قدرے دشوار ہوجاتا ہے اور یہ بات ضروری ہوجاتی ہے کہ ناول کوسادہ زبان میں قاری کے سامنے پیش کرے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' زبان وبیان کے اعتبار سے ایک عمدہ ناول دکھائی دیتا ہے۔اس ناول کی زبان بہت سادہ اورعام فہم ہے۔ جس کی وجہ سے قاری ناول کوایک ڈیڑھ گھنٹے میں پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔لہر نے زبان وبیان کوبھی ایک نئے تجربے کے طورپراپنے ناولوں میں پیش کیا ہے جواُردو ناول کی لسانی تاریخ میں گراں قدراضافہ ہے۔مصنف نے اپنے گردوپیش کے ماحول اورمسائل کوبڑی خوبصورتی سے تکنیکی لوازمات کوبرتتے ہوئے ناول میں سمویا ہے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں آنند لہر نے بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔جس کی وجہ سے ناول کااسلوب پرکشش اورطرزتحریرمتاثرکن ہے۔ناول کی زبان بڑی حدتک قاری کواپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مصنف کوچونکہ سادہ زبان پردسترس حاصل ہے اس لیے انھوں نے ناول میں بعض اوقات سادہ مکالموں کااستعمال کیا ہے۔ مثلاً رانی کے کردار کے ذریعے مکالموں میں سادگی پیدا کی ہے، ملاحظہ ہوں چندایک مکالمے۔

''تو بہن تجھے مارتے ہیں'' رانی نے پوچھا
''کیوں نہیں کیوں نہیں'' ہرروز پٹائی ہوتی ہے'' گلشن نے کہا
''مگر کیوں'' رانی نے پوچھا۔''سچ اگلوانے کے لیے'' گلشن نے جواب دیا
''توتم سچ کیوں نہیں کہہ دیتی''
''سچ ہی توپسند نہیں ہے انہیں۔اب میں نے کہہ دیا کہ میں اسمگلنگ کرتی ہوں''۔[1]

---

[1]۔آنند لہر۔سرحدوں کے بیچ۔ص۔۳۱

ناول ''سرحدوں کے بیچ میں'' ثریا نام کی لڑکی بھی قید ہوتی ہے۔رانی جب ثریا سے قید کا سبب پوچھتی ہے۔کچھ اس انداز میں بات کرتی ہے۔

''مگر تم دوسرے ملک کے انٹیروگیشن سینٹر میں گئی کیسے'' رانی نے ثریا سے پوچھا

''جیسے تم آئی ہو''

''میں تو غلطی سے آئی ہوں''

''ہر عورت یہاں غلطی سے ہی آتی ہے''۔

''میں سمجھی نہیں'' رانی نے کہا

''میری کہانی ذرا مختلف ہے'' ثریا نے کہا۔

''سناؤ تو سہی''۔رانی نے پھر کہا''۔[1]

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' آسان اور سادہ زبان میں پایہ تکمیل پر جا پہنچتا ہے۔اگر چہ ناول کا کینوس وسیع نہیں ہے۔لیکن ناول ایک محدود زبان و مکان میں اپنی منزل مقصود تک جا پہنچتا ہے۔پورے ناول میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔سیدھی سادھی زبان میں آنند لہر کہانی کو بیان کر دیتے ہیں۔ناول میں انسانی احساسات و جذبات کا ادراک صاف دکھائی دیتا ہے۔حالانکہ ناول میں بہت سارے کردار ہیں۔اس کے باوجود بھی ناول اپنے ہر پڑاؤ پر قاری کو متاثر کر کے ایک تازگی کا احساس دلاتا ہے۔

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا تنقیدی جائزہ

آنند لہر کا دوسرا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے۔جو 1997ء میں منظر عام پر آیا ہے۔کشمیر کتاب گھر ریذیڈنسی روڈ جموں نے شائع کیا ہے۔آنند لہر کا یہ ناول ایک سو آٹھ (108) صفحات پر مشتمل ہے۔مصنف نے اس ناول کو کشمیر کی لڑائی میں مرنے والوں کے نام منسوب کیا ہے۔جنھیں سیکورٹی فورسز کے سپاہی یا اگر وادی کہا گیا ہے۔حالانکہ وہ بھی رشتوں، ناطوں سلسلوں میں باندھے تھے۔اور گھروں کے دروازے اُن کے انتظار میں کھلے تھے۔چنانچہ جو لوگ کشمیر کے حالات اور کشمیر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ناول کا سرسری مطالعہ

---

[1]۔آنند لہر۔سرحدوں کے بیچ۔ص۔۳۵

کرنے کے بعد اُن کے لیے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کہ یہ ناول کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ دار ہے۔

انتساب کے بعد کتاب کے اگلے صفحے پر ایک نعرہ درج کیا گیا تھا۔ جس کی گونج ریاست کے اطراف واکناف 1947ء سے لے کر عصرِ حاضر تک برابر سنائی دے رہی ہے۔ مصنف نے اس نعرے کو اپنی تخلیق کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد؟

ہندو مسلم سکھ اتحاد

دراصل ناول نگار نے یہ نعرہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر تحریر کیا ہے۔ یہ نعرہ مصنف کو اس قدر محبوب اور مرغوب ہے کہ اس کی تکرار ناول میں تھوڑے وقفے کے بعد آخر تک ملتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نعرہ اس ناول کی بکھری کڑیوں کو ملانے کا کام سرانجام دیتا ہے۔

ناول کا قصہ شروع ہونے سے پہلے ناول اور ناول نگار کے بارے میں تعارف کے طور پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا۔ آٹھ صفحات کا دیباچہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ جس میں انھوں نے آنند لہر کی ادب دوستی اور زیر بحث ناول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کہانی اور پلاٹ:

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ ناول مجموعی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ مصنف نے خود اس کی اس طرح سے تقسیم نہیں کی ہے لیکن دوران مطالعہ اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر ناول کو ابواب میں تقسیم کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ پیش کش کے انداز سے لگتا ہے کہ فن کار ایک خیال اور جذبے کے ہاتھوں مجبور ہے۔ جس کو اُس نے تمام شدت اور ولولے کے ساتھ پیش کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی ابتدا گولیاں چلنے سے ہوتی ہے۔ جس کے درمیان ''شیر کشمیر کا کیا ارشاد۔۔ ہندو مُسلم سکھ اتحاد'' کا نعرہ گونجتا ہے۔ زیر بحث ناول میں ان حالات وواقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو تقسیم ہند کے فوراً بعد کشمیر کی سرزمین پر قبائلیوں

کے ذریعے نمودار ہوئے۔علاوہ ازیں۔شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی دورِ حکومت کے پس منظر میں کشپ رشی کا وہ کشمیر بھی اُبھرتا ہے ۔ جو آپسی میل جول اور یگانگت کا علمبردار ہے۔ اس ناول کا پہلا حصہ 1947ء کے بعد کے کشمیر سے متعلق ہے۔اور دوسرا حصہ کشمیر میں علیحدگی پسند نوجوانوں کی جانب سے شروع کی گئی جنگ کے بارے میں ہے۔ ناول کا اختتام کشمیری مسلمانوں کے اس اتفاق پر ہوتا ہے کہ کشمیر سے ہجرت کیے ہوئے مہاجرین کو ''اگلی عید سے پہلے'' واپس کشمیر لانا ہوگا۔تا کہ عید کی خوشیاں دونوں طبقوں کے لوگ ماضی کی طرح مل جل کر منا سکیں۔ جہاں تک حالات و واقعات کا تعلق ہے ۔اس ناول کا تمام تانا بانا آزادی کے بعد کے کشمیر سے تیار کیا گیا ہے۔ مصنف نے اشاراتی و علامتی انداز میں اُن وجوہات کی نشاندہی بھی کی ہے جن کی بدولت کشمیر میں پُر آشوب دور کا آغاز ہوا۔ اور پھر مصنف نے دہشت گردی سے پیدا شدہ ہونے والے اُن حالات کا تجزیہ بھی کیا ہے جن سے عوام کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ چونکہ مصنف کو کشمیر سے دلی محبت ہے۔اس لیے سارے ناول میں محبت کا یہی جوش اور ولولہ کارفرما نظر آتا ہے۔

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کو پڑھ کر 1947ء سے 1997ء تک کی ایک لمبی تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔اس ناول میں آنند لہر نے کشمیریوں کی مذہبی رواداری اور مہمان نوازی کا احاطہ پیش کیا ہے۔ آنند لہر کو قبائلیوں کے خلاف شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی سر بہ کفن ہو کر نوجوانوں کے نکلنے اور ہندو مسلم سکھ اتحاد کے نعروں کی گونج سے عشق کی حد تک وابستگی ہے۔ اس ناول میں آنند لہر نے عبدل اور بدری کی صورت میں کشمیریوں کے آپسی بھائی چارے اور دوستی کی وضاحت کی ہے اور ہندو مُسلم سکھ اتحاد کے نعرے کو ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقتور قرار دیا ہے۔ قبائلی تو چلے گئے اور امن وچین ترقی اور خوشحالی کا دور شروع ہوا۔لیکن وقت نے پھر ایک بار کروٹ بدلی ۔ گولیاں چلنے لگیں۔ بم پھٹنے لگے۔ جیل خانے ایک بار پھر سے بھرے گئے ۔گھروں کے گھر خالی ہو گئے ۔ وہی کشمیر جہاں امن وامان کی فضا اور سیکولرازم کی روشنی تھی ۔ کشمیری پنڈتوں سے خالی ہو گیا۔ غرض یہ کہ تباہی و بربادی درپیش ہے۔ بدری نے کشمیر چھوڑ کر ریفیو جی کیمپ میں پناہ لی ۔ اِدھر دوسری طرف کئی نوجوان سرحد پار کر کے تربیتی کیمپوں میں پہنچ گئے۔

عبدل اور بدری نہ صرف ہندو و مسلم کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ آپس میں اچھے دوست بھی ہیں۔ عبدل

جموں کے رفیوجی کیمپ میں بدری کو تلاش کرنے کے بعد کشمیر واپس جاتا ہے۔لوگ عید کا چاند دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔اس موقع پر عبدل لوگوں سے وعدہ لیتا ہے کہ ''اگلی عید سے پہلے'' بدری کو کشمیر واپس لایا جائے گا۔تاکہ وہ لوگوں کو عید کے چاند کے نکلنے کے وقت بتا سکے۔اور کشمیری پنڈت بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔

ذکر کر چکا ہوں کہ اس ناول کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن دونوں حصے ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط نظر آتے ہیں۔اس ناول کا موضوع سیاسی ہے جس میں مصنف نے بڑی بے باکی سے حقائق سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کشمیر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ناول کے مطالعے سے جہاں ایک طرف خوشی کا موقع نصیب ہوتا ہے وہیں دوسری جانب تباہی کا منظر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

کہانی: ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی کہانی کی بنیاد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے نعرے ''شیر کشمیر کا کیا ارشاد۔ ہندو مسلم سکھ اتحاد جوانہوں نے قوم کو دیا تھا پر رکھی گئی ہے۔کہانی میں یہ نعرہ لگانے والا کوئی بہت بڑا دولت مند آدمی نہیں ہے۔بلکہ کلچے بنا کر بیچنے والا ایک غریب انسان ہے۔گاؤں کا ہر انسان اس کے بنائے ہوئے کلچوں کو بلالحاظ مذہب وملت کھاتا ہے۔

بدری گاؤں کا پجاری ہے۔گاؤں کا ہر شخص عبدل اور بدری دونوں کی بہت عزت کرتا ہے۔گاؤں کے تمام تر لوگ بڑے اتحاد سے رہتے ہیں۔یہاں پر اتحاد کی لاٹھی ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔گاؤں میں ایک جانب سے مسجد میں اذان گونجتی ہے تو دوسری جانب مندر کا شنکھ بجتا ہے۔

قبائلی گاؤں کے اتحاد اور آپسی بھائی چارے کو دیکھ کر کافی پریشان ہو جاتے ہیں۔یہ ان لوگوں کا اتحاد اور آپسی بھائی چارہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔انھیں ان لوگوں کو آپس میں لڑانے کا سب سے آسان طریقہ یہ نظر آتا ہے کہ لوگوں کو مذہب اور ملت کے نام پر لڑایا جائے۔ایک قبائلی ملازم غلام نامی آدھی رات و مندر سے شنکھ چوری کر لیتا ہے۔

صبح ہوتے ہی جب بدری مندر میں جاتا ہے تو شنکھ کی غیر موجودگی اُس پر ناگزیز گذرتی ہے۔وہ غش

کھا کر زمین پر گر جاتا ہے۔ عبدل اپنے بیٹے اسلم کو نماز پڑھنے کے لیے نیند سے جگاتا ہے اور کہتا ہے کہ شاید بدری آج شنکھ بجانا بھول گیا ہے۔ جب عبدل مندر میں پہنچتا ہے تو بدری کو بے ہوشی کی حالت میں پاتا ہے۔ شانتی جو بدری کی بیوی ہے سے عبدل بدری کی حالت کا سبب پوچھتا ہے۔ وہ یہ بات بتاتی ہے کہ قبائلی رات کو مندر سے شنکھ چُرا کر لے گئے ہیں۔ عبدل کے سمجھانے پر بھی بدری کی حالت میں کوئی سدھار نہیں آتا ہے۔

عبدل شنکھ کی تلاش میں نکل پڑتا ہے اور پورے گاؤں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ جب تک شنکھ نہیں ملتا تب تک وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ عبدل کے کافی تلاش کرنے کے باوجود بھی شنکھ نہیں مل پاتا۔ اُدھر سے بدری کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی اُس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ گاؤں کا ایک اہم فرد بدری کے گھر آتا ہے۔ اور اُسے صبر کرنے کو کہتا ہے۔ وہاں پر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ شانتی بدری کی بیوی بھی کافی دنوں سے بھوکی پڑی ہے۔

سلیمان حکیم کو لے آتا ہے۔ حکیم جانچ کر کے کہتا ہے کہ اس کو کوئی بھی بیماری نہیں ہے بلکہ کوئی گہرا دُکھ پہنچا ہے۔ یوں گاؤں میں بدری کے شنکھ کا چرچہ ہوتا ہے۔ اتنے میں ایک عورت ریشماں نام کی آتی ہے۔ وہ اپنے زیورات دے کر بدری کے لیے ایک نیا شنکھ لانے کو کہتی ہے۔ سلیمان ریشماں کو زیورات واپس کر دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ بدری کا شنکھ روزانہ کی طرح ایک دن دوبارہ ضرور بجے گا۔

دوسرے دِن سلیمان تمام لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو بند کر کے اوپر انگوٹھا رکھ دیتا ہے اور شنکھ کی آواز نکالتا ہے۔ اس طرح سے شنکھ کی آواز سُن کر نماز دوبارہ پڑھی جاتی ہے۔ شانتی کی حالت بھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے قبائلی مایوس ہو کر کشمیر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور ایک بار پھر آزادی کے نعرے کی گونج پوری وادی میں پھیل جاتی ہے۔ سکول تعمیر ہونے لگتے ہیں۔ سڑکیں بننے لگتی ہیں۔ جھیلوں کے اندر شکارے چلنے لگتے ہیں۔ کئی سال گذرتے گئے۔ اِدھر عبدل آرام سے بے فکر ہو کر سو جاتا ہے۔

یہاں پر ناول کا پلاٹ ایک نیا موڑ لیتا ہے اور کہانی موجودہ دور کی ملی ٹینسی پر آ پہنچتی ہے۔ عبدل اچانک بم کے دھماکے سے جاگ جاتا ہے۔ اور سارے کا سارا نقشہ بدلا ہوا پاتا ہے۔ عبدل کچھ لوگوں سے یہ

بات دریافت کرتا ہے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ تو لوگ کہتے ہیں کہ یہاں پر روز ایسا ہی ہوتا ہے۔عبدل دوبارہ اُن لوگوں سے کہتا ہے کہ کیا ہم پھر غلام ہو گئے ہیں۔تو لوگ اُس سے پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟

عبدل وہاں سے روانہ ہو جاتا ہے۔آگے چل کر ایک اسکول کی عمارت کو دیکھتا ہے۔وہاں پر کچھ لوگ شراب پی رہے ہوتے ہیں۔اتنے میں وہاں سے پولیس کا ایک دستہ گزرتا ہے اور اسکول کے لڑکے اُن پر فائرنگ کر دیتے ہیں۔اور فائرنگ میں ایک عورت زخمی ہو جاتی ہے۔عبدل اُسے ڈسپنسری لے جاتا ہے۔اور کچھ لوگوں کو وہاں بندوق لئے ہوئے دیکھتا ہے۔عبدل اُن سے پوچھتا ہے کہ یہاں پر پہلے ڈسپنسری تھی لیکن اب نہیں ہے۔وہ لوگ جواب میں اس عورت کو گولی مار دیتے ہیں۔عبدل اُس عورت کی موت پر بہت روتا ہے۔گولیاں دوبارہ چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔عبدل بھاگ کر بدری کے گھر چلا جاتا ہے۔لیکن گھر کو بند پاتا ہے۔اس کے بعد عبدل سلیمان کے گھر کا رُخ کر لیتا ہے تو اُسے وہاں پر اک نوکرانی کے سوا کوئی نہیں ملتا ہے۔عبدل اُس نوکرانی سے سلیمان اور اُس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔تو نوکرانی بتاتی ہے کہ بھابی تو گولی لگنے سے مر گئی ہے۔لڑکی کی عزت لُٹ گئی ہے اور لڑکے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔نوکرانی بتاتی ہے کہ جب سلیمان کی بیٹی کی عزت لوٹی گئی ۔ سلیمان کے دونوں بیٹے گھر میں نہیں تھے۔جب سلیمان کا چھوٹا لڑکا رشید گھر آیا تو اپنی بہن کی لاش دیکھ کر قبائیلیوں کے کیمپ میں چلا گیا۔قبائیلیوں نے اُسے بتایا کہ ہندوستانی فوجیوں نے تمہاری بہن کی عزت لوٹی ہے۔لیکن اُس نے ان قبائیلیوں پر کوئی بھروسہ نہ کیا اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ فوج میں بھرتی ضرور ہوں گا۔لیکن رشوت خوری کے سبب وہ فوج میں بھرتی نہ ہو سکا اور ملک کی جاسوسی کے جرم میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔اسی طرح سے عبدل نوکرانی سے سلیمان کے دوسرے بیٹے اکبر کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ قبائیلیوں کے ساتھ مل کر سرحد پار چلا گیا ہے۔

اس کے بعد عبدل یہ ارادہ کر لیتا ہے کہ وہ سرحد پار جائے گا۔ایک رات کو وہ موقع پا کر سرحد پار چلا جاتا ہے اور قبائیلیوں کے کیمپ میں سلیمان کے لڑکے اکبر کو پیٹتے ہوئے دیکھتا ہے ۔ مایوس ہو کر واپس چلا آتا ہے۔اگلی صبح عبدل ایک اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتا ہے۔اُس کی سرخیوں میں دس اگروادیوں اور دو پولیس والوں کے مرنے کی خبر ہوتی ہے۔یہ خبر جوں ہی عبدل پڑھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔اتنے میں دیکھتا ہے کہ

ایک بارہ سال کا خوبصورت لڑکا بھاگتا ہوا آرہا ہوتا ہے جس کی ٹانگ پر گولی لگی ہوئی ہے۔ عبدل اُسے روکتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہوا۔ جواب میں لڑکا بتاتا ہے کہ میں آزادی کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ آخرکار عبدل اپنے گاؤں کا رُخ کرتا ہے اور پیڑ کے نیچے بیٹھ کر زمین پر لکھنے لگتا ہے۔ ''ہندو مسلم سکھ اتحاد۔ زندہ باد''۔ گاؤں والے سارے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ لوگ عبدل کو کھانا کھلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن عبدل انہیں انکار کر دیتا ہے۔ اس پر لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم کیا چاہتے ہو؟ عبدل اُن سے کہتا ہے میں جو کچھ زمین پر لکھ رہا ہوں اُس کو پڑھو، لوگ پڑھنے لگتے ہیں۔ ''زندہ باد، زندہ باد، ہندو مسلم سکھ اتحاد''۔ اس عمل سے لوگوں میں ایک جوش و حوصلہ آتا ہے۔ عبدل ان لوگوں سے موجودہ حالات کے بارے میں پوچھتا ہے۔ پھر اگر وادِ پر بحث ہوتی ہے۔ حکومت پر تنقید کرنے کے بعد عبدل اُن لوگوں سے پوچھتا ہے۔ بتاؤ بدری کہاں ہے۔؟ تو لوگ اسے بتاتے ہیں کہ وہ جموں میں رہائش پذیر ہے۔ آخرکار عبدل جموں جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ عبدل سیدھا سرینگر بس اسٹینڈ پر جاتا ہے۔ اور جموں کی گاڑی میں بیٹھ کر جموں کو آپہنچتا ہے۔ یہاں پر وہ ایک ٹیکسی والے کو بلاتا ہے۔ ٹیکسی والے کی باتیں سن کر عبدل کو جموں کی پولیس اور نظام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عبدل ٹیکسی والے کو کشمیری پنڈتوں کے بارے میں پوچھتا ہے تو ٹیکسی والا عبدل کو سیدھا پنڈتوں کے کیمپوں میں لے آتا ہے۔ عبدل وہاں پر آ کر کیا دیکھتا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے بچے گندی نالیوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک ایک کمرے میں دس دس لوگ رہ رہے ہیں۔ عورتوں کے جسم بے ڈھنگے ہو گئے ہیں۔ اُن کے مُنہ پر گرمی کی شدت کی وجہ سے چھالے پڑے ہیں۔ عبدل ان لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہے۔ عبدل ایک شخص سے دریافت کرتا ہے کہ نواشی پورہ کا بدرؔی کہاں رہتا ہے۔ اس طرح سے عبدل کو بدرؔی کا پتہ مل جاتا ہے۔

عبدل دوڑتے ہوتے وہاں پہنچتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا وہاں پر بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ آنکھوں میں بینائی بھی کم ہے۔ کیونکہ وہ عبدل کو پہچان نہ سکا۔ اس طرح سے بدرؔی اور عبدل کا ملاپ دوبارہ ہوتا ہے۔ عبدل بدری سے بھابی کے بارے میں پوچھتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ ہسپتال میں داخل ہے۔ بدری اور عبدل دونوں ہسپتال میں شانتی سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے جانے سے پہلے ہی شانتی کی موت ہوگئی ہوتی ہے۔ عبدل اُس کے بعد اپنے گاؤں کشمیر واپس آجاتا ہے۔

جب عبدل اپنے گاؤں پہنچتا ہے تو بہت سارے لوگ باہر بیٹھے عید کا چاند آسمان پر تلاش کرر ہے ہوتے ہیں۔ کہ کل عید ہے بھی یا نہیں۔ آسمان پر بادل چھا جانے کی وجہ سے چاند سامنے آنے کے امکانات بہت کم ہوتے یں۔اس دوران ایک شخص بول پڑتا ہے۔ کہ پہلے اس بات کی کوئی مشکل نہ تھی ۔ کیونکہ بدری اپنی جنتری دیکھ کر عید کی تاریخ بتاتا تھا۔ اورمٹھائی والے بھی بدری سے پوچھ کر مٹھائی بناتے تھے ۔ یہ سب باتیں سن کر عبدل لوگوں سے کہتا ہے کہ ایک کام کرتے ہیں بدری کو ''اگلی عید سے پہلے'' واپس لائیں گے۔اس طرح سے کہانی اپنے اختتام تک پہنچتی ہے۔اس طرح سے ہی کہانی کا نام ''اگلی عید سے پہلے'' ہی منتخب کیا جاتا ہے۔

کردارنگاری:

چوں کہ کردارنگاری ناول کی جان ہوتی ہے ۔ اس لیے ناول کرداروں کے بغیر نامکمل اورادھورا ہوتا ہے۔ آنند لہر کا دوسرا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کردارنگاری کے حوالے سے ایک بہترین ناول ہے ۔ یوں تو حالات اورواقعات کے پیش نظر اس میں متعدد ضمنی کردار ہیں لیکن عبدل ، بدری ، سلیمان ، اکبراور رشید اس ناول کے اہم اور مرکزی کردار ہیں۔عبدل اور بدری دو ایسے کردار ہیں جن کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہے ۔ زیرنظر ناول کی .کردارنگاری کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد چند کرداروں پر مختصراً بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عبدل: عبدل ایک کلچے بنا کر بیچنے والا غریب انسان ہے۔جس کے دِل میں آزادی کی تڑپ ہے۔ کشمیر میں خوشیاں اور فارغ البالی کا خواہاں ہے۔ظلم وجبر واستحصال سے نفرت کرتا ہے۔فرقہ وارانہ ہم آہنگی، میل جول ،اور بھائی چارے کا علمبردار ہے۔آزادی کے بعد کشمیر میں خوشیاں اور تعمیر وترقی کے کاموں کو دیکھ کر وہ گھوڑے بیچ کر سو جاتا ہے۔لیکن جب کشمیر میں آزادی کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں تو وہ نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔وہ چونکہ ''ہندو مسلم سکھ اتحاد'' کا زبردست حامی ہوتا ہے۔اس لیے کشمیر میں موجودہ حالات سے پریشان ہو جاتا ہے ۔اسے کشمیر کے اطراف واکناف میں کوئی بھی ہم خیال نہیں ملتا ہے۔اُن میں کچھ تو آزادی کی لڑائی میں گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور کچھ جیل اور سرحد پار۔چنانچہ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ سرحد سے پار جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اور وہ وہاں جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ جہاں وہ ٹریننگ کیمپوں کا حال

دیکھتا ہے۔ واپس آ کر جموں میں مہاجرین سے ملتا ہے۔ جن کی پوری حالت دیکھ کر وہ مایوس ہو کر سری نگر واپس آتا ہے اور لوگوں کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے۔ کہ بدری کو اگلی عید سے پہلے واپس لایا جائے تاکہ آنے والی عید میں ہمارے ساتھ مل کر عید کی خوشیاں منائی جائیں۔

مختصر یہ کہ عبدل کا کردار ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا اہم اور مرکزی کردار ہے۔ ایک طرف یہ کردار وطن پرستی، حب الوطنی اور انسانیت کے جذبات سے ماخوذ ہے اور قارئین کے لیے ایک اہم سبق فراہم کرتا ہے۔ دوسری جانب مصنف کی شخصیت اور اُس کے دل میں چھپے ہوئے جذبات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

بدری: ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا دوسرا اہم کردار بدری کا ہے۔ جو ایک مندر کا پجاری ہے۔ بدری زیر بحث ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو علامتی انداز میں کشمیری پنڈتوں کا نمائندہ ہے۔ بدری کا شنکھ بجانے کا عمل مسلمانوں کی مسجد میں اذان دینے کے عمل سے ہم آہنگ ہو کر ناول میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بھائی چارہ، محبت اور اخوت کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ مصنف کی نگاہ اور سوچ میں دونوں قابل احترام عمل ہیں۔ ان کی بدولت عوام میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اور اُن کی عدم موجودگی میں بداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ مصنف کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ کشمیر کے موجودہ حالات اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ہندو اور مسلمان اپنے عقائد میں پکے نہیں ہیں۔ مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ بدری کی پوجا عبدل کی نماز کو مضبوط کرتی ہے اور اس کے برت اُن کے روزوں کی شان ہیں۔ اس لیے بدری کی کشمیر میں واپسی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر یہ آپسی بھائی چارہ مکمل نہیں رہتا ہے۔ اس سے لوگوں کا بھی خیال ہے کہ بدری کو کشمیر واپس لانا ہے۔

سلیمان: زیر بحث ناول کا تیسرا اور اہم کردار سلیمان ہے۔ سلیمان کی پرورش بدری کے باپ نے کی اور مندر میں اس کو پالا۔ کیونکہ سلیمان کے والدین بچپن میں ہی مر گئے تھے جب سلیمان جوان ہوتا ہے تو بدری کا باپ ہی اُسے بتاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کو روزہ اور نماز کی اہمیت بدری کے باپ نے ہی بتائی اور ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ اسلام کے اصول کیا ہیں اور سچا مسلمان کسے کہتے ہیں۔ زیر بحث ناول میں سلیمان کا کردار ایک کسان اور سماجی کارکن کا کردار ہے۔ جسے اُسی دن گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جب گاندھی جی شہید ہوتے ہیں۔

سلیمان کے دو بیٹے اکبر اور رشید بھی قاری کی توجہ کا باعث بنتے ہیں۔ اکبر کو سرحد پار جا کر دورانِ تربیت ناانصافی اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں جیل ہو جاتی ہے۔ جہاں سے وہ سرنگ بنا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پکڑا جاتا ہے۔ اِدھر رشید بھی رشوت، بے ایمانی، استحصال اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہو جاتا ہے اور وہ بھی سرنگ نکال کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے ۔اور پکڑا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس ناول میں بہت سے کردار ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کردار نگاری کے فن سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہے۔ یہ ناول جس مقصد کو مدِنظر رکھ کر لکھا گیا ہے وہ اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے نہایت عمدہ اور اعلیٰ ہے۔ اور فن کار نے بھی اپنا فریضہ بخوبی انجام دیا ہے۔

آنند لہر نے اپنے ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا تانا بانا جن حالات و واقعات اور کرداروں کی وساطت سے تیار کیا ہے۔ انھیں گھڑنے اور ڈھالنے میں مصنف نے بڑی ماہرانہ اور فن کارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے۔

زبان و بیان: ناول کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی زبان ہوتی ہے۔ زبان و بیان کا وہ جز ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ناول میں زبان و بیان جس قدر سادہ اور فطری ہو۔ ناول اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ زبان و بیان کسی بھی فن پارے کے لیے ایک ایسا آلہ ہے جو مصنف کی انفرادیت کو منعکس کرتی ہے۔

جہاں تک ناول ''اگلی عید سے پہلے'' میں زبان و بیان کا تعلق ہے۔ مصنف نے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آنند لہر کو زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے۔ زیرِ بحث ناول کا انداز بیان نہایت ہی موزوں ہے۔ مگر بعض جگہوں پر آنند لہر نے معروضی انداز سے کام لیا ہے ۔اس کی شاید سب سے بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ مصنف کا تعلق کشمیر کی سرزمین سے نہیں ہے۔ ورنہ لہر نے معروضی انداز بیان سے ناول کے محاسن اُجاگر نہ کیے ہوتے۔

آنند لہر چونکہ جدیدیت سے کافی متاثر ہیں۔ اس لیے اُن کے ہاں سادہ انداز بیان ملتا ہے۔ ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی زبان اور انوکھا انداز قارئین کو کافی متاثر کرتا ہے۔ اس ناول کا قصہ چونکہ کافی پھیلا ہوا ہے اور دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کرداروں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ایسے ناول میں رابطہ و تسلسل

ہرجگہ پرقائم رکھنا نہایت ہی مشکل کام ہے لیکن مصنف نے ہرجگہ سادہ اندازبیان استعمال کر کے اپنے مقصد کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

آنند لہر کے اندازِ بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ وہ ہر واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔ناول ''اگلی عید سے پہلے'' میں بھی اُن کا یہی انداز بیان جھلکتا ہے۔لہر صاحب نے بڑی فنی سوجھ بوجھ کے ساتھ ایک واقع کو دوسرے کے ساتھ ملایا ہے۔زبان اتنی سادہ اور حقیقی ہے کہ ہر منظر قارئین کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔کرداروں کی شخصیت کو واضح کرنے میں بھی انھوں نے فکری اندازبیان استعمال کیا ہے۔ انھوں نے کردار کی شخصیت کو اُس کی زبان کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔سادہ زبان وبیان کے ذریعے ہی اپنے کرداروں کے احساسات،جذبات کو نمایاں کیا کرتے ہیں۔

اس ناول میں لہر صاحب نے تشبیہات اور استعارات کا بھی جابجا استعمال کیا ہے۔چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

''ہر طرف گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔لوگ سہمے ہوئے تھے مگر ایک نعرہ روشنی بن کر اندھیرے کو مٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۔زندہ باد۔زندہ باد۔ہندو مسلم سکھ اتحاد''۔

''یہ نعرہ لگانے والا کوئی بہت بڑا دوکاندار،کارخانہ داریا لیڈر نہیں بلکہ کلچے بنانے والا عبدل تھا۔شاید اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر جو کہ وہاں کا حکمران تھا۔ حکومت کر کے اتنا خوش نہیں تھا جتنا کے عبدل کلچے بنا کر۔سب کچھ دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ انسان چاہے تو ذرہ حاصل کر کے بھی خوش ہوسکتا ہے اور نہ چاہے تو پہاڑ حاصل کر کے بھی نہیں''۔

''دُنیا کی ہر تہذیب میں میٹھا پسند کیا جاتا ہے۔مگر کشپ رشی کی اس دھرتی پر لوگ نمکین چائے پیتے ہیں۔یہاں پر نمک پسند کیا جاتا ہے۔شاید اسی لیے کہ اچھے آدمی کی یہ پہچان ہے کہ وہ نمک حرام نہیں ہوتا۔چونکہ نمک انسانی تہذیب کی پہچان بن گیا ہے۔اس لیے یہاں کی تہذیب اصل انسانی

> تہذیب کی نمائندگی کرتی نمکین چائے اور کلچے کھانے والا کتنا میٹھا نعرہ لگاتا ہے'' ''زندہ باد، زندہ باد، ہندو مسلم سکھ اتحاد'' ۔ ۱

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' میں مصنف نے طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے ۔ اور قوم کے لیڈروں پر طنز کے تیر بھی کسے ہیں۔

> '' آؤ سلیمان ۔ آج کل تو تمہارے درشن ہی نہیں ہوتے۔ بدری نے کہا۔ کیا کروں بھائی ۔ آج کل دن میں سونا پڑتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔'' سلیمان نے کہا۔
>
> '' وہ کیوں۔ ایسی کون سی مجبوری ہے۔ بدری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
>
> '' رات بھر نہرو ٹیلی فون کرتا رہتا ہے۔ مجھ سے صلاح و مشورہ کرتا ہے۔
>
> '' کہاں جانا ہے تمہیں، بدری نے پوچھا۔ کوئی انتظار کر رہی ہوگی'' عبدل نے طنزاً کہا۔
>
> ''نہیں بھائی یہ بات نہیں ہے ۔ سلیمان نے کہا۔ مجھے رات بھر ٹیلی فون پر نہرو سے بات کرنی ہوتی ہے۔ شیخ کو مشورہ دینا ہوتا ہے ۔ ہاں بھائی کشمیر کا ہر آدمی اب گاندھی اور آزاد سے کم بات نہیں کرتا۔ عبدل نے کہا۔'' ۲

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ لہر نے زبان و بیان کے ذریعے منظر نگاری، مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری، اور جذبات نگاری کے خوبصورت اور مکمل نمونے پیش کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباس۔

> '' اندھیرا کافی ہوگیا۔ مزے کی بات تو یہ بھی ہے کہ اندھیرے میں کشمیر زیادہ ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ اور یہاں کی گلیوں کے کتے بھی عجیب طریقے سے بھونکتے ہیں ۔ یہاں کے کتے جب بھونکتے ہیں۔

۲۔ آنند لہر۔ اگلی عید سے پہلے ۔ مانوی پرکاشن پنچ تیرتھی جموں۔ ص۔ ۹

تو لگتا ہے پوچھ رہے ہوں۔کہاں جانا ہے بھوکے تو نیں۔"

"کیسی بات ہے؟ سلیمان نے پوچھا۔کوئی خطرہ نہیں ہے۔

خطرے کی کوئی بات نہیں۔حکیم نے جواب دیا مگر بیماری لاعلاج ہے۔حکیم نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"مگر بہن شانتی کو بیماری ہے کیا؟، سلیمان نے پوچھا۔" شانتی کی بیماری سب جانتے ہیں"۔حکیم نے کہا۔"اور وہ بیماری ہے شنکھ"۔

سلیمان نے جواب دیا۔[۱]

۱۔آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے۔ص۔۲۴

"غلام آگے بڑھا تو اُس نے آہستہ سے مندر کا دروازہ کھولا۔اُسے کپکپی ہونے لگی ۔تھر تھر کانپنے لگا۔اُس نے دِل میں سوچا مندر کی بے حرمتی کرو یا مسجد کی۔کپکپی۔ایک ہی طرح سے ہوتی ہے۔اُس نے محسوس کیا کہ گناہ ہندو کرے یا مسلمان۔وہ گھبراتا ایک ہی طریقے سے ہے۔

غلام آہستہ سے مندر کے دروازے کے اندر گیا۔اس کی یہ حرکت اس کی آنکھوں نے پسند نہ کی۔اس کے اپنے ہی کانوں نے اس کے پاؤں کے خلاف احتجاج کیا مگر اس نے شنکھ چرالیا"۔[۱]

مختصراً یہ کہ لہر کے ناول "اگلی عید سے پہلے" میں دلچسپی کا سب سے اہم عنصر۔اس کی سادہ طرز تحریر ہے۔کہانی میں شروع سے آخر تک کوئی الجھاؤ نہیں۔جو قاری کی دلچسپی کو کم کرے۔آنند لہر نے اپنے انداز بیان کے ذریعے، ناول میں تجسس کو برقرار رکھا ہے۔مکالمہ نگاری، جذبات نگاری میں فطری اور حقیقی زبان و بیان کے ذریعے ناول کی اہمیت اور افادیت میں خاصا اضافہ کیا ہے۔

منظر نگاری: منظر نگاری ناول نگار کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جس سے کہانی میں زماں و مکاں کو سمجھنے

۱۔آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے۔ص۔۱۸

میں مدد ملتی ہے۔منظر نگاری کرداروں کے ساتھ آئے واقعات کی عکاسی کرتی ہے۔جس سے ناول میں تہذیبی اور معاشرتی جھلکیوں کی عکاسی ہوتی ہے اور پورے کا پورا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ ناول نگاری میں منظر نگاری کا حقیقی اور فطری ہونا لازمی ہے۔

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' منظر نگاری کے اعتبار سے اہم ناول کہا جا سکتا ہے۔اس میں واقعات کے ایسے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔جو فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

ناول کی ابتدا سے لے کر آخر تک منظر نگاری کے انمول نمونے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس ناول کی اہم خوبی اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ناول میں جتنے بھی مناظر پیش کیے گئے ہیں۔اُن میں اختصار برتا گیا ہے۔یہ اقتباس دیکھیے۔

> ''اسلم اُٹھا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔ اِدھر مسجد سے آواز آئی۔''اللہ اکبر'' پھر مندر کے اندر شنکھ بجا۔لگا کہ شنکھ اذان کی تائید کر رہا ہے۔گویا کہہ رہا ہو یہی سچ ہے اور اللہ ہی اکبر ہے۔ پھر مسجد سے آواز آئی۔ اللہ اکبر۔ پھر مندر کے اندر شنکھ بجا۔گویا کہہ رہا ہو۔میں نے کب انکار کیا۔محسوس ہوتا ہے کہ ساری دُنیا کا مرکز سورج ہے اور چاند سورج سے روشنی لیتا نہیں بلکہ دھرتی کو روشن کرنے کے لیے چراتا ہے''۔[۱]

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' میں جب بدری کا شنکھ مندر سے چوری ہو جاتا ہے تو پورے گاؤں میں ماتم طاری ہو جاتا ہے۔اس کی عکاسی لہر صاحب کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''گاؤں اس طرح پریشان لگنے لگا جیسے اس کے موسم اس سے چھین لیے گئے ہوں۔محسوس یوں ہوا۔جیسے پھولوں کو کھلنے سے روک کے رکھا ہو۔ہر شخص پریشانی کے عالم میں تھا۔کوئی مرا نہیں تھا۔ عام لوگوں کے لیے شنکھ گم ہو جانا شاید کوئی معمولی بات تھی مگر اس گاؤں کے لیے جیسے گاؤں کو ہی کوئی

۱۔ آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے۔ص۔۱۲

چرا کر لے گیا ہو''۔ا

مندرجہ بالا اقتباس میں لہر نے کشمیر کی آپسی رواداری اور بھائی چارے کی بے حد حقیقی تصویر کھینچی ہے ۔جو شخص بھی کشمیر کے حالات سے ہم آہنگ ہے۔خاص کر اُن کے لیے یہ مناظر کافی متاثر کن ہے۔

''بدری نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔وہ دِن بھر سویا رہتا اور رات بھر وہ گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہتا۔چیختا، چلاتا۔گاؤں کے کتے بھی رات کو عجیب طریقے سے بھونکتے۔سارا گاؤں سنسان نظر آتا۔شنکھ کیا گم ہو گیا تھا جیسے گاؤں کے جذبے گم ہو گئے ہوں۔لگتا ہے کہ کشمیر کے سینے پر ایک زخم پیدا ہو گیا ہو۔ وقت بیت رہا تھا مگر لگتا تھا کہ لوگ بیت رہے ہیں۔۔۲

آنند لہر نے نہایت ہی اختصار سے کام لیتے ہوئے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس نوعیت کے بہت سے مناظر ناول میں ملتے ہیں۔جن کو مختصر مگر سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

حقیقی مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری سے بھرپور ناول ہر واقع اور ہر کردار کے جذبات کی صحیح تصویر کشی کا غماز ہے۔

جب عبدل،اکبر کو تلاش کرنے بارڈر کے اُس طرف جاتا ہے تو لہر نے تربیتی کیمپوں اور وہاں پر دیئے جانے والے درس کی عکاسی حقیقی الفاظ میں کی ہے۔

''عبدل تنگ آکر ساتھ والے کیمپوں کے اندر چلا گیا۔چونکہ یہ کیمپ بھی پہلے کیمپ کا ہی ایک حصہ تھا۔اس لیے عبدل کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ عبدل نے دیکھا کہ پٹھان کشمیری لوگوں کو ایک نقشہ دکھاتے ہوئے سمجھا رہا تھا کہ کس طرح وہ لوگ مندر میں بم رکھیں گے۔لوگ زخمی ہوں گے اور وہ مسجد پر مار کریں گے۔اور اس سے وہاں پر ایک بہت بڑا فساد ہوگا''۔ا

ا۔آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے۔ص۔۲۰

۲۔آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے۔ص۔۱۴۔

چونکہ لہر کشمیر کی زندگی سے کافی واقفیت رکھتے ہیں اور یہاں کی زندگی کا کافی زیادہ ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ کشمیر کی عام زندگی کی عکاسی بھی حقیقی اور فطری انداز میں کی ہے۔ غرض لہر نے ''اگلی عید سے پہلے'' میں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں جو قارئین کو کافی حد تک یہاں کی حقیقی زندگی سے روشناس کراتے ہیں۔

ملک کی آزادی کے بعد کشمیر میں جو خوشحالی کا جو دور گذرتا ہے۔ لہر صاحب نے اُس کی عکاسی یوں کی ہے۔

> ''ادھر کشمیر میں آزادی کے گلاب نے اپنی خوشبو پھیلانا شروع کر دی۔ اسکول تعمیر ہونے لگے۔ سڑکیں تعمیر ہونے لگیں۔ مندروں میں پوجا ہونے لگی۔ مسجدوں میں سج دھج کر لوگ نماز پڑھنے لگے۔ ہوائیں جھومتی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔ تھیٹروں میں ڈرامے دیکھنے والوں کا رش، مشاعروں میں واہ واہ کی آوازوں نے کشمیر کے حُسن کو اس طرح سنوارا جس طرح خوبصورت دوپٹے کو کناری سنوارتی ہے''۔[۲]

جہاں تک ایک طرف لہر صاحب خوشحال اور ترقی یافتہ کشمیر کی عکاسی کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہیں لٹے ہوئے اور برباد کشمیر کا نقشہ بھی کامیابی کے ساتھ سامنے لایا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

> ''عبدل اسکول کے پاس چلا گیا۔ اُس نے دیکھا باہر تو اسکول کا بورڈ لگا ہوا ہے مگر اسکول کی عمارت ٹوٹی ہوئی ہے۔ کچھ جوان وہاں پر بیٹھ کر شراب پی رہے ہیں۔ وہ تمام لوگ ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس کو انھوں نے شراب پی کر بہت سی جگہوں سے کاٹا ہوا ہے۔ اور چارپائی پر ایک چادر ہے جو بہت سی جگہوں سے پھٹی ہوئی ہے۔ عبدل کو لگا جیسے

---

[۱] آنند لہر۔ اگلی عید سے پہلے۔ ص۔ ۶۵

[۲] آنند لہر۔ اگلی عید سے پہلے۔ ص۔ ۳۵

ہندوستان چارپائی ہواور کشمیر چادر"۔[1]

اختصاراور سادہ زبان میں مکالمہ نکاری اور جذبات نگاری حقیقی وفطری نمونے پیش کیے ہیں۔ منظر نگاری کے علاوہ مکالمہ نکاری اور جذبات نگاری کا موضوع مناسب استعمال کیا گیا ہے۔ جو کرداروں کی شخصیت واضح کرتے ہیں۔

اس ناول میں لہر نے یہاں کے لوگوں کے جذبات واحساسات کو بڑی چابکدستی سے قلم بند کیا ہے۔

[1]۔آنند لہر۔اگلی عید سے پہلے۔ص۔۳۸

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کا تنقیدی جائزہ

آنند لہر کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ہے جو 2005ء میں کلاسیک آرٹ پرنٹر دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ناول ایک سوانیس صفحات پر مشتمل ہے۔ آنند لہر صاحب نے اس ناول کو اپنی چھوٹی بہن ببلی کے نام منسوب کیا ہے۔ جو بہت کم عمری میں ہی اس دُنیا فانی سے کوچ کر گئی۔ اس ناول کا دیباچہ پروفیسر ظہور الدین نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر ناشر کا ایک مختصر مضمون ہے جس میں ناشر نے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' پر اظہار خیال کیا ہے اور ناول کے پس منظر میں آنند لہر کی شخصیت اور فن کو اُبھارا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں پروفیسر ظہور الدین نے آنند لہر کو اُردو فکشن کی ایک اُبھرتی ہوئی آواز تسلیم کیا ہے اور ان کی ادب دوستی کو سراہا ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔

> ''آنند لہر ریاستی اُردو فکشن پر ابھرتی ہوئی ایک نئی آواز ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک نامور ایڈووکیٹ ہونے کے ناطے آپ کی مصروفیات کا جو عالم ہے۔ وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اپنی دلچسپیوں خصوصاً ناول وافسانہ کے لیے آپ کس طرح وقت نکال پاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے''۔[1]

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' علامتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے عام قاری اسے سمجھنے میں قاصر رہتا ہے۔ لیکن پروفیسر ظہور الدین کے مختصر دیباچہ کو پڑھنے کے بعد یہ معلومات صراہم ہو جاتی ہے کہ ناول نگار کے ناول لکھنے کا مقصد کیا ہے۔ دیباچہ کے بعد آنند لہر نے فراق گورکھپوری کا یہ شعر قلم بند کیا ہے۔

سنا ہے ایسے میں پہلے بھی بجھ گئے ہیں
دِلوں کی خیر مناؤ بڑی اُداس ہے رات

مذکورہ بالا شعر آنند لہر کے ذہن تک ہماری رسائی کرتا ہے اور اُن کی شخصیت کو نمایاں کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ آنند لہر چونکہ ایک سادہ طبیعت، نفیس، شفاف اور دردمند دِل رکھنے والے انسان ہیں

---

[1]۔ پروفیسر ظہور الدین۔ ایک نئی آواز، مشمولہ مجھ سے کہا ہوتا۔ ناشر اُردو بک سوسائٹی۔ نئی دہلی۔ 2005۔ ص۔ 5

۔ضرورت مندوں ،غریب غرباء کی مدد کرنا وہ اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی اکثر و بیشتر تحریریں انسانی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ جس کی مثال اُن کا یہ ناول بھی ہے۔ فراق گورکھپوری کے اخلاقی اور اصلاحی شعر کے بعد آنند لہر نے چند سطریں اگلے صفحے پر درج کی ہیں۔ جو ایک بار پھر سے اُن کی شخصیت اور انسان دوستی کو منعکس کرتی ہیں اور ایک اخلاقی درس دیتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''عراق میں رہنے والے لوگوں کا لہو بھی عام انسانوں کے خون کی طرح
لال تھا اور لڑائی میں مارے جانے والے سپاہیوں کا بھی''۔[1]

آنند لہر اس ناول کے ذریعے یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ انسان کو رنگ و نسل، لسانی، علاقائی اور مذہبی عقائد پر تفریق کو مٹا کر آپسی بھائی چارے کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ وہ مختلف ممالک کے درمیان ہونے والی جنگوں کو انسان کی تباہی قرار دیتے ہیں۔

پلاٹ: ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں آنند لہر نے جنگ کے اسباب، جنگ کی تباہ کاریاں اور جنگ کے بعد ہولناک مناظر کی عکاسی کی ہے۔ یہ عکاسی چرندوں، پرندوں کی گفتگو پر مبنی ہے۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' پرندوں اور جانوروں کی زبانی تباہی و بربادی کے اس المیے کو پیش کیا گیا ہے۔ جن میں حال، ماضی اور مستقبل سبھی زمانے شامل ہیں۔ یونان کے طنز نگار ارسطو فانینس نے ''پرندے'' میں جس طرح زبان طیور سے یونانی سماج اور تہذیب و تمدن کی عکاسی کی تھی۔ آنند لہر نے بھی اسی روش کو اپنا کر جنگ عراق و امریکہ میں ایک نیا منظر نامہ دکھایا ہے کہ انسان نے اپنی جنونی عقل کو تسکین دینے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ کبھی اسلحہ سازی کی۔ کبھی بم بنائے۔ و کبھی تباہ و برباد کر دینے والی چیزیں۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرتِ انسان نے تباہی و بربادی کے نام پر نہیں کیا ہے بلکہ انسانوں کو بچانے کے لیے اور دُنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے نام پر کیا ہے۔ مگر دُنیا غیر محفوظ بنتی گئی اور انسانوں کی جانیں اور اُس کے خون کی کوئی واقفیت نہیں رہی
ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں آنند لہر نے پرندوں کے حوالے سے مکالماتی انداز میں انسان کی جنونی کیفیت، جنگ میں لڑنے بھڑنے وجدال کی کیفیت بیان کی ہے۔ اس میں نہ صرف انسان بلکہ اس روئے

---

[1]۔ آنند لہر۔ مجھ سے کہا ہوتا۔ ص۔ ۱۱

زمین پر رہنے والی تمام مخلوقات اس سے متاثر ہوتی ہے۔اس ناول کو پڑھنے کے بعد قاری کی نظر میں افغانستان اور عراق کی تباہی کے مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ جہاں پر ایک سُپر پاور نے طاقت کے نشے میں آکر یک طرفہ طور پر ملک کو آزاد کرانے کے نام پر اسے جہنم میں جھونک دیا۔ انسانی وسائل کو پارہ پارہ کر کے برباد کر دیا۔ ہر کہانی یا ناول اگر چہ عام ادوار کی تباہ کاریاں بیان کرتا ہے لیکن اِس ناول کا پس منظر موجودہ حالات ہیں۔اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بارودی جنگ سے نہ صرف انسان تباہ ہوتا ہے بلکہ چرند پرند اور روئے زمین پر پیدا ہونے والے نباتات، حیوانات اور ماحولیات کی بربادی بھی ہوتی ہے۔

کہانی: یہ ناول اصل میں امریکہ کی طرف سے بلاوجہ عراق پر حملے اور جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اور جنگ کے بعد جو ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے تباہ کاریاں سامنے آتی ہیں ان کا بھر پور نقشہ کچھ اس طرح سے کھینچا ہوا ہے۔

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کی شروعات زمین کے اس حصّے سے ہوتی ہے۔ جہاں پر لڑائی کے بعد کوئی بھی انسان زندہ نہیں رہتا۔ درخت جل کر ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ جانور اس بم باری کی وجہ سے ختم ہوتے ہیں ۔بموں کی وجہ سے ہوا میں زہر پھیل چکا ہوتا ہے۔اور دریاؤں کا پانی بھی سوکھ چکا ہوتا ہے۔ دور دور تک زندگی کا کوئی نشان نہیں ۔اتنے میں وہاں پر ایک چڑیا آتی ہے اور حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے کہ یہ کیا ہوا ہے۔ اُسے دیکھ کر ایک اور چڑیا انسانوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔جن میں سے کسی کا سر نہیں ہوتا تو کسی کی ٹانگ یعنی ہر ایک انسان کے جسم کا کوئی نہ کوئی حِصّہ ضرور ختم ہوا ہوتا ہے۔جس سے اُنھیں اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ انسانوں نے آپس میں جنگ لڑی ہے۔ان چڑیوں کو دیکھ کر باقی پرندے اور جانور بھی وہاں پر اکھٹے ہو جاتے ہیں جن میں ہاتھی سے لے کر چوہے تک شامل ہیں۔وہ انسان کی اس حماقت پر بہت طنز کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے سوالات ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ جیسے کہ انسان زمین کے لیے کیوں لڑتا ہے۔ انسان خود ہی اِن ہتھیاروں سے ختم ہوتا ہے تو وہ ہتھیار کیوں بناتا ہے۔اس طرح کے سوالات ان جانوروں کے ذہن میں اُٹھتے ہیں۔جن کے جوابات کا وہ حل ڈھونڈنے کے لیے تمام جانور ایک شیر کے پاس جاتے ہیں ۔ جو اپنی غار کے باہر بیٹھا ہوتا ہے۔ شیر کے ساتھ ان کی بحث ہوتی ہے کہ ہر بڑی چیز چھوٹی چیز کو ختم کیوں

کرنا چاہتی ہے۔ یہ بحیثیت ابھی جاری ہوتی ہے کہ کہیں دور سے کسی کے کراہنے کی آواز آتی ہے۔ یہ آواز سن کر سارے جانور حیران و پریشان اُس جگہ جاتے ہیں اور وہاں پر دو آدمیوں کو زخمی حالت میں پاتے ہیں۔ انکے نزدیک ہی چند مردہ عورتوں کے ننگے جسم پڑے ہوتے ہیں ۔ یہ تمام جانور مل کر اِن عورتوں کے جسموں کو ڈھانپتے ہیں اور زخمیوں کو پانی پلاتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے اُن نیم مردہ آدمیوں میں ہوش آتی ہے۔ اور وہ آدمی آپس میں باتیں کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ تمام جانور اور پرندے بھی اُن کی باتوں پر غور وفکر کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام ساحل اور دوسرے کا نام گُل ہوتا ہے۔ دونوں الگ الگ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اب وہ اس مقام پر کھڑے ہوتے ہیں ۔ جہاں پر اُنھیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آخر اِن کے درمیان لڑائی کس بات کی تھی۔ ان سب باتوں کے علاوہ اب وہ ایک دوسرے کی ضرورت بن چکے تھے کیونکہ اس لڑائی میں ساحل اندھا ہو جاتا ہے۔ اور گل لنگڑا۔ تو وہ چلتے تھے۔ وہاں پر پرندے اُن سے ہزاروں قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ اور انسانوں کی اس شرمناک حرکت پر طنز کے تیر بھی پھینکتے ہیں۔ اسی وقت آسمان سے ایک جہاز اُترتا نظر آتا ہے۔ جب یہ جہاز زمین پر اُترتا ہے تو اس میں سے چار لوگ باہر آتے ہیں۔ جن میں موہن، راکیش، مریم اور کپل شامل ہیں۔ یہ سارے لوگ زمین پر اُترتے ہی سوال کرتے ہیں کہ "یہ کیا ہوا"۔ پھر اُن لوگوں کو تفصیل سے بات بتائی جاتی ہے کہ کس طرح سے لڑائی شروع ہوئی۔ جہازوں نے بم گرائے۔ ٹینکوں کو استعمال کیا گیا۔ اور زمین سے زندگی کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

یہ ساری باتیں سن کر وہ ایک دوسرے سے بحث کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی ایک لڑکے کے پیچھے دوڑتی ہوئی کہتی ہے ۔رُکو میں تمہاری رانی ہوں۔ یہ تمام انسان، حیوان اور چرند پرند اُسے روکتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ بھاگ کیوں رہے ہو؟ وہ لڑکا اپنے تمام ہتھیار پھینک کر رُک جاتا ہے اور اُن سے کہتا ہے کہ مجھے ایسا ہی حکم ملا ہے۔ کہ جب تک میرے پاس ہتھیار تھے۔ میں کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ لڑکا رانی کو گلے سے لگاتا ہے۔ دونوں محبت کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ رانی اس تھیلی کو کھولتی ہے جو اس لڑکے کو جنگ میں ساتھ ہوتی ہے۔ اُس تھیلی میں سے ایک خط نکلتا ہے۔ جس میں لکھا ہوا ہے کہ راکیش تم

سہاگ رات والے دِن ہی چلے گئے تھے۔ میرے ہاتھوں کی چوڑیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔

رانی راجہ سے دریافت کرتی ہے کہ راکیش کا کیا ہوا۔ راجہ جواب دیتا ہے دُشمن تھا۔ مار دیا۔ یہ بات سُن کر رانی کو غش آجاتا ہے اور وہیں پران تیاگ دیتی ہے۔ یہ واقعہ دیکھ کر سارے پریشان ہو جاتے ہیں۔ گُل کو اپنا وقت یاد آتا ہے۔ جب اس کی بیوی نے اسے الوداع کہا تھا۔ اور دوسری طرف ساحل بھی رانی کی لاش کو دیکھ کر اپنی بیوی کو پیار کرتا ہے۔ وہ وہاں پر باتیں ہی کر رہے تھے کہ اتنے میں گل کا بیٹا اور ساحل کی بیٹی دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور گُل اور ساحل سے گلے ملتے ہیں۔

اس کے بعد یہ دونوں بچے پوری کہانی سناتے ہیں کہ ماں کس طرح مری۔ گھر کیسے جلا۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور محبت کی دُنیا میں گم ہو جاتے ہیں اور سارے جانور اور انسان یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اُن کی شادی ہونی چاہیئے اور محبت کو بڑھنے سے روکنا نہیں چاہیئے۔ باتیں ابھی چل ہی رہی ہوتی ہیں۔ اتنے میں ایک اژدھا ان سے وہی سوال کرتا ہے کہ آخر یہ تباہی کیوں ہوئی ہے۔ اُس کو بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص جس کے پاس کچھ زہریلے ہتھیار تھے اس کو مارنے کے لیے بم گرائے گئے۔ اور ٹینک چلائے گئے۔ سانپ حیران ہو کر کہتا ہے کہ ان بیوقوفوں کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں اُسے ڈنگ مار کر اپنے زہر سے مار ڈالتا۔ اسی بات سے ہی کہانی کا نام ''مجھ سے کہا ہوتا'' چُن لیا گیا۔ اس طرح سے کہانی اپنے اختتام پر آ پہنچتی ہے۔

کردار نگاری: آنند لہر کے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں چند ایک انسانی کردار دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر چرند پرند۔ چیل۔ کوا۔ بلبل۔ مینا شیر۔ ریچھ۔ خرگوش۔ ہاتھی، کُتا، چوہا اور چیونٹی وغیرہ اِس ناول کے اہم کردار ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس ناول کے چند انسانی کرداروں میں گُل، جان، راکیش، موہن، راجہ، رانی، اور راقمہ ہیں۔ لیکن یہ تمام تر کردار ذیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس کہانی کو آگے بڑھانے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

آنند لہر نے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں کردار نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ ایسی بات اس ناول میں شاید اس لیے ہے کہ لہر صاحب کا مقصد قارئین کو کرداروں سے متاثر کرانا نہیں تھا۔ بلکہ اس موضوع

کے بارے میں غور وخوض کرنے کے لیے مجبور کرنا ہے جو دراصل اس ناول کی تخلیق کا موجب بنا ہے۔ انھوں نے موضوع کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کردارنگاری پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاید اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر زیر بحث ناول میں کردارنگاری پر زیادہ توجہ دی جاتی تو قارئین کرداروں کے نقل وحرکت میں اس قدر کھو جاتے کہ وہ ناول کے اصل مقصد کو نہیں سمجھ پاتے۔

مختصر یہ کہ لہر صاحب نے کردارنگاری کی طرف توجہ نہ دے کر اپنا فن اپنے مقصد کو سامنے لانے میں استعمال کیا ہے اور مکالموں کے ذریعے اپنی بات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

زبان وبیان: اس ناول کے تمام کرداروں اور واقعوں کی پیش کش کا وسیلہ زبان وبیان ہے۔ کرداروں کی حرکات وسکنات، بول چال اور جذبہ وفکر کو زبان وبیان ہی سامنے لاتی ہے۔ کرداروں کی بات چیت اور واقعوں کی اظہار کی زبان صاف سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ فکشن کی زبان کے بارے میں مغربی ناقدین کی یہ رائے ہے کہ اس میں بناؤ سنگار نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ قاری کی توجہ اصل موضوع سے یعنی کہانی یا واقعات سے بھٹک کر زبان کی آرائش میں اُلجھ جاتی ہے۔ اس لیے فکشن نگار کا فرض ہے کہ صاف اور سادہ زبان استعمال کرے۔

زبان حقیقت میں وہ بنیادی عنصر ہے جس پر واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، کردارنگاری، جذبات نگاری کا پورا دارومدار ہوتا ہے۔ صاف وسادہ اور عام فہم زبان اِن اجزاء کو خوبصورتی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

آنند لہر کا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' مختلف انسانی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ جو ملکی نہ ہو کر آفاقی نوعیت کے حامل ہیں۔ ملکوں کی آپسی رنجش، نسلی امتیازات، انسانی رشتوں کا زوال اور اُن کی بے حرمتی، طاقت کا استعمال، امیر قوموں کے ہاتھوں غریب قوموں کا استحصال، انسان کی کم ظرفی، خودغرضی، بارود کے دھویں سے زمین پر نازل ہونے والی تباہیاں، ماحولیاتی رقابتیں، ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ اور اُن سے ہونے والے خطرات وغیرہ۔

یہ موضوعات جتنے اہم ہیں۔ آنند لہر انھیں اتنے ہی موثر لیکن سیدھے سادھے انداز میں اور زبان میں پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے بہت سی ادنی حقیقتوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے۔ انسانی فطرت

کا ایسا ننگا ناچ شاید ہی کسی ایک جگہ دیکھنے کو ملے۔

مختصراً آنند لہر کے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کی زبان نہایت ہی تخلیقی اور نپی تلی ہے۔ جس سے ناول میں دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اسلوب بیان بھی نہایت ہی عمدہ ہے۔

مکالمہ نگاری: مکالمہ نگاری اصل میں ناول نگاری کی جان ہے۔ مکالمہ نگاری کے بغیر کوئی بھی ناول اپنے اصل وجود میں ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ناول نگاری میں مکالمہ نگاری ایک اہم عنصر ہے۔ چونکہ لہر پیشے سے وکیل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے جذبات، احساسات و تجربات کو نہایت ہی پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ لہر نے اُن تمام واقعات و حالات کا محاصرہ کیا ہے جو ماضی میں رونما ہوئے ہیں۔ خصوصاً جنگ عظیم اور افغانستان و عراق میں وحشت ناک بمباری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسانی جانوں کا اتلاف۔ آنند لہر نے انسانی فطرت اور منفی سوچ کو ایسی مسافرت اور ایک دوسرے کا احترام نہ کرنے کو نہایت موثر مکالموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔ چند مکالمے۔

''انسان جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کرتے''۔

''لڑ پڑتے ہیں۔ چمیلی نے سوال دہرایا۔

''کیونکہ وہ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹے رہتے ہیں۔ وہ رائے کو اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ کس ملک کا نمائندہ رائے دے رہا ہے۔ اس ملک کے پاس ایٹم بم کتنے ہیں۔ ہائیڈروجن بم کتنے ہیں۔''

''مگر کتنا بدقسمت ہے انسان جو زمین کے لیے لڑتا ہے۔ جو کبھی بٹ نہیں سکتی اور جو زبانیں و مذہب زمین کو خوبصورت بناتے ہیں اُن کے لیے لڑتا ہے''۔

ان مسئلوں میں اُلجھنے کے بجائے صرف پیار کیے جاؤ۔ کیوں کہ زندگی مختصر ہے۔ رحم، سوچ، سمجھ، فکر و خیال یہ انسانی اوصاف ہیں۔

ایٹمی تجربوں نے میرے میں کھڈے پیدا کردیئے۔ برف گرم ہوگئی۔ اور ریگستان گرمیوں میں ٹھنڈے ہوگئے۔

''سنو دُنیا ایک اکائی ہے اور اس بات کو مان کر ہی جیو'' ۱؎

۱؎ ۔آنند لہر۔ ''مجھ سے کہا ہوتا'' ۔ص ۔۵۲

انسان کو کبھی بم نہ بنانے چاہیئے تھے۔ درختوں کو نہ گرانا چاہیئے تھا'' ۔۱؎

''دیکھو جنگ کا انجام'' ۔ہوا۔ پانی پانی نہ رہا۔ اور انسانی زندگی جیسے ایک فضول سے چیز ہو'' ۔۲؎

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنند لہر نے نہ صرف موجودہ دور کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے بلکہ وہ ماضی پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ماضی کے موضوعات پر قلم اُٹھا کر اسے بڑے معروضی انداز میں یوں پیش کیا ہے۔ جیسے کوئی ایک وکیل اپنی عدالت میں موثر اور مدلل انداز میں پیش کرتا ہے۔ اور جانتا ہے کہ اس کی کامیابی اس کی جذباتی وابستگی میں نہیں بلکہ اُن فکری وجوہات میں ہے جو کسی جج کو متاثر کر سکتی ہے۔ اس لیے لہر اس ناول میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے اُن تمام واقعات کا سہارا لیتے ہیں ۔جو ماضی میں رونما ہوئے ہیں۔

۱؎ ۔آنند لہر۔ مجھ سے کہا ہوتا۔ ص ۔۳۷

۱؎ ۔آنند لہر۔ مجھ سے کہا ہوتا۔ ص ۔۲۴

''ناول یہی سچ ہے'' کا تنقیدی جائزہ

آنندلہر کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' 2008ء میں منظر عام پر آیا۔134 صفحات پر مشتمل یہ ناول اُردو بک سوسائٹی ۹۲۲ روہیلا اسٹیٹ (پہلی منزل) دریا گنج نئی دہلی نے شائع کیا۔اس کا دیباچہ ڈاکٹر سید احمد قادری نے قلم بند کیا ہے۔ ''یہی سچ ہے'' میں آنندلہر نے بڑی بے باکی سے زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح موجودہ دور میں رشوت خوری، بے ایمانی اور استحصال ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔اگر دیکھا جائے تو باقی ناولوں کی طرح آنندلہر کے زیر بحث ناول میں بھی کافی ضمنی کردار ہیں لیکن تین کردار جنھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ ''کوشل، منشو اور شنکر ہیں۔کوشل جو پیشے سے منصف ہے ایک ایماندار انسان ہے۔اسے اپنی ایمانداری پر ناز ہے۔ وہ اپنے بغیر کسی اور کو ایمان دار نہیں مانتا جو کہ ایک مناسب فعل نہیں ہے۔اُس کا ایک سالہ شیو جو رشوت لیتا ہے لیکن سب کے کام بھی کرتا ہے۔وہ اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتا نہیں۔بلکہ اپنی بیوی بچوں کا اچھی طرح پالن پوشن کرتا ہے۔وہ رشوت خور ہوتے ہوئے بھی اپنے دفتر میں ہر دلعزیز ہے اور ہر ایک کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔شنکر کوشل کا دوسرا سالہ ہے۔ایماندار شخس ہے۔اس کے دل میں خدا کا خوف ہے اور وہ رشوت سے دور بھاگتا ہے۔وہ مذہبی عقیدے کا پابند ہے اور ہر روز پوجا کرتا ہے۔اسے پورا یقین ہے کہ اس جنم میں نیک کام کرنے سے دوسرے جنم میں جنت نصیب ہوتی ہے۔اس کے نظریے سے اس کے دفتر والے اور اُس کی بیوی بچے بھی پریشان رہتے ہیں۔وہ کسی کی مدد نہیں کرتا صرف نصیحت کرتا رہتا ہے۔اس لحاظ سے ہر شخص اُس سے بدزن رہتا ہے۔

کہانی: آنندلہر کا ناول ''یہی سچ ہے'' کی کہانی منظّم اور مربوط ہے۔جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اس ناول میں تین کردار یعنی کوشل، شیو اور شنکر ایسے ہیں جنھیں مرکزی کردار کہا جا سکتا ہے۔ان تین کرداروں کے علاوہ اس ناول میں بہت سے ضمنی کردار ہیں۔جن میں بیوئیوں، بچوں اور دوسرے کرداروں کو آنندلہر نے بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے لیکن زیادہ تر کہانی مرکزی کرداروں کے گرد گھومتی ہے اور ضمنی کردار حصے کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔کہانی کا پہلا مرکزی کردار جو قاری کی نظر کا مطلع بنتا ہے۔شنکر ہے۔جو ایک اور مرکزی کردار کوشل کا سالہ ہے۔ وہ ایک ایماندار شخص ہے اُس کے دل میں خوف خدا ہے اور رشوت سے دور بھاگتا ہے۔شنکر اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس جنم میں نیک کام کریں گے تو اگلے جنم میں جنت ملے گی

۔اس کے اس طرح کے سلوک سے اُس کے دفتر کے دوسرے لوگوں کے علاوہ اُس کی بیوی بچے بھی دکھی رہتے ہیں۔وہ کسی بھی شخص کی مدد نہیں کرتا۔ بلکہ نصیحت کرتا رہتا ہے۔ آنند لہر شنکر کا تعارف ان جملوں میں کرتے ہیں۔

''شنکر اصل میں اگلی دُنیا کو بہت اہمیت دیتا ہے۔وہ دُنیا جو اُس نے دیکھی نہیں اور یہ دُنیا جو وہ روز دیکھتا ہے اسے کچھ نہ سمجھتا ہے۔ یہاں وہ دن کاٹ کر اگلی دُنیا میں جینا چاہتا ہے''۔[1]

[1]۔شیو، شنکر کا دوسرا بھائی ہے۔ جو محکمہ جنگلات میں ایک چھوٹا سا ملازم ہے۔ رشوت لیتا ہے اور بے ایمان لوگوں کی نظر میں ایک سچا اور ایماندار ہے۔لوگ یہ بات بھی کہتے ہیں ۔دونوں بھائیوں میں کتنا فرق ہے۔ ایک ایماندار اور دوسرا بے ایمان۔ ایک جھوٹا اور دوسرا سچا۔شیو اصل میں اپنی بیوی اور بچوں کی بڑی قدر کرتا ہے۔

شیو کا ماننا ہے کہ عورت بس عورت کی طرح ہونی چاہیئے ۔اس طرح سے شیو کے گھر میں سب خوشحال رہتے ہیں۔

ان کے علاوہ شیو اور شنکر کا بہنوئی کوشل ہے جو ایک مصنف کے عہدے پر فائز ہے۔کوشل بھی ایک ایماندار شخص ہے۔ جو لوگ اس کے نیچے کام کرتے ہیں اُس کی ایمانداری اُن کے لیے ایک بوجھ ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا سٹاف بھوکا رہتا ہے۔کوشل کا ڈرائیور بھی اُس کی ایمانداری سے بڑی پریشان رہتی ہے۔اپنے علاوہ ہر ایک کو بے ایمان سمجھتا ہے۔ناول نگار لکھتے ہیں۔

''اصل میں کوشل اپنے آپ کو حد سے زیادہ ایماندار سمجھتا ہے۔اور ہمیشہ غرور میں رہتا ہے ۔لوگوں کے کام مرضی سے کرتا ہے ۔اور اگر کوئی شکوہ کرے تو جھٹ سے کہہ دیتا ہے۔''میں نے کوئی سی رشوت کھائی ہے''۔لوگ اس کی ایمانداری سے اس لیے تنگ ہیں کہ وہ اپنے علاوہ سب کو بے ایمان سمجھتا ہے۔ اُس کے غرور کو اس روز تھوڑا سا دھکا لگا۔جب

ریٹا کے خاوند نے اپنا مقدمہ یہ کہہ کر دوسرے جج کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ سوتری کا ان کے گھر آنا جاتا ہے۔ اس بات سے کوشل پریشان ہوا۔ آپ کو جج ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اور بیوی پر رعب جماتا ہے کہ وہ اسے مارتا نہیں ہے۔ وہ جج ہے۔ ایماندار ہے۔ شراب نہیں پیتا ہے۔ بس اسی ایمانداری کے بوجھ تلے اُس کی بیوی جی رہی ہے"۔ [1]

ان تین کرداروں کے علاوہ دوسرے بہت سے ضمنی کردار اس ناول میں شامل ہیں۔ جن کو ناول نگار نے بڑی فن کاری کے ساتھ اُبھارا ہے۔ زیر نظر ناول میں مختلف کردار و واقعات کے تیز بہاؤ میں بھی اپنی منفرد پہچان کو برقرار رکھتے ہیں۔ آنند لہر زندگی کے حقائق کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا اپنا ایک منفرد اور پختہ نظریہ رکھتے ہیں۔ اُن کی نظر معاشرے کے ہر طبقے، مسئلے اور ہر طرح کے حادثات پر بڑی باریک بینی سے پڑتی ہے۔ وہ اپنے داخلی و خارجی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فطری تقاضوں کو بھی بڑی فنی مہارت سے پورا کرتے ہیں۔

اس ناول کا پلاٹ بڑا گھٹا ہوا ہے کہیں بھی اس میں جھول نظر نہیں آتا۔ ہر حادثہ اور ہر منظر فطری معلوم ہوتا ہے۔

کہیں بھی غیر ضروری عناصر کا احساس نہیں ہوتا۔ زبان و بیان کے حوالے سے بھی یہ ناول ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "یہی سچ ہے"۔ دراصل زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

ناول نگاری میں پلاٹ یا کہانی کے بعد جس چیز کو سب سے بلند مرتبہ حاصل ہے وہ کردار نگاری ہے۔ کردار نگاری صرف ناول کا ہی نہیں بلکہ اُردو نثر میں دوسری اصناف کا اہم جز ہے۔ کوئی بھی قصہ کرداروں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا کیونکہ کردار ہی ایک ایسا جز جو کہانی کو اختتام تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں اور کہانی کار کرداروں کے ذریعے ہی اپنا مقصد قارئین کے سامنے رکھتا ہے۔ کردار نگاری میں ناول نگار زندگی کے ٹھوس حقائق سامنے لاتا ہے۔

---

[1] آنند لہر "یہی سچ ہے"، ص۔ ۲۴

ناول ''یہی سچ ہے'' میں کرداروں کی خاصی تعداد ہمیں دیکھنے کوملتی ہے۔کہانی کار نے ہر کردار کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اس ناول کے کرداروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک کردار اپنے ساتھ ایک کہانی لیے ہوئے ہے۔ جو کسی دوسرے کردار سے نہیں ملتی ۔اور یہی وجہ ہے کہ یہ کردار غیر فکری اور غیر ضروری نظر نہیں آتا ہے۔شاید اسی وجہ سے یہ کردار اپنی جگہ مکمل نظر آتے ہیں اور کردار اپنی جگہ مکمل نظر آتے ہیں۔اور کردار کے بنیادی اصولوں پر کھرے اُترتے ہیں۔

شنکر اس ناول کا ہیرو ہے۔ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور محکمہ پولیس میں چھوٹا سا ملازم ہے۔وہ ایماندار ہے نہ کسی سے رشوت لیتا ہے اور نہ ہی کسی کا کام کرتا ہے۔اس کی بیوی کا نام سریتا ہے۔سریش اور رمیش اس کے دو بیٹے ہیں۔اُس کی ایمانداری سے اُس کی بیوی اور بچے کافی پریشان رہتے ہیں۔ایک دن شنکر اپنے بڑے لڑکے سریش سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو پولیس کے محکمے میں نوکری کرنے کے باوجود بھی میں کسی سے رشوت نہیں لیتا۔اُس کا بیٹا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایمانداری آپ کے اپنے لیے ہے۔نہ میرے لیے نہ میرے چھوٹے بھائی کے لیے۔ہم لوگ آپ کے اس بوجھ کو اُٹھا نہیں سکتے ۔اس کی بیوی سریتا بھی اُس کی ایمانداری سے تنگ آ گئی ہے۔وہ شنکر سے کہتی ہے کہ قلیل آمدنی سے اُن کا گذارا نہیں ہوتا۔اس پر شنکر جواب دیتا ہے جو کماتا ہوں۔تمہیں دے دیتا ہوں اور کیا چاہتی ہو۔شنکر کی بیوی اُس سے کہتی ہے کہ آپ کے محکمے میں اور بھی تو لوگ کام کرتے ہیں۔شنکر کہتا ہے کہ وہ رشوت کھاتے ہیں۔میں رشوت نہیں کھا سکتا۔شنکر کا بڑا لڑکا رمیش اُس کا مقابلہ اپنے چچا یسو سے کرتا ہے۔شنکر دکھی ہوکر کہتا ہے کہ ایمانداری کی زندگی ہی بہتر زندگی ہے۔سریش اپنے باپ سے تنگ آ کر پھر کہتا ہے کہ آپ کی ایمانداری ہم پر بوجھ بن چکی ہے۔چچا رشوت لیتا ہے لیکن لوگوں کے کام بھی تو کرتا ہے۔وہ لوگوں کی نظروں میں رشوت لے کر بھی ایماندار ہے۔رشوت کے پیسوں سے بچوں کے لیے کتابیں لاتا ہے۔چچی کے لیے ساڑی لاتا ہے یعنی اپنے بیوی اور بچوں کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔

اگر چہ کہانی کا یہ کردار کافی سلجھا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اپنی ایمانداری میں کسی حد تک بھی کامیاب

نظر نہیں آتا۔اس کی گفتگو سے ایمانداری کا عنصر جھلکتا ہے۔وہ کسی کے جذبات اور مجبوریوں کو نہیں سمجھتا۔

اس ناول کا دوسرا اور اہم مرکزی کردار ہے۔شیو شنکر کا چھوٹا بھائی ہے جو کسی سرکاری محکمہ میں کلرک ہے۔اس کے بھی دو بیٹے ہیں ۔ایک کا نام سدھیر اور دوسرے کا نام رامن۔شیو کا بڑا ڈاکٹر ہے اور چھوٹا انجینئر۔اس کی بیوی کا نام نرملا ہے۔شیو رشوت خوری کے باوجود بھی وہ اپنے دفتر میں ہر ایک کا دلعزیز ہے۔وہ خوب رشوت لیتا ہے مگر رشوت لے کر لوگوں کے کام بھی کرتا ہے۔اور لوگ اس کو رشوت خوشی سے دیتے ہیں۔رشوت کے پیسوں سے اپنے بچوں کا کتابیں بھی خریدتا ہے اور اپنی بیوی نرملا کے لیے ساڑی بھی۔گھر جاتے وقت فروٹ کا ڈبہ بھی لے جاتا ہے۔شیو اپنی بیوی اور بچوں سے بے حد پیار کرتا ہے۔اس کی بیوی اور بچے اس پر بہت خوش ہیں۔اپنے آپ کو تکلیف میں رکھ سکتا ہے لیکن اپنی بیوی اور بچوں کا دکھ برداشت نہیں کرسکتا ہے۔شیو چھوٹے لڑکے کی انجینئرنگ کی سیٹ لینے کے لیے اپنی بیوی کو رات کو چیرمین کے پاس بیجتا ہے۔

یوں تو شیو کا کردار اس ناول میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔لیکن بعض اوقات یہ کردار ہمیں کمزور نظر آتا ہے۔شیو کا رشوت لینا اور بیوی اور بچوں کو سکھی رکھنا اور پھر لڑکے کی نوکری کے لیے اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پاس بیجتا۔

کوشل اس ناول کا تیسرا اور اہم کردار ہے جو کہانی میں مرکزی کردار کا رول ادا کرتا ہے۔کوشل ایک ایماندار جج ہے۔ جو شنکر اور شیو کا بہنوئی ہے۔ وہ اپنے بیوی ،بچوں اور دفتر کے دوسرے ملازموں پر اپنی ایمانداری کا دبدبہ رکھتا ہے۔اس کی بیوی ساوتری ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ساوتری اور اس کا بیٹا ترسیم اس کی ایمانداری کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔نہ ہی اس کا بیٹا کسی سے دوستی کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کی بیوی اپنی کسی سہیلی کے گھر آ جاسکتی ہے۔کوشل دفتر کے ملازموں کے علاوہ گھر میں بھی اپنی افسری اور ایمانداری کا رعب جمائے ہوئے ہے۔ساوتری اس سے تنگ آ کر طلاق لے لیتی ہے۔اور اس کا بیٹا ترسیم بھی اپنی ماں کے ساتھ چلا جاتا ہے۔کوشل گاڑی پر سفر کرتے وقت گاڑی کا میٹر نوٹ کرلیتا ہے۔جس سے اس کا ڈرائیور بھی اس سے تنگ اور پریشان نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول میں ناگپال جو ضمنی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہانی کو آگے بڑھنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ رشوت خور ہے جو دفتر میں لوگوں سے رشوت کھا کر بھی کام نہیں کرتا۔ وہ رشوت کے پیسوں سے جوا کھیلتا اور شراب پیتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو وہ اپنی بیوی کی عصمت کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اور پھر اُن پیسوں سے شراب پی کر اس پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ آشا اور ناگپال کی بیوی اس ناول کے ضمنی کردار ہیں جو قصّہ کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

زیر تبصرہ ناول کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی کا کردار نگاری کے فن سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہے۔

لہر نے ''ناول یہی سچ ہے'' کا تانا بانا جن حالات و واقعات اور کرداروں کی مدد سے تیار کیا ہے۔ انھیں گھڑنے اور ڈھالنے میں بڑی ماہرانہ اور فن کارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے۔

کردار نگاری کے بعد کسی ناول کی کامیابی کا مقام اس کی زبان ہوتی ہے۔ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے والا جز زبان و بیان ہی ہے۔ ناول میں زبان و بیان جتنی سادہ اور عام فہم ہو ناول اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ زبان و بیان ایک ایک ایسا آلہ ہے۔ جو مصنف کی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔

جہاں تک زیر بحث ناول ''یہی سچ ہے'' کا تعلق ہے۔ لہر صاحب نے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ جس سے س بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ لہر صاحب کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ناول کا قصہ چوں کہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ کرداروں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ایسے ناول میں رابطہ و تسلسل ہر جگہ پر قائم رکھنا نہایت ہی مشکل کام ہے لیکن مصنف نے ہر جگہ پر سادہ انداز بیان استعمال کر کے اپنے مقصد کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لہر نے بڑی فنی مہارت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ایک واقع کو دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے۔ زبان اتنی سادہ اور حقیقی ہے کہ ہر منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ انھوں نے کرداروں کی شخصیت کو اُن کی زبان کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔ سادہ زبان و بیان کے ذریعے ہی اپنے کرداروں کے احساسات اور جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس

''کوشل نے سلوتری پر بھی اپنی ایمانداری کا پورا بوجھ ڈال دیا ہے۔ ایک دن ساوتری کسی پارٹی میں

جانے لگی۔ کوشل نے رُکتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ کہاں جا رہی ہو؟''

''اپنی سہیلی ریٹا نے بلایا ہے اور آج اس کے گھر پارٹی ہے''۔ ''تم جج کی بیوی ہو اور ریٹا کا خاوند ایک بزنس مین ہے اور ان کی جائیداد کا جھگڑا ابھی شروع ہونے والا ہے''۔

''تو تمہارا انصاف اتنا کمزور ہے جو اس بات پر ہل جائے گا''۔

''ریٹا کا خاوند ضرور اپنے مکان کا مقدمہ میرے پاس لائے گا''۔

کوشل نے کہا

اس پر ساوتری نے جواب دیا

''میری بھی کوئی زندگی ہے''۔

''اصل میں کوشل اپنے آپ کو حد سے زیادہ ایماندار سمجھتا ہے۔ اور ہمیشہ غرور میں رہتا ہے۔ لوگوں کے کام مرضی سے کرتا ہے اور اگر کئی شکوہ کرے وجھٹ سے کہہ دیتا ہے''

''میں نے کون سی رشوت کھائی ہے''۔[1]

زیر بحث ناول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ لہر نے زبان و بیان کے ذریعے منظر نگار، مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے خوبصورت اور مکمل نمونے پیش کیے ہیں۔

شیو نے اپنے بڑے لڑکے کو آواز دی

''چچا آرہے ہیں چائے لاؤ''

''ابھی لایا''۔ اس کے بڑے لڑکے نے کہا۔ اس پر کوشل نے کہا۔

''ٹھہرو، ابھی ساوتری کو آنے دُ''

وہ پھر باتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

''آج کل رشوت کا خوب زمانہ ہے''۔ کوشل نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ''۔ ''شیو نے جلدی میں بات کی''۔

---

[1] ۔ آنند لہر ''یہی سچ ہے''۔ ص۔ 24-23

یوں لگا جیسے وہ کوشل سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو

اور بات جاری رکھتے ہوئے شیو نے پھر کہا۔

''نہ جانے کیوں اس سامنے والے درخت پر نیموں کچھ زیادہ ہی لگے ہیں''۔[1]

مختصر یہ کہ اس ناول میں دلچسپی کا سب سے اہم عنصر اس کی سادہ طرز تحریر ہے۔ ابتداء سے آخر تک کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ جو قاری کی دلچسپی کو کم کرے۔ لہر صاحب نے فطری اور حقیقی زبان کے ذریعے۔ ناول کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کیا ہے۔

منظر نگاری بھی ناول کے عناصرِ ترکیبی کا ایک جز ہے۔ اس سے ناول کے تاثرات میں افسانہ ہوتا ہے۔ زباں و مکاں کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ کردار کی شخصیت اُجاگر ہوتی ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کا فرض ہے وہ واقعہ یا جگہ کا ذکر کرنا چاہتا ہو اسے پس منظر کے ساتھ اس طرح بیان کرے کہ ناول پڑھنے والے کے سامنے اس کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔ اور وہ خود کو اس جگہ پر محسوس کرے۔ ناول نگاری میں منظر نگاری کا فطری اور حقیقی ہونا لازمی ہے۔

''یہی سچ ہے''۔ ناول منظر نگاری کے اعتبار سے اہم ناول کہا جاسکتا ہے۔ اس میں واقعات کے ایسے منظر پیش کیے گئے ہیں جو فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ ناول میں شروع سے آخر تک منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور جتنے بھی مناظر پیش کیے گئے ہیں ان میں اختصار برتا گیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے۔

''جانتے ہو جہنم کی آگ کیا ہوتی ہے۔ فرشتے آنکھیں نکال دیتے ہیں۔ انسان کو کڑاہیوں میں ڈالا جاتا ہے۔ جن میں جلتا ہوا تیل ہوتا ہے۔ خون اور پاک کے دریاؤں سے گذرنا پڑا ہے''۔

شنکر نے یہ کہہ کر دودھ واپس کر دیا اور شیو شرمندہ ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ شیو کے جانے کے بعد شنکر کے بڑے لڑکے نے اُس سے پوچھا۔

''پتا جی کیا چچا کو نرگ ملے گا''

''ہاں ملے گا بیٹا ضرور ملے گا۔ ہر وہ شخص جو پاپ کرتا ہے۔ اسے نرگ ضرور ملتا ہے۔ شنکر کے بڑے

۱۔ آنند لہر۔ یہی سچ ہے۔ ص۔ ۲۹

لڑکے سریش نے پھر پوچھا۔

''پتا جی نرگ بہت بُری چیز ہے''۔

''ہاں بیٹا بہت بُری چیز ہے ۔ خون اور پاک کے دریاؤں سے گذرنا پڑتا ہے ۔ جلتے ہوئے انگاروں پر لیٹنا پڑتا ہے ۔ وہاں زہریلے اور پھنکارتے ناگوں سے ڈسوایا جاتا ہے ۔روٹیاں دکھائی جاتی ہیں مگر وہ ہاتھ جو انھیں چھونے کی کوشش کرتے ہیں کاٹ دیئے جاتے ہیں''۔ [1]

آنند لہر زندگی کے حقائق کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا اپنا ایک منفرد اور پختہ نظریہ رکھتے ہیں۔ان کی نظر معاشرے کے ہر طبقے ، حصے اور ہر طرح کے حادثات وسانحات پر بڑی باریک بینی سے پڑتی ہے۔وہ اپنے داخلی وخارجی احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فطری تقاضوں کو بڑی فنی مہارت سے پورا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول ''یہی سچ ہے'' زندگی کی سچائیوں پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔لہر کا یہ ناول ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1]۔آنند لہر ''یہی سچ ہے''۔ص 421

باب چہارم

آنند لہر کی ڈرامہ نگاری اور تخلیقی سرچشموں
نروانی، تپسوئی کون اور سرحدیں کی روشنی میں

ریاست جموں وکشمیر میں ڈرامے کی روایت بہت پرانی ہے۔ کشمیر میں اُردو۔ڈرامے کوابتدامیں بھانڈوں وپاتھروں کی اہم سرپرستی حاصل رہی ہے۔ جوگھر گھر جاکر نقلیں کرنے اورسوانگ رچانے کا کام بطور پیشہ کرتے تھے۔ بھانڈ ویاپاتھر دراصل جموں وکشمیر کاعوامی ڈراماتھا۔صوبہ جموں میں خاص طور سے رام لیلا کاتہوارمنایا جاتا تھا۔بیسویں صدی کے آغاز میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں جب ہندوستان سے کچھ ناٹک منڈلیاں کشمیر کی سرزمین میں وارد ہوئیں تو رام لیلا کے طرز پرڈرامے پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔اس کے بعدمحمد عمرنورالٰہی نے اُردوڈرامے کوترقی دینے میں اہم کردارادا کیا۔ تقسیم ملک کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں تھیٹر سے اُردوڈرامے کوکافی تقویت ملی۔ اس دور کے لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسیؔ، محمود ہاشمیؔ،اختر محی الدینؔ، دیناناتھ نادمؔ، راج ہنس کھنہؔ،علی محمدلونؔ، صلاح الدین احمدؔ،سوم ناتھ زتشیؔ، رام کمارابرولؔ، شاکر پونچھیؔ، گردھاری لال دھرؔ، پران کشورؔ، جے سوریؔ، بنسی نردوشؔ، موہن لال ایماؔ،شیلا بھاٹیہ اوروید راہی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔عرض یہ کہ ریاست جموں وکشمیر میں بھی اُردوڈرامے نے ملکی ڈرامے کی طرح عہد بہ عہد ارتقائی منازل طے کیں ہیں۔دورِحاضر میں بھی ادبی ڈرامے، اسٹیج ڈرامے، ریڈیوڈرامے، ریڈیوفیچراورٹی وی سیریز لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جواُردوڈرامے کوترقی دینے میں کلیدی کردار نبھارہے ہیں۔آنند لہرؔ کاشماربھی ریاست جموں وکشمیر کے عصرِ حاضر کے ڈرامانگاروں میں ہوتاہے۔آپ نے اب تک تین ڈرامائی مجموعے نروان، تپسوئی کون اورسرحدیں منظرعام پرآچکے ہیں۔

''نروان''میں تیاگ،کالی کہانی،کیل،نروان، گھنگلا اورپیاسی چھٹے ڈرامے شامل ہیں۔

ان سارے ڈراموں کے پس منظر میں دُنیا، انسان، انسانی سوچ وعمل اورانسانی سماج ہی ہے۔جس میں رہنے والے ہرفردوبشر دُکھ درد، مصیبت، بیماری، اور پریشانی سے چھٹکاراپاناچاہتاہے مگرآنند لہرؔ اس مجموعے میں بنی نوع انسان کوحقائق کوسمجھنے اورصحیح وقت پرصحیح قدم اُٹھانے کی تلقین کرتے ہیں۔ان کے زیر بحث چھوٹے ڈرامے کاپلاٹ،کردار،منظراورمکالمے وغیرہ ہمارے سماج سے جڑے ہوئے ہیں۔اس ڈرامے کے خاص کردار گوتم،سدھا، بوڑھی، بچہ، بوڑھاشخص اورعورتیں وغیرہ ہیں۔''نروان''ڈرامادیگرڈراموں کی طرح منفرداورممتاز ہے اور 1988ء میں منظرعام پرآیا۔

''تپسوئی کون'' آنند لہر صاحب کا ایک مکمل ڈراما ہے۔ جسے بارہ مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ایک سماجی ڈراما ہے۔ جس میں ایماندار، رشوت خور، اور رشوت و بے ایمانی کی زندگیوں کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ڈراما نگار دراصل اس ڈراما میں یہ فیصلہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے کہ وہ ان میں کس قسم کے آدمی کو تپسوئی قرار دے کیونکہ لوگ آج کل زیادہ اُس آدمی کو پسند کرتے ہیں جو رشوت کھاتا ہے۔ ڈراما، پلاٹ، کردار، مکالمہ، زبان، روانی اور خوبصورتی کے اعتبار سے بہت اچھا اور لائق تحسین و مرحبا ہے۔ ''تپسوئی کون''، آنند لہر کا ایک دلچسپ اور کامیاب سماجی ڈراما ہے۔ یہ ڈراما دریا گنج نئی دہلی نے 1994ء میں شائع کیا ہے۔

''سرحدیں'' آنند لہر کا تیسرا ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں کل تین ڈرامے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ تینوں ڈرامے ریڈیائی ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہاں پر ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ نہ اسٹیج، نہ کردار، نہ منظر، نہ لباس، نہ میک اپ، نہ رنگ نہ روشنی، صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اثرات والے ریکارڈ کی آوازیں، مکالموں کی آوازیں، یہاں ڈراما نگار ایک خود مختار فن کار رہوتا ہے۔ اس کا ہتھیار صرف اس کا قلم ہوتا ہے۔ اس ڈرامائی مجموعے میں سرحدیں، پُل اور زندگی ڈرامے شامل ہیں۔

آنند لہر کے ڈرامائی مجموعہ ''نروان'' کا تنقیدی جائزہ

''نروان'' آنند لہر کے چھ چھوٹے چھوٹے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جن کے نام یوں ہیں ۔(i) تیاگ (ii) کالی کہانی (iii) کھیل (iv) نروان (v) گنہگار (vi) سپاہی کی واپسی ۔ ظاہر ہے کہ اس مجموعے کا نام شامل ڈراما نمبر چار ''نروان'' کے عنوان سے ہی رکھا گیا ہے۔ یہ مجموعہ 1988ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔85 صفحات پر مشتمل اس مجموعے کو آنند لہر نے اپنے والد مرحوم شری بلراج آنند کے نام منسوب کیا ہے۔ اس مجموعے کو کتابی شکل میں جے۔کے بک ہاؤس ،ویر مارگ جموں (توی) نے شائع کیا ہے۔ بیان کر چکا ہوں کہ اس مجموعے میں شامل سارے ڈراموں کا پس منظر دُنیا، انسان، انسانی سوچ وعمل اورانسانی سماج ہی ہے۔ جس میں رہنے والا ہر فرد بشر، دُکھ ، درد، مصیبت ، بیماری اور پریشانی سے مکت ہونا چاہتا ہے۔ اور ہر ایک دردمند دل اور نیک خواہشات رکھتا ہے۔ مگر وقت کے ہاتھوں کبھی خوشی اور کبھی غم اُٹھانے سے کوئی بچ نہیں سکتا ہے۔ ڈراموں کے پلاٹ ، کردار اور مکالمے ہمارے سماج سے نہ صرف جڑے ہوئے ہیں بلکہ ایک جزولاینفک کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ پڑھنے والا اپنے گھر میں بیٹھتے ہی باتوں باتوں میں مفید اشارے حاصل کرتا ہے جو تعمیر معاشرہ کے کاموں میں معاون ومددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ میں یہ بات کھل کر سمجھتا ہوں کہ لہر صاحب بنیادی طور پر کہانی کار ہیں۔ اسی لیے کبھی وہ افسانہ ، کہیں ناول ور پھر ڈرامے کا سہارا لے کر اپنے دلی شوق کو پروان چڑھاتے ہیں۔ کہانی سے اُن کی گہری محبت اُنھیں کہانی بُننے اور بہترین طریقے سے پیش کرنے میں رہنمائی کرتی ہے۔ اُن کے بیان میں ہلکا پن نہیں آتا ہے۔ وہ ایک مہذب انسان کے طور پر ہر بُری چیز کی وضاحت بھی زیبا طریقے سے ہی کرتے ہیں۔ زبان کی سادگی اوراختصار پسندی قاری کو بور ہونے سے بچاتے ہیں۔ وہ نصیحت بھی کرتے ہیں تو ادیبانہ ڈھنگ سے تاکہ وہ زاہد خشک جان کر نظر انداز نہ ہوجائیں۔

ڈراما تیاگ: تیاگ اس مجموعے کا پہلا ڈرامہ ہے۔ جوانیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ اس کے کردار ساون، سادھو، بوڑھا، بچہ، عورت، درباری وغیرہ ہمارے سماج کے جیتے جاگتے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے مکالمے بھی اپنی جگہ موزوں ہیں۔اس ڈرامے کا پلاٹ ، ''تیاگ'' کے اردگرد گھومتا ہے۔ اور زندگی کے چند تلخ حقائق سے پردا اُٹھاتا ہوا دِل ودِماغ کو سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔

''ساون'' اس ڈرامے کا ہیرو اور ایک سادھو کا چیلا ہے۔ سادھو اس سے کہتا ہے کہ یہ سب اندھی نگری کے بہرے راجہ ہیں جس نے اس نگری کا دستور بڑا عجیب بنایا ہوا ہے۔ یہ ہاتھوں کی سزا کان کو دیتا ہے۔ پاؤں اگر غلطی کریں تو ناک کٹواتا ہے۔ اس لیے یہ سب لوگ گنہگار ہونے کے باوجود بے گناہ ہیں۔ بیٹا تیاگ ہی تپسیا کا دوسرا نام ہے۔ اور جہاں تیاگ ہے وہاں بھگوان ہے۔ ایشور ہے۔ برکھا ایک نوجوان لڑکی اور تیاگ کی ہیروئن ہے۔ ساون اُس کی خوبصورتی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ سادھو اُسے تیاگی ہونے کا احساس دلاتا ہے مگر عشق کا زور غلبہ پاتا ہے۔ ساون اور برکھا ایک دوسرے میں کھو جاتے ہیں۔ سادھو کو یہ برداشت نہیں ہوتا مگر ساون کہتا ہے کہ اس بار میں پاپ بھی کروں گا اور بھینکر ناگوں سے خود کو ڈسواؤں گا بھی نہیں۔ اچھی طرح سن لو میں پاپی ہوں۔ پاپ کرنا میری فطرت ہے۔ سادھو کہتا ہے کہ تم میری عمر بھر کی کمائی ہو۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کے اس ناشوان جسم کے پیچھے کیوں بھاگتے ہو؟۔ ساون جواب دیتا ہے کہ کیا میں ناشوان نہیں ہوں؟ سادھو لڑکی سے پوچھتا ہے کہ تو کیوں اس کی تپسیا بھنگ کر رہی ہے؟

برکھا جواب دیتی ہے میری خوبصورتی بھی میری تپسیا کا نتیجہ ہے اور اسی کا پھل ہے۔ ساون اپنی بات بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے اور آپ کو بھی ایک دن ختم ہو ہی جانا ہے تو پھر اس شریر کو پیار کرنے دینے میں اعتراض کس بات کا ہے؟ جب ساون اور برکھا پیار کا کھیل کھیلتے ہیں۔ سیر ہو جاتے ہیں۔ برکھا ساون سے کہتی ہے کہ اب تم مجھ سے الگ ہو گئے ہو۔ ساون جواب دیتا ہے کیونکہ برکھا برس گئی ہے اور ساون سوکھ گیا ہے۔ آرزوئیں تھک گئی ہیں۔

حساب کتاب لینے والا اندھا راجہ سامنے آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہم بہرے ہیں لیکن پھر بھی اندھے راجہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک شخص اپنی آنکھوں کے گناہ گار ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور راجہ حکم دیتا ہے کہ اس کے ہاتھ کٹوا دیے جائیں۔ وہ اس کی آنکھوں کا گناہ اس لیے معاف کرتا ہے کیونکہ اپنے گناہ بخشوانے کے لیے اس نے ایک بار راجہ کی تصویر پر پھول چڑھائے تھے۔ بارش تیز ہو جاتی ہے اور راجہ دربار چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ بارش تھم جاتی ہے تو دوبارہ پھر سجتا ہے۔ اور راجہ کہتا ہے کہ مصیبت پڑنے پر وہ درباریوں کے درمیان سے اس لیے چلا گیا تھا کہ یہ مصیبت انھیں اکیلے نہ اُٹھانی پڑے۔ وہ ساون کے سوال

کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ دراصل لوگ خود ہی اپنا حساب لے کر اس کے پاس آتے ہیں۔اس لیے وہ اُن کے پاپ اور پن کی جانچ پڑتال کر کے اُن کو مناسب سزا دیتا ہے۔

برکھا ساون سے پوچھتی ہے کہ پیڑ کی کیا حقیقت ہے۔تو ساون جواب دیتا ہے کہ کبھی یہ پودا تھا۔آج پیڑ ہے۔اور کبھی یہ کچھ بھی نہ رہے گا۔ برکھا یہ جواب سن کر کہتی ہے کہ اس کے نیچے بیٹھنے والے مسافروں کی حقیقت بھی اس کے سالے کی طرح ہی ہے۔جن کا وجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہے۔ پھر ساون برکھا سے کہتا ہے ۔''لگتا ہے کہ تم برس گئی ہو''۔ برکھا جواب دیتی ہے کہ برکھا کے برسنے کے بعد ساون بھی ساون نہیں رہتا۔ساون کو اب محسوس ہوتا ہے کہ اس نے محض برکھا کے لیے اپنا جیون برباد کیا ہے ۔ انسان کا جسم کا واحد مقصد مکتی حاصل کرنا ہے۔ایشور تک پہنچنا ہے۔ برکھا کہتی ہے کہ اس نے ساون کے لیے اپنی جوانی ضائع کی۔ اس کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے لوگ اندھے ہوئے۔اس کی آواز سننے کے لیے وہ بہرے ہوئے۔ انھوں نے اپنی خواہشوں کا قتل کیا۔ اُن میں ہر شخص تمہاری طرح ہی تھا۔ ساون نے یہ سن کر کہا۔''برکھا بہتر ہے۔اب تم میرا ساتھ چھوڑ دو''،''میں پاپی ہوں گنہگار ہوں''۔ برکھا ایک سادھو کے پاس بیٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ بھٹک گئی ہے۔اُسے گیان دے تا کہ اُس کی آتما کو شانتی ملے۔ سادھو اُسے تشفی دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ جیون کا مقصد جیون ہی ہے۔اور جیون سے بڑھ کر کوئی سچائی نہیں ہے۔اتنے میں ساون دوڑ کر آتا ہے۔اور سادھو کے پاؤں پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اپنا سارا جم فضول ضائع کیا اور وہ اپنے اصل راستے سے بھٹک گیا ہے۔مگر سادھو ساون کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہتا ہے کہ (ساون) اس نے زندگی کا صحیح لطف اُٹھایا ہے۔وہ خود بھٹکتا رہا۔اور آج وہ دُنیا کے اتنا ہی قریب ہے جتنا وہ دور بھاگتا تھا۔زندگی کے برس چند لمحوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اور بیتے ہوئے دن درخت سے گرتے ہوئے پتے لگتے ہیں۔پردہ گر جاتا ہے اور ڈراما انجام تک پہنچ جاتا ہے۔

اس ڈرامے میں دراصل لہرؔ صاحب انسان کو نصیحت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے مختصر عرصے میں اللہ تعالٰی کی دی ہوئی نعمتوں کا جائز استعمال کرے۔اور اگر اُسے کسی چیز کو تیاگ دیتا ہے تو وہ بُرائی و بُرے کرم ہیں۔زندگی کے دُکھ سکھ سہنے میں سارے انسانوں کا ردعمل ایک جیسا ہے۔ویسے بھی دُنیا کی لذتوں کو تیاگ

دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ آہر صاحب نے فن کارانہ انداز میں اپنے فن کی بات اس ڈرامے میں کہی ہے۔ جس کا انسان اور انسانی زندگی کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی آہر صاحب کے یہ ڈراما اہمیت کا حامل ہے۔

کالی کہانی: کالی کہانی آنند آہر کے ڈرامائی مجمعہ ''نروان'' میں شامل دوسرا ڈراما ہے۔ یہ کل ساڑے گیارہ صفحات پر محیط ہے۔ اس ڈرامے میں مختلف انسانوں کی فطرت پر طنز کیا گیا ہے جو اپنی کرنی کے طفیل سماج میں اپنا وقار کھو گئے ہیں۔ ہ لوگ جوان کے لفظ لفظ پر جان چھڑ کتے تھے وہی اس کی باتوں پر کان نہ دھرنے کے لیے بھاگے چلے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے کہانی کار اور کردار کے آپسی تکرار کی بات بتاتے ہوئے کہانی کار کی زبان کھلواتے ہیں۔ آخر تم مجھ سے بے وجہ الجھ کیوں رہے ہو۔ کردار جواب دیتا ہے کہ اب تم پہچانتے بھی نہیں ۔ میں تمہاری کہانی کا ہی کردار ہوں۔ تمہارے بنائے ہوئے لفظوں میں رہتا ہوں اور تمہاری لکھی ہوئی سطروں کے ساتھ چلتا ہوں۔ میں نے اپنی کہانی کو خوبصورت سدھا کسی اور کو دے دی اور مجھے صرف تڑپنے کے لیے رکھا۔ اور میں تڑپتا ہوں۔ کہانی کار جواب دیتا ہے کہ اس کہانی کی کامیابی اور خوبصورتی اسی میں ہے کہ تم سدھا کو چاہو اور پیار کرو۔ اور سدھا کسی اور کو چاہے اور پیار کرے۔ اور تم تڑپو۔ کردار کہتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ کہانی کار کہتا ہے کہ اسے تو اپنی کہانی سے انصاف کرنا ہے۔ پھر ایک شخص کہتا ہے کہ جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ اس کے پاس چادر رہی نہیں ہے جو پھٹی پرانی چادر وراثت میں ملی ہے اُس سے اُس کی ماں کا پورا بدن بھی ڈھانپ نہ سکا۔ پہلا شخص اُس سے کہتا ہے کہ اُسے اجازت ہے وہ جتنا چاہے پاؤں پھیلا سکتا ہے۔ مگر اُسے یاد رکھنا ہے کہ پانی آگ کو جلاتا ہے وہ شخص پھر کہتا ہے کہ جتنے پاؤں دیکھو اتنی چادر پھیلاؤ۔ ایک شخص کہتا ہے کہ اس کے پاؤں ہی نہیں ہیں جو کسی آدمی کو انام میں دیئے گئے تھے۔ پھر ایک سپیرا اور سپیرن سامنے آتے ہیں۔ سپیرن بین بجاتی ہے۔ اور پیچھے سے بھاگو! بھاگو! سپیرن کی بین سُن کر سانپ بھاگ رہے ہیں۔ دراصل سپیرن اپنی مقبولیت اسی لیے کھو چکی تھی کہ وہ ایک خوبصورت لڑکے کو دیکھتی رہی۔ اور اُس کا شوہر سانپ کی منی مانگ کر سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا۔ پھر مجمع باز کا مذاق اُڑایا جاتا ہے جو لوگوں کو جھوٹ موٹ کہہ کر اپنی طرف کھینچتا رہتا تھا لیکن جب اس

نے خوبصورت لڑکی کی آنکھوں سے سپنے چھین لیے تو بچے تک دور ہی سے دیکھ کر اُس سے نفرت کرتے تھے ۔اسی طرح طوطا نہ کوئی لفافہ نکالتا ہے اور نہ ہی کسی کو مستقبل کے بارے میں بتاتا ہے کیونکہ اس کے مالک نے اپنی محبوبہ کو خوش کرنے کے لیے طوطے کو مار کر اس کا گوشت یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کیا تھا کہ وہ خلا سے اس علم کا راز حاصل کر چکا ہے۔ آخر کار یہ کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے۔

''تو کیا اچھا نہیں ہوگا تو چاہتوں کا پورا کرنے کے لیے ہم کہانی سے بغاوت کریں ۔اس کی سطروں کو توڑ دیں۔ اگر کہانی کو ختم کرنا ہے تو تمہیں اپنے وجود کو ختم کرنا ہوگا۔ کیوں کہ کرداروں سے کہانی ہے اور کہانی سے کردار ہیں۔

دراصل ڈرامہ نگار یہ بتانا چاہتا ہے کہ دُنیا کے ظاہر دار لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کی امیدوں پر اوس ڈالنے میں ماہر ہیں ۔یہاں ہر کوئی اپنی بات منوانے میں ماہر ہے۔ دوسروں کا غم اُٹھانے والے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ہیں ۔اچھے اور مخلص لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ویسے بھی ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی ۔ایک آزمائی ہوئی بات ہے۔

کھیل: کھیل ڈرامائی مجموعہ ''نروان'' میں شامل تیسرا ڈرامہ ہے۔ یہ ڈراما چھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔کھیل ڈراما آہر صاحب نے اسٹیج کے لیے لکھا ہے۔ یہ ڈرامہ کئی بار پونچھ ڈگری کالج میں اسٹیج کیا گیا۔ انھوں نے ''کھیل'' ڈراما بڑے اچھے ڈھنگ سے تحریر کیا ہے۔ اس میں بتانا چاہتے ہیں کہ زندگی اصل میں ایک کھیل ہے اور انسان کھلاڑی کی طرح آکر کھیلتا ہے اور چلا جاتا ہے ۔ سب سے پہلے مجمع باز کو لیا گیا ہے۔ جو خالی تھیلا بار بار اُٹھا کر لوگوں سے پوچھتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ جب اُسے پوچھا گیا کہ وہ خالی تھیلا رکھ کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ جواب دیتا ہے ''یہ تو صرف لوگوں کو روکنے کے لیے ہے ۔جوں ہی وہ اُکتا کر بھاگنا چاہتے ہیں وہ تو تھیلے کے اندر کیا ہے؟ پوچھتا رہتا ہے تا کہ ان کی دلچسپی بنی رہے۔

ایک کردار کسی لڑکی کی بات چھیڑتا ہے تو دوسرا اُسے اپنی ماں بہن کی یاد دلا کر شرم کرنے کی تنبیہ کرتا ہے ۔ایک بوڑھی آواز ظاہر کرتی ہے کہ ہم سب دائرے کے گرد دوڑ رہے ہیں ۔ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن کیا معلوم جسے ہم سب سے آگے سمجھتے ہیں وہی سب سے پیچھے ہو۔ مجمع باز کہتا ہے کہ

سورج اندھا ہے۔ چاند کی آنکھ پر پھیلا ہے۔ زندگی صرف ایک عکس ہے۔ جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اسی طرح سادھو ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر شیو کا پجاری ہونے کے ناطے اس سے محبت کرنے پر راضی ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بخشش کے طور پر پاپ دوگی۔ میرے کرمنڈل میں زہر بھر کر میری آنکھوں میں سوراج کر دوگی۔ مجھے یوں محسوس ہوگا کہ تپتی ہوئی ریت میں بٹھا کر سورج کی گرمی کو بالٹیوں میں جمع کر کے میرے بدن پر پھینکا جا رہا ہو۔ میری انگلیاں تیرے جسم پر اس طرح محسوس ہوں گی جیسے کوئی زندہ جانور کے بدن کے ٹکڑوں کو کاٹ کر برف میں بھن کر سردی کے دیوتاؤں کے آگے پیش کر رہا ہو۔ اس کے باوجود شیو بھگت بخشش کے طور پر ملنے والی کوئی بھی چیز لینے سے انکار نہیں کرتے۔ لیکن تمہارے جسم سے بھوگ کرنے سے پہلے مجھے سانپوں کو تیار کرنا ہوگا۔ ویشیا سنگھار کر رہی ہے۔ سادھو سانپ پال رہا ہے۔ مجمع باز کہتا ہے میں بھی کسی کا کھیل ہوں۔ میرا مجمع میرا کھیل ہے۔ اور میں کسی کا کھیل ہوں۔ لڑکی بولتی ہے۔ ''میرا حُسن بھی کسی کا کھیل ہے''۔ بوڑھی عورت کے گلے میں نوجوان لڑکے کی تصویر پڑی ہوئی ہے۔ بوڑھے کے گلے میں ایک نوجوان لڑکی کی تصویر پڑی ہے۔ اس طرح یہ سارا کھیل ختم ہوتا ہے۔ دراصل لہرؔ صاحب اس چیز کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ دُنیا کے بہت سارے لوگ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہیں۔ یک رنگی ایک نایاب سی بن گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس حمام میں سارے ننگے ہیں۔

نروان: ''نروان'' اس مجموعے میں ترتیب کے لحاظ سے چوتھا ڈراما ہے اور اسی ڈرامے کے نام سے ہی مجموعے کا نام بھی رکھا گیا۔ یہ ڈراما چودہ (۱۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ڈراما بھی موضوع کے اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہے۔ اس ڈرامے کا بنیادی مقصد تمام بُری چیزوں سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اس ڈرامے کے خاص کردار گوتم، سدھا، بوڑھی، بچہ، بوڑھا شخص اور عورتیں وغیرہ ہیں۔ گوتم ہیرو اور سدھا ہیروئن ہے۔

گوتم کہتا ہے کہ ''ایشور کتنا وال ہے۔ مگر ہم نے اسے ایک سبد میں ڈھال دیا ہے۔ اور تمام زندگی ہم اس لفظ کو لکھتے اور مٹاتے رہتے ہیں۔ سدھا کہتی ہے کہ غلطی تو یہاں پر ہے کہ ہم سمجھتے ہیں۔ دِن آتا ہے اور رات آتی ہے۔ مگر اصل میں یہ نہیں ہے۔ سچ صرف یہ ہے کہ سورج نکلتا ہے اور ڈھلتا ہے۔ ایک بوڑھی کہتی ہے کہ بیٹا وہ مجھ سے اتنا آگے نکل گیا ہے کہ میں اب اس کے پیچھے بھی نہیں رہی اور اب اس کا پیچھا کرنے کے

سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ تمام عمر لوگ میرے پیچھے رہے اور میں اس کے پیچھے رہی۔ میں اس سے بہت پیچھے رہ گئی۔ اور لوگ مجھ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اکیلی بھٹک رہی ہوں۔ سدھا زندگی کو عجیب وغریب شے قرار دیتی ہے۔ گوتم بوڑھی کی باتیں سن کر کہتا ہے کہ سفر اتنا لمبا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کون کہاں بچھڑ جائے۔ پھر سدھا گوتم سے کہتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وقت ہم کو الگ کرے کیونکہ ہم خود ہی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں کیونکہ ایشور کو پانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ پیچھے سے آوازیں آتی ہیں۔ کانچ کے برتن آخر کار ٹوٹ ہی گئے۔ رشتوں کا پرچار کرنے والا بہرہ نکلا۔ وعدے تو صدیوں کے ساتھ رہنے کے تھے۔ مگر لمحوں میں بچھڑ گئے۔ لوگ اتنے نزدیک آئے کہ ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے۔ اگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ہم کہاں سے آئے ہیں تو ہمیں کیسے پتہ لگ سکتا ہے کہ ہم نے جانا کہاں ہے۔ درخت اگر اوپر کی جانب بڑھتا ہے تو اتنا نیچے بھی جاتا ہے۔ گوتم کہتا ہے۔ ''درخت سے بیج پھوٹتا ہے'' اور بیجوں سے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ گوتم جواب دیتا ہے کہ بس ایک دائرہ ہے۔ اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر گوتم اور سدھا راجا کو ڈھونڈتے ہیں تا کہ وہ پھیلتی ہوئی بھیڑ میں نہ کھو جائے۔ راجہ گوتم کو کہتا ہے کہ میں تھک گیا ہوں۔ وہ سنیتا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جب کہ گوتم اور سدھا اُس کی تلاش میں سرگردان تھے۔ گوتم چاہ کرتا ہے۔ ''کتنا اچھا تھا کہ میں ستیہ کی تلاش میں جاتا''۔ سدھا جل کر کہتی ہے۔ ''تو تم گئے کیوں نہیں۔ روکا کس نے تھا'' گوتم بولتا ہے ''کیا کرتا اُس وقت تم جوان تھیں''۔ سدھا کہتی ہے۔ ''اب چلے جاؤ'' گوتم کہتا ہے۔ ''اب تم جوان نہیں ہو اور تمام خواہشیں بھی ختم ہوگئی ہیں۔'' اتنے میں ایک جوان روتا ہوا آتا ہے۔ کہتا ہے کہ اپنی بیوی کو بستر پر چھوڑ کر برھ کے درخت کے نیچے بیٹھ کر مکتی کی تلاش کرتا رہا۔ برھ کا درخت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے پتے گرنے لگے ہیں۔ اور جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اس پر بیٹھنے والے تمام پرندے اُڑ گئے ہیں۔ اور وہ ناکارہ ہو گیا ہے۔ بھلا ہو اُس کا جس نے مجھے یہ بتایا کہ یہ درخت اب گرنے والا ہے۔ اور میں بھاگ آیا۔ مجھے اپنی بیوی یاد آ رہی ہے۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں اس کی جوانی بیت نہ جائے۔ مجھے مت روکو۔ مجھے جانے دو۔ سدھا گوتم سے کہتی ہے ''اچھا ہوا وہ نہیں گیا''۔ گوتم جواباً کہتا ہے لیکن درخت اب بوڑھا ہوا ہے۔ اس وقت وہ ضرور جوان ہوگا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اس وقت تم حسین بھی تھی اور جوان بھی۔ اتنے میں گوتم ایک انسان کو دوڑتے ہوئے دیکھتا ہے جو گوتم سے

پوچھتا ہے کہ اُس نے وہاں سے کسی شخص کو جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ گوتم ہاں میں جواب دیتا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ میں نے اس کو غلط بتایا تھا کہ درخت سوکھ گیا ہے اور اُس کے اوپر گر جائے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں خود وہاں بیٹھنا چاہتا تھا۔ گوتم نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ تو اس شخص نے کہا کہ اُسے اپنے کیے کا خود بھی کوئی علم نہیں ہے۔

اس ڈرامے کو لکھ کر آہر صاحب دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دُنیا دُکھوں کا گھر ہے کہ یہاں کوئی سنیاس لینا چاہتا ہے اور کوئی سنیاس سے تنگ آ کر گھر گرہستی میں واپس آنے کا متمنی ہے۔ غرض یہ کہ انسان کو کسی کروٹ بھی آرام وسکون حاصل نہیں ہے۔

گنہگار: گنہگار، ''نروان'' میں شامل ڈراموں میں سے ایک اہم اور دلچسپ ڈراما ہے۔ یہ ڈراما آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ گنہگار ڈرامے کی ابتدا اس جملے سے ہوتی ہے۔ ''مگر ضروری نہیں کہ دوڑنے والا ہی گرے۔ کئی بار لوگ کھڑے کھڑے بھی گر گئے''۔ پھر ایک کردار کہتا ہے ''غضب ہوگیا میرے اپنے ہی دانتوں نے میری انگلی کاٹ دی''۔ دوسرا کردار ''تو یہ احساس بھی ہو گیا ہوگا کہ دانتوں کا اُنگلیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔'' پھر بوڑھا شخص کہتا ہے کہ میں نے عمر دیکھی ہی نہیں۔ موسموں کا بھی مزہ چکھا ہی نہیں۔ مگر لوگ کہتے ہیں میں بوڑھا ہو گیا ہوں'۔ جب ایک لڑکی ناچنا شروع کرتی ہے تو ایک کردار کہتا ہے ''ناچنا ہی دلی تہذیب کے خلاف ہے''۔ مگر ساتھ ہی وہ اس لڑکی کے پاؤں میں گھنگھروں باندھ دیتا ہے۔ دوسرا کردار کہتا ہے کہ جب ورت ناچے تو مجھو کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ تیسرا کردار کہتا ہے کہ عورت ماں اور بہن ہے۔ اسے ناچنے نہیں دینا چاہیے۔ مگر ساتھ ہی وہ خود ناچنے لگتا ہے۔ پھر ایک بچہ کہتا ہے ''بھیڑ پتھر کیوں مارتی ہے''۔ دوسرا بچہ فوراً جواب دیتا ہے''۔ یہ اس کے وجود کے لیے ضروری ہے۔ بچہ پھر پوچھتا ہے۔ ''یہ بھیڑ کیوں لڑتی ہے''۔ جواب ملتا ہے کہ اگر بھیڑ اس طرح لڑے گی نہیں تو پھر یہ بھیڑ نہیں رہے گی۔ اس کے بعد تین بوڑھے یکے بعد دیگرے سوال کرتے ہیں۔ ''کیا اس بستی میں روشنی کی کہانی جانتا ہے؟ ''ارے یہ لوگ دوڑنے کے باوجود رفتار کیوں مانگتے ہیں''۔ پھر ایک اور کردار بول اُٹھتا ہے۔ ''مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ دائرے کے گرد کیوں گھومتا ہوں؟''۔ پھر کچھ کردار بولتے ہیں ''میری آنکھیں ہولے چُرا کر لے گئی ہیں''۔ میرے کان آواز نے اپنے

اندر جذب کر لیے ہیں''۔ میرے پاؤں رفتار کے اندر سما گئے ہیں۔ ''دوڑنے کے لیے ہی نہیں بلکہ رُکنے کے لیے بھی پاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔''ہزاروں میل چلنے کے باوجود بھی میں اپنی جگہ پر ہی رہا''۔ڈھنڈروچی ایک کردار سے کہتا ہے''اِن لوگوں کو یہ وہم ہے کہ یہ سوتے ہیں کیونکہ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ سو سکتے ہی نہیں۔اُن کی نینداُس وقت اُن سے جدا ہوگئی تھی جب اُن کی آنکھوں نے اُن کے اپنے زخم دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔اصل بات یہ ہے کہ یہ سوتے ضرور ہیں مگر اُن کو نیند نہیں آتی۔تو میں کہہ رہا تھا''میرے باپ نے بھی وہی غلطی کی ہے''۔بغیر ہاتھوں والا شخص،لنگڑا شخص اور گونگا شخص باری باری کہتے ہیں۔''میرے ہاتھ اس وقت کھو گئے تھے جب میں نے پانی کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔دوسرے کی ٹانگ کاٹنے کی کوشش میں میرا پاؤں پھسل گیا۔اور میں لنگڑا ہو گیا''''میری آواز اُس وقت کھو گئی تھی جب میں نے سناٹوں پر چیخوں کے زخم پہنچائے تھے''۔

پھر ایک کردار بولتا ہے''میں آنکھوں کے پھیلاؤ سے تنگ ہوں۔ کیوں کہ پاؤں اتنا سفر طے نہیں کر سکتے۔اس کے بعد تین اشخاص ایک دوسرے پر جیب کاٹنے کا الزام لگاتے ہیں اور آپس میں لڑ پڑتے ہیں ۔آخر میں لڑکی آتی ہے اور انھیں بتاتی ہے''تم سب نے ایک دوسرے کی جیبیں کاٹی ہیں۔اور تم سب گنہگار ہو۔ اس فقرے کے ساتھ ہی ڈراما بھی اختتام پذیر ہوتا ہے۔

اس ڈرامے میں لہر صاحب کا مدعا یہ ہے کہ دُنیا میں ہر کوئی ہر وقت کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے ۔اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لیے کوئی دوسرے کی ضرورت کا خیال نہیں رکھتا۔جس چیز کو ایک شخص دورے کے لیے گناہ قرار دیتا ہے۔اسی چیز کو اپنے لیے کرنے میں اسے لذت محسوس ہوتی ہے۔یہ انسان کے اپنے ہی کالے کرتوت ہیں جو راتوں کی نیند خراب کرتے ہیں۔کچھ لوگ اس قدر تھک جاتے ہیں کہ اُن کے اپنے جسم کے اجزاء تک جواب دے دیتے ہیں۔انسان کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔

سیاہی کی واپسی :''سیاہی کی واپسی'' آنند لہر کے زیر بحث مجموعے کا آخری مگر ایک دردناک ڈراما ہے۔یہ ڈراما پندرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔اس ڈرامے کو لہر صاحب نے اسٹیج کے لیے لکھا۔ڈراما''سیاہی کی واپسی'' کو کئی بار پونچھ کالج میں اسٹیج ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔جس میں جنگ کا خوف ناک پس

منظراورافسانوں کے مارے جانے کاذکر کیا گیا ہے۔فوجی کو ہر لمحہ جنگ چھڑنے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر کبھی بادل بھی گرجتے ہیں تو اسے لگتا ہے کہ دشمن نے لڑائی شروع کر دی ہے۔ دورانِ جنگ فوجی جن دل دوز وقات کو بچشم دیکھتا ہے اُن کا اثر اس کے ذہن پر کافی دیر تک حاوی رہتا ہے۔ اس ڈراما میں فوجی موہن، سدھا، فاطمہ، پیٹر، لڑکی، بچہ اور بورھا خاص کردار ہیں۔

موہن سدھا سے کہتا ہے کہ ''بادل گرجیں تو لگتا ہے کہ جسم کے اندر آتش فشاں پھٹنا چاہتے ہیں اور جوانی کی اس آگ میں تمام عمر جل جانا چاہتا ہوں۔تو سدھا پوچھتی ہے کہ موہن تمہیں بادلوں سے بہت پیار ہے۔موہن جواب دیتا ہے۔''بادلوں سے بھی اور تم سے بھی۔میں پیار بانٹنا چاہتا ہوں۔لگتا ہے کائنات کا ذرہ ذرہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار میں بندھا ہوا ہے۔'' سدھا بولتی ہے ''ہاں موہن پیار زخموں کی مرہم ہے''۔ پھر ایک شخص سدھا کو سمجھاتا ہے کہ دُشمن سے بچنے کے لیے فوج کی ضرورت پڑتی ہے اور فوج اپنی دھرتی کا دفاع کرتے ہوئے نڈر ہو کر لاشوں کے اوپر سے بھی گذر جاتی ہے۔ اس کے بعد موہن سدھا کو سرحد کی اہمیت اور نوعیت بتاتا ہے۔ فاطمہ اور پیٹر کی سہاگ رات ہوتی ہے۔مگر سرحد پر جنگ چھڑ جاتی ہے۔پیٹر فاطمہ سے بولتا ہے۔میرے پاس وقت نہیں ہے۔جنگی دھنیں بج رہی ہیں اور سپاہی جنگی دھنیں سننے کے بعد خاموش نہیں بیٹھ سکتا ہے۔ فاطمہ اسے احساس دلاتی ہے کہ تم صرف سپاہی ہی نہیں ہو بلکہ کسی کے شوہر بھی ہو۔آوازوں کی صورت میں جنگ کی تباہ کاری کا حال اس طرح جملوں میں بیان کیا جاتا ہے۔''جنگ انسانی رشتوں کو ختم کر دیتی ہے''۔''جنگ اُس سے اُس کا گھر چھین لیتی ہے''۔''ہائے میں مرگیا میرے بچے کا کیا ہوگا۔مجھے بچاؤ۔ بچاؤ مجھے''۔ہائے میں مرگیا۔ میرے بچے کا کیا ہوگا۔''میرا بھائی مرگیا''۔ہائے میرا بیٹا۔ہائے میرا سہاگ لُٹ گیا۔ میرا بچہ یتیم ہوگیا''۔ اس کے بعد ایک شخص جنگ جیتنے کی خبر دیتا ہے۔ جیت کا جشن منایا جارہا ہے۔ایک بچہ کہتا ہے۔''مگر میرے پاپا تو مارے گئے ہیں''۔وہ شخص اُسے جواب دیتا ہے۔''اب ناچو تمہارے پاپا مرے نہیں بلکہ شہید ہوگئے ہیں''۔ایک سایہ کہتا ہے۔''ایک دوسری جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ ایک جنگ ہارنے کے بعد دوسری جنگ ضرور لڑی جائے گی''۔ایک آواز آتی ہے کہ کیا دوسری جنگ میں ہمارے کھوئے ہوئے رشتے واپس ملیں گے۔ یا دوسری جنگ کا انجام بھی پہلی جنگ

جیسا ہوگا۔فوجی کولگتا ہے کہ اس کی چال سے لوگوں میں نفرت پیدا ہوگئی ہے۔وہ کھڑی فصلوں کو کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک بوڑھا اُسے پیار کرنے کی وجہ پوچھتا ہے۔تو فوجی جواب دیتا ہے۔''جوٹریننگ دی گئی ہے میں اُس کے مطابق کام کر رہا ہوں''۔کچھ وقت کے بعد ایک لڑکی آ کر کہتی ہے۔''جب تمام لوگ کسی دیش اور دھرم کے نہیں رہیں گے تو میرے خوبصورت جسم کے ہو جائیں گے''۔عورت موہن سے کہتی ہیکہ ''تم آگئے میں برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔یہ دیکھو انتظار کی جھریاں میرے چہرے پر اُبھر آئی ہیں۔موہن کہتا ہے۔''میرا نام ہے، میں صرف سپاہی نہیں ہوں''۔سدھا موہن سے پوچھتی ہے وہ بوٹلی میں کیا لایا ہے؟موہن نے سدھا سے کہا تھا کہ جب وہ جنگ جیتے گا تو اُس کے لیے دُنیا بھر کی خوشیاں لائے گا۔مگر جب سدھا نے بوٹلی کھولی تو اُس نے پھٹے پرانے اور گندے کاغذ دیکھے۔موہن نے اُسے سمجھایا کہ وہ کاغذ اس علاقے کے نقشے ہیں جو موہن کے ساتھیوں نے جیتا تھا۔پھر سدھا کو بوٹلی میں ہڈیاں ملتی ہیں۔وہ موہن سے پوچھتی ہے کہ یہ ہڈیاں کس کی ہیں۔موہن سے بتاتا ہے کہ وہ ہڈیاں دُشمن کی ہیں۔پھر سدھا بوٹلی سے دو چوڑیاں اور ایک خط نکالتی ہے اور خط پڑھتی ہے۔''پیارے پیٹر سہاگ رات کے روز تم چلے گئے تھے اور اس کے بعد میں تڑپتی رہی۔یہ دو چوڑیاں بھیج رہی ہوں تا کہ تمہیں احساس رہے کہ کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے''۔سدھا نے پیٹر کے بارے میں جاننا چاہا۔تو موہن نے اُسے بتایا کہ پیٹر دُشمن تھا۔مار دیا''۔سدھا نے یہ سُن کر اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔اور بھاگ گئی۔موہن سدھا سدھا پکارتا ہوا رہ جاتا ہے۔''

دراصل جنگ تباہی اور بربادی کا ایک مختصر مگر بڑا نام ہے۔جنگ لوگوں کی زندگیوں کو برباد کرتی ہے۔ذرا اپنی آنکھیں بند کریں تو حال ہی میں افغانستان اور عراق کی جنگوں کے بارے میں ٹیلی ویژن پر دیکھے گئے اور اخباروں میں پڑھے ہوئے واقعات پر نظر ڈالیں۔جگہ جگہ انسانوں کی لاشوں اور زخموں کے انبار خون کے آنسو بہانے پر مجبور کریں گے۔

اس ڈرامے میں لہر صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جنگ چھوٹی ہو یا بڑی یہ انتہائی خطرناک اور جان لیوا ہوتی ہے۔یہ ڈراما بھی ہر اعتبار سے مکمل ہے۔پلاٹ کو زیادہ تر مکالمے کے بل بوتے پر ہی پیش

کیا گیا ہے۔ ''سپاہی کی واپسی'' وقت کے حکمرانوں کے لیے ایک بڑا لمحہ فکریہ پیدا کرتا ہے جو اقتدار کے نشے میں کشت وخون کی ہولی کھیلنے کے شوقین ہیں۔

مختصراً مجموعہ میں شامل تمام ڈراموں میں سادہ اور عام فہم زبان اور خوبصورت مکالمے استعمال کیے گئے ہیں جن کی بدولت یہ تمام ڈرامے اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

آنند لہر کے ڈراما ''تپسوئی کون'' کا تنقیدی جائزہ

جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ آنند لہر کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے کہانی کاروں میں ہوتا ہے۔ آنند لہر ایک اچھے ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے بہت سے ریڈیو۔ ٹی وی اور اسٹیج ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے ڈرامے زیادہ تر ریڈیو سے نشر ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی کچھ عرصہ ریڈیو اسٹیشن سے منسلک رہے ہیں۔ ان کے ڈرامے ''تپسوی کون'' اور ''نِروان'' کو کئی بار اسٹیج ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ جنھیں ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا اور سراہا گیا۔ آنند لہر ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کی تکنیک سے پوری طرح واقف ہیں۔

''تپسوئی کون'' آنند لہر کا ایک مکمل ڈراما ہے۔ نروان کے بعد یہی ڈراما زیر طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ 79 صفحات پر مشتمل یہ ڈرامائی مجموعہ 1994ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں تیرہ مناظر ہیں۔ یہ سماجی نوعیت کا ڈراما ہے جس میں ایماندار، رشوت خور، ایماندار اور رشوت خور کی زندگیوں کی خاص جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ڈرامہ نگار اصل میں یہ فیصلہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے کہ وہ اِن آدمیوں میں سے کس آدمی کو اصلی تپسوئی کہے۔ ایماندار ملازم تو اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند ہے مگر وہ کسی کا کام بھی نہیں کرتا۔ رشوت خور ایسا ملازم ہے کہ جو رشوت لے کر سب کام وعدے کے مطابق کر کے ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔ جب کے رشوت خور بے ایمان نہ صرف دوسروں کا حصہ ہڑپ کرتا ہے بلکہ رشوت خور بے ایمان نہ صرف دوسروں کا حصّہ ہڑپ کرتا ہے۔ بلکہ رشوت کھا کر بھی کسی کا کام نہیں کرتا۔ یہاں تو اِدھر کھائی اور اُدھر کنواں والی بات ہے۔ لہر صاحب نے ان تینوں قسم کے لوگوں کی ذاتی اور گھریلو زندگی کا دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے میں شنکر، شبو، اور ناگپال مرکزی کردار ہیں اور باقی ضمنی کردار بھی ڈرامے میں جا بجا نمودار ہوتے ہیں۔ زبان میں روانی، شستگی اور مٹھاس موجود ہے۔ سارے کردار ہمارے سماج سے جڑے ہونے کی وجہ سے اجنبی نہیں ہیں۔ مجموعی طور پر ''تپسوئی کون'' ایک اچھا سماجی ڈراما ہے۔

''تپسوئی کون'' کے پہلے سین میں شنکر نام کے ایک ایماندار پولیس آفیسر کو متعارف کرایا گیا ہے جو اپنے بیٹے سریش سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''یہ ایمانداری آپ کے اپنے لیے ہے، میں یا میرا بھائی رمیش اس بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتے''۔ اتنے میں شنکر کی بیوی سریتا آتی ہے اور اس کو ناشتہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔ شو شنکر کا چھوٹا بھائی ہے اس کی بیوی

نرملا اور لڑکے رمن اور سدھیر ہیں۔ شو رشوت خور ایماندار ہے۔ نرملا اس سے کہتی ہے۔

''اپنے سر پر کتنے پاپ اُٹھاتے ہو۔ ہمارے لیے رشوت کھاتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ صرف اپنے بچوں کے لیے''۔

اُدھر شنکر کا کنبہ اس کی محدود کمائی سے پیٹ بھر کر کھانا حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ رمیش دودھ مانگتا ہے اور شنکر اسے تھپڑ مار کر خاموش کر دیتا ہے۔ شنکر کی بیوی سریتا سے رہا نہیں جاتا ہے۔ وہ کہتی ہے۔

''کیا زندگی ہے میری اور میرے بچوں کی۔ ایک تو خالی چائے اور پھلکے اور دوسرے آپ کے تھپڑ'' ۔شنکر جواب دیتا ہے۔

''جو کماتا ہوں تمہیں کو دیتا ہوں۔ اور کیا چاہتی ہو''۔ سریتا پھر کہتی ہے ۔''مگر آپ کی کمائی سے ہمارا گذارہ نہیں ہوتا اور بھی تو آپ کے محلے میں لوگ کام کرتے ہیں''۔ شنکر جل کر جواب دیتا ہے۔

''ہاں ہاں کرتے ہیں مگر وہ لوگ رشوت کھاتے ہیں۔ میں نہیں کھا سکتا ہوں۔ سریش شنکر کا مقابلہ اپنے چچا شو سے کرتا ہے اور کہتا ہے ''چچا کتنا مہان ہے۔ اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتا ہے۔ جو ان کے لیے پاپ کر رہا ہے گناہ کر رہا ہے''۔

شنکر دُکھی ہو کر کہتا ہے۔''مگر ایمانداری کی زندگی ہی بہترین زندگی ہے''۔ سریش پھر کہتا ہے۔''پتا جی آپ کی ایمانداری ہم پر بوجھ بن چکی ہے۔ ایماندار بے ایمانی بھی ہوتی ہے۔ آپ چچا کو ہی لیجئے۔ وہ ایماندار ہے۔ ایمان ہے۔ رشوت لیتا ہے جس سے پیسہ لے گا اُس کا کام ضرور کرے گا۔ رشوت کے پیسوں سے بچوں کی کتابیں خریدتا ہے۔ چچی کے لیے ساڑی لاتا ہے۔ ناگپال بھی ہے۔ رشوت لیتا ہے۔ مگر اس پیسے سے جوا کھیلتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ شنکر اور شو رمیش کو دودھ پلانے یا نہ پلانے پر بات کر رہے ہیں کہ شنکر کا دوست نارائن آ کر کہتا ہے۔

''تمہارے گھر کا کھانا کھا کر جسم سدھر جاتا ہے۔ بھابی بڑی قسمت والی ہے۔ جسے ایماندار اور سچا پتی ملا ہے''۔ سریش نارائن سے کہتا ہے ''پتا جی ایماندار ہیں مگر رمیش دودھ کے لیے تڑپ رہا ہے''۔ نارائن اسے سمجھاتے ہوئے کہتا ہے۔

''بیٹا ایمانداری بہت مشکل راستہ ہے اور شنکر جس کی تمام دُنیا تعریف کرتی ہے ۔وہی اس راستے پر چل سکتا ہے''۔ سریش کہتا ہے کہ وہ خود کیوں ایماندار نہیں ہے۔ نارائن جواب دیتا ہے۔

''کیا کروں بھائی راستہ مشکل'۔

اس سین میں آنند لہر نے ایمانداری اور رشوت خور ایماندار اور بے ایمان کا خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

دوسرے سین میں شیو کو اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ جہاں مس ورما اُس سے پوچھتی ہے کہ کرشنا دفتر کیوں نہیں آتی ہے۔ شیو کہتا ہے کہ کرشنا چھٹی پر ہے۔ کرشنا ایک خوبصورت عورت ہے۔ لمبی، پتلی ۔گورا رنگ، صحت مند بدن جو اتنے میں آفس آتی ہے۔ وہ اس دفتر میں ملازم نہیں ہے بلکہ دفتر والے اُسے اپنے رشوت کے پیسوں سے حصہ کاٹ کر تنخواہ دیتے ہیں۔ کرشنا ٹائپسٹ ہے اور اسے اس بات کا علم ہی نہیں کہ وہ سرے سے ملازم ہی نہیں ہے۔ مسٹر اروڑہ شیو کا آفیسر ہے۔ وہ اُسے بلا کر کہتا ہے کہ ساما آ رہا ہے۔ اگر اسے کرشنا کا پتہ چلے گا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اتنے میں ساما آتا ہے اور کچھ دیر کے بعد واپس جانے لگتا ہے کہ باہر جاتے ہوئے اس کی نظر کرشنا کے خوبصورت جسم پر پڑی تو وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے لڑکھڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اتنے میں گوپی چند نامی ایک سائل آتا ہے۔ اپنے کاغذات لیتا ہے اور رشوت کی بقایا رقم شیو کو ادا کرتا ہے۔ پھر ایک اور شخص آتا ہے وہ ہسپتال بنانا چاہتا ہے۔ مگر شو اس کی مدد نہیں کرتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر ہسپتال بنانے میں ذرا بھر کوئی کمی رہی تو اس سے بیمار بچوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ البتہ گوپی نے پل بنایا تھا مگر ریٹ زیادہ رکھے تھے۔ پُل بھی بنایا اور رشوت بھی دی۔ اتنے میں ساما غصے کی حالت میں مسٹر اروڑہ کے دفتر میں آتا ہے۔ اور کہتا ہے۔''یہ دفتر ہے یا کنجر خانہ''۔ پھر شو کو بلا کر کہتا ہے''یہ نئی عورت کون ہے''۔ شو جواب دیتا ہے۔ جناب دفتر کا کوئی بھی کام کاج نہیں کرتے اور پھر آپ کا حصہ بھی باقاعدہ پہنچا رہے ہیں؟ بالآخر ساما اروڑہ سے کہتا ہے۔''میری بیوی کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں اور پھر بھی میں جوان ہوں۔ کبھی سوچا تم''۔ شو کہتا ہے۔''نہیں جناب کرشنا یہ بات نہیں مانے گی''۔ پھر مس ورما آکر ساما کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی حامی بھر لیتی ہے۔ اس طرح سے یہ سین بھی پورا ہو جاتا ہے۔

ڈرامے کے تیسرے سین میں شو اور شنکر کی دفتر سے گھر واپسی کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شو کے

ایک ہاتھ میں بیوی کے لیے ساڑی ہے اور دوسرے ہاتھ میں فروٹ کا ڈبہ ہے۔ نرملا ساڑی دیکھ کر شو سے کہتی ہے کہ اُسے آج پھر پیسے ملے ہیں۔ مگر نرملا کو سریتا کی پریشانی کی وجہ یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ اتنے میں شنکر گھر پہنچتا ہے وہاں رمش کے بارے میں یہ جان کر غصے میں آتا ہے کہ اُس نے پاس والے پڑوسی کے درخت سے آم چرائے ہیں۔ اس بات پر میاں اور بیوی کے درمیان تو تُو میں ہوتی ہے۔ سریتا رمیش کے لیے بھی کھانا ڈالتی ہے۔ تو شنکر کہتا ہے ''اگر تو ایسا کرے گی تو پھر میں کھانا نہیں کھاؤں گا''۔ جب معاملہ بڑھ گیا تو شنکر کھانا کھائے بنا ہی سو گیا۔ اور سریتا بھی بھوکی رہی۔ دوسری طرف شو مزے سے کھانا کھاتا ہے۔ اس کے بعد شو اور رمن کی شادی کی باتیں ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ خوشیاں مناتا ہوا شو کا کنبہ آرام کی نیند سوتا ہے۔ سریتا بھی شنکر کے نزدیک جاتی ہے اور شنکر یہ کہہ کر اُسے خاموشی سے سونے کی تاکید کرتا ہے۔ میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ ''چادر اوڑھو اور سو جاؤ''۔ سریتا دُکھی ہو کر بتاتی ہے۔ ''میں سو جاؤں گی''۔ مگر چاند اسی طرح چمکتا رہے گا۔ ستارے روشنی دیتے رہیں گے۔ یہ کہہ کر سریتا سو جاتی ہے اور تیسرا ایکٹ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

چوتھے سین میں دکھایا گیا ہے کہ ناگپال ایک ایسا رشوت خود ہے۔ جو دوسروں کا حصّہ بھی ہڑپ کر دیتا ہے۔ اور کسی کا کام بھی نہیں کرتا۔ ناگپال ناشتہ کیے بنا ہی دفتر چلا آیا تھا۔ اس لیے اُس کی بیوی شانتی وہاں پر آتی ہے۔ جب وہ ناگپال کو چائے پینے کے لیے کہتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔

''جب تک تو مجھ سے لڑنا نہیں چھوڑے گی تب تک میں چائے نہیں پیوں گا''۔ شانتی اسے سمجھاتے ہوئے کہتی ہے۔ ''یہ ظلم نہ کیجئے۔ باقی جو بھی من میں آئے کیجئے۔ مگر شراب چھوڑ دیجئے۔ یہ آپ کی دُشمن ہے''۔ گوپی چند آ کر کہتا ہے۔ ''بہن جی کیوں اتنا مجبور کر رہے ہو اُسے''۔ ناگپال اُسے کہتا ہے ''یہ یہاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے''۔ جوں جوں کر کے ناگپال چائے پیتا ہے اور شانتی واپس چل جاتی ہے۔ گوپی چند ناگپال سے اپنے کام کا تقاضا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ پیسے لیے کر بھی کام نہیں کرتا ہے۔ افسر کو پتا چلتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ناگپال نے گوپی چند سے پیسے لیے ہیں اور سارے ہی خود کھائے ہیں۔ افسر ناراض ہو کر کہتا ہے۔ ''اکیلے پیسے کھاتے ہو اور چپراسی تک کو اس کا حصہ نہیں دیتے ہو۔ اس کے بعد مدن بھی آتا ہے

اور کہتا ہے کہ جھوٹی گواہی دینا پاپ ہے۔چندر پرکاش افسر کے پاس جاتا ہے۔شکایت کرتا ہے کہ اس کے بل پاس نہیں ہوتے۔افسر کہتا ہے وہ دولاکھ کا بل ہے۔مہندر پرکاش جلدی سے کہتا ہے۔''جناب میں خدمت کر چکا ہوں''۔افسر ناگپال کو بلاتا ہے۔ناگپال شرمندہ کوہر سر جھکائے ہوئے آتا ہے۔بھگتو چپراسی کہتا ہے کہ اس نے میرے نام پھر بھی پیسے کھانے شروع کر دیئے ہیں۔افسر کہتا ہے''کیا کرو اس کی بیوی پر رحم آتا ہے''۔ مہندر پرکاش کے اِس آخری جملے کے ساتھ ہی یہ ایکٹ بھی اختتام کو پہنچتا ہے''۔''جناب جو لوگ چوری میں چوری کرتے ہیں۔ان سے بڑھ کر پاپی کون ہوسکتا ہے''۔

ڈرامے کا پانچواں سین سریش اوراُس کے پڑوس میں رہنے والی لڑکی آشا کے ایک دوسرے کو بار بار دیکھنے سے شروع ہوتا ہے۔اتنے میں شنکر آتا ہے اور کہتا ہے۔''عجیب بات ہے وہ آج بھی کھڑکی میں کھڑی ہو کر اِدھر دیکھ رہی ہے''۔سریش کہتا ہے پتا جی میں نے سنا ہے۔میر دادا جوان تھے۔وہ بھی اسی کمرے میں رہا کرتے تھے۔شنکر بولتا ہے یہ گھور پاپ ہے''۔اس طرح کچھ دیر باپ بیٹے میں نوک جھونک رہتی ہے۔ اور بعد میں شنکر چلا جاتا ہے۔سریش اور آشا ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔یہ ایکٹ آشا کے اس جملے پر ختم ہو جاتا ہے۔''سریش ہم ایک دوسرے کو دور سے دیکھیں گے، دور سے چاہیں گے''۔

چھٹے سین میں مندر کا منظر دکھایا گیا ہے۔پربھا نرملا۔نیلم اور رادھا کی ایسی بات چیت سے یہ ایکٹ شروع ہوتا ہے۔پنڈت اُن سے کہتا ہے۔''دُنیا کچھ بھی نہیں۔ایک کھیل ہے۔ڈراما ہے۔پربھا کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے۔تو نیرج دوڑ کر جا کر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔پربھا نیرج سے اپنی نفرت ظاہر ہوتی ہے۔ پھر پربھا اور نیلم رنگ ساز کے بارے میں باتیں کرتی ہیں۔سبھا بھی اُن کی بات چیت میں شامل ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ رنگ ساز مر گیا۔تب سریش آتا ہے اور نیرج کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔جب شما آتی ہے تو اب نریش سے اظہار محبت کرتی ہے۔اتنے میں آلکا پھول توڑنے جاتی ہے۔تو پنڈت کہتا ہے۔''الکا جی پھول سنبھل کے توڑنا۔کل ہی دو دیدی کے ہاتھوں میں کانٹا چب گیا تھا''۔پھر چنبیلی اور درشن بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔نربدا اتنے میں دودھ کا بھرا ہوا گلاس پنڈت کو پیش کرتی ہے اور بڑے آرام سے دودھ پیتا ہے۔ دھرم پال اور سکھرام بھی باتیں کرتے ہیں۔دھرم پال کہتا ہے۔رشوت نہ کھانا میرا اصول ہے۔کام کرنا میر دھرم

ہے''۔ دھرم پال مندر پوجا کے لیے نہیں بلکہ اتوار کو لوگوں سے ملنے کے لیے جاتا ہے۔ پنڈت کو وہ کہتا ہے ۔''ایشور کو ماننے یا نہ ماننے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا۔ کہ میں ہر پاپ کی سزا چاہتا ہوں۔ انجانے میں جو گناہ میں نے کیے ہیں۔ انھیں بھی بخشوانا نہیں چاہتا ہے۔''سچائی اور ایمانداری خود اپنے ہونے کی وجہ ہے ۔میں رشوت اس لئے نہیں لیتا۔ کیونکہ ملازم کو رشوت نہیں لینی چاہیئے''۔ اتنے میں ایک عورت آتی ہے اور اپنے بچے کی موت کے لیے دُعا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ بیمار ہونے کی وجہ سے بستر پر پڑا ہوا ہے۔ وہ کہتی ہے پنڈت جی اس کا دُکھ برداشت نہیں ہوتا''۔ اور وہاں اس کی وجہ سے دوسرا لڑکا بھی دُکھی ہے۔ وہ کھل کر جی نہیں سکتا۔ ہنس نہیں سکتا''۔ نیرج اور سریش عورتوں کا جھرمٹ دیکھ کر بات کرتے اور ہنستے ہیں اس طرح نیرج اور سدھا بھی باتیں کرنے لگتی ہیں۔ شنکر سریش سے کہتا ہے۔''ارے پاپی یہ کیا کر رہا ہے۔ کنواری کنیا کو دیکھ رہا ہے۔ یہ گھور پاپ ہے''۔ سریش فوراً جواب دیتا ہے۔''یہ دُنیا بڑی عجیب ہے۔ کنواری کنیا کو اس لیے دیکھنا پاپ ہے کہ وہ کنواری ہے اور بیاہی کو اس نے دیکھا کہ وہ بیاہی ہے اور دُنیا میں عورتوں کی دو ہی قسمیں ہیں۔ کنواری اور بیاہی''۔ اِدھر سے سُدھیرا اپنے پتاشو سے کہتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر مس نلنی سے شادی کرے گا۔ شنکر گرجتے ہوئے کہتا ہے''غیر مذہب کے اندر اگر تو نے شادی کی تو تمہارا ہمارا کوئی رشتہ نہ رہے۔ تم اچھوت ہو جاؤ گے ''۔ سدھیر اور آشا دونوں باتیں کرتے ہیں اور یہ ایکٹ بھی اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

زیر تبصرہ ڈرامے کے ساتویں سین میں کلاس روم کو دکھایا گیا ہے۔ جہاں شنکر کا چھوٹا بیٹا رمیش اور اُس کی دوست نیلوفر بڑھتے ہیں۔ رمیش کی قمیض پھٹی ہوئی ہے۔ گھر والوں نے پرانی کتابیں پڑھنے کو دی ہیں۔ نیلو اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ چپکے سے اپنا پین رمیش کو دیا ہے۔ رمیش کی تلاشی لی جاتی ہے۔ گورو اور تیواڑی ماسٹر کی مدد کرتے ہیں۔ رمیش کو مار پڑتی ہے۔ نیلو راستے میں اس سے افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ رمیش گھر پہنچتا ہے۔ سریتا اُس کی حالت دیکھ کر تلملا اُٹھتی ہے۔ غصے میں رمیش کی پٹائی کرتی ہے۔ بعد میں اپنے آپ کو ہی کوستی ہے۔ شنکر آتا ہے اور غصے سے لال پیلا ہو جاتا ہے۔ سریش مداخلت کرتا ہے اور اُس طرح شام کے کھانے کا وقت آنے کے ساتھ ہی یہ ایکٹ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

آٹھواں سین دھرم پال کا گھر دکھایا گیا ہے۔ اُس کی بیوی رادھا بھی اُس کے قریب بیٹھتی ہے

۔رادھا دھرم پال سے مخاطب ہوکر کہتی ہے۔صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ مندر کیوں نہیں جاتے ہو''۔ آخر مکتی بھی کوئی چیز ہے۔ دھرم پال فوراً جواب دیتا ہے۔''میں مکتی چاہتا ہی نہیں ۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بس دریا کی طرح بہنا چاہتا ہوں۔ جوایک ہی وقت میں نکلتا بھی رہتا ہے۔ بہتا بھی رہتا ہے۔سمندروں میں ملتا رہتا ہے''۔ اتنے میں اُن کے بیٹے انوج اور شرد آتے ہیں۔ اور مختلف معاملات پر بات کرتے ہیں ۔ پھرایک شخص چلاتا ہے۔ پکڑو پکڑو دھرم پال اس سے پوچھتا ہے کہ کسے پکڑنا ہے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ اس کی لڑکی ایک اجنبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ دھرم پال اُسے مشورہ دیتا ہے کہ اُس لڑکی کی اُسی شخص سے شادی کردو۔ پھر گوپال کیلوں سے بھرالفافہ لے کر دھرم پال کے ہاں آتا ہے۔ دھرم پال رادھا کی مرضی کے خلاف اُسے رشوت جان کر واپس آتا ہے۔ دھرم پال کا دوست پٹیل آکر کہتا ہے کہ اُس کے اخراجات اُسے رشوت لینے پر مجبور کررہے ہیں۔ دھرم پال کا کہنا ہے کہ معاف کرنا سب سے بڑا گناہ ہے اور معافی مانگنا اس سے بھی بڑا پاپ۔ پھرانوج کہتا ہے کہ اُس نے خواب میں بھاسکر اور ریڈی کو ایک ہی جگہ پر بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک سادھو کہہ رہا تھا کہ ریڈی نے پچاس فی صد فیصلے اس لیے غلط کیے۔ کیونکہ وہ رشوت کھاتا تھا۔ اور بھاسکر راؤ نے اس لئے غلط کیے کیونکہ وہ نالائق تھا''۔ دھرم پال کی حیرت اس سے دور ہو جاتی ہے۔ اتنے میں ایک سادھوایک روپیہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے بدلے میں بھگوان دس لاکھ دے گا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ سادھو کو ایک پیسہ چاہیئے ۔ سادھو کو بھوک لگی ہے۔ دھرم پال اسے کھانا کھلاتا ہے ۔ یہ دیکھ کر رادھا کہتی ہے ۔''آج آپ بڑے گیان کی باتیں کررہے ہیں''۔ دھرم پال جواب دیتا ہے کہ گیان خود ہی اپنا پرچارک ہے۔ وہ اپنی روشنی خود ہے۔ اس کی آنکھیں نہیں ہیں مگر وہ دیکھتا ہے کان نہیں۔ مگر سنتا ہے۔ دھرم پال رادھا اور سادھوں کو گندم کا دانہ دکھاتے ہوئے کہتا ہے۔''یہ جب زمین میں بویا جائے گا۔ تو بے شمار دانوں کو ساتھ لئے گرائے گا۔ یہ گیان ہے اور اسے زمین میں بوکر ایسے ہی کئی دانوں کے ساتھ لیے گرانا کرم ہے۔ اور پھر یہ بھی یادرکھو۔ جو گیانی ہے۔ وہ کرم کرتا ہے۔ اور جو کرم کرتا ہے وہی گیانی ہے اس کے ساتھ ہی یہ ایکٹ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

نویں سین میں سریش اور اُس کی ماں سریتا گفتگو کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سریش بیمار ہے۔ وہ

اپنی ماں سے اپنے ارمانوں کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے" کاش میں تجھے زندگی میں کچھ دے سکتا؟۔ مان تم پریشان کیوں ہو؟۔ مگر سریتا کو غم ہے کہ سریش کو اسکول سے نکال دیا گیا ہے۔ سریش کہتا ہے" یہ ہونا ہی تھا۔ مان آخر کب تک رمیش پتاجی کی ایمانداری کا بوجھ اُٹھا کر چلتا رہتا ہے۔ اب ایسا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اتنے میں رام اوتار وہاں آتا ہے۔ سریش اُسے بتاتا ہے کہ وہ بیمار پڑا ہے۔ نہ جانے کب وہ مر جائے گا۔ جب رام اوتار اُس سے شنکر کی ایمانداری کا تذکرہ کرتا ہے۔ تو سریش جل کر کہتا ہے مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں اور پھر پتاجی اس لیے ایماندار نہیں ہیں۔ کہ ایمانداری ان کا اصول ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ بزدل ہیں۔ رشوت لینے کی جرات نہیں۔ وہ اپنے بچوں کے آرام کے لیے پاپ کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اب دیکھو نہ دھرم پال۔ انکل بھی ایماندار ہیں مگر اس لیے نہیں کہ وہ بزدل ہیں بلکہ اس لیے کہ ایمانداری اُن کا اصول ہے"۔ اتنے میں سدھیر آتا ہے۔ سریش اُس سے مبارک باد دیتا ہے کیونکہ اُس کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا ہے۔ سدھیر جواب دیتا ہے بھیا مبارک بادینی ہے تو پتاجی کو دو۔ جو تمام زندگی ہمارے لئے پاپ کرتے رہے۔ سدھیر کو سریش اطلاع دیتا ہے کہ دھرم پال کالڑکا انوپ پولیس انسپکٹر کی ٹریننگ کے لیے سلیکٹ ہوا ہے۔ مگر اِس کا چھوٹا بھائی انوپ چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ پھر رمیش آتا ہے اور کہتا ہے کہ اُسے اسکول سے نکال دیا گیا ہے۔ گلی میں رادھے گوپی کو مار رہا تھا کیونکہ وہ اُس کی بہن سرما کے قریب آنا چاہتا تھا۔ سریش رام اوتار اور سدھیر لڑکیوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اور یہ سین بھی سریش کو ہسپتال لئے جانے کے فیصلے پر ختم ہو جاتا ہے۔

ڈرامے کا دسواں سین۔ ناگپال کے دفتر سے تعلق رکھتا ہے۔ ناگپال بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ ایک بوڑھا آتا ہے اور ناگپال سے خیر و عافیت پوچھتا ہے۔ ناگپال خالی جیب ہونے کی وجہ سے اُس شخص سے کچھ روپیہ پیسہ مانگتا ہے۔ ساتھ ہی شراب پینا شروع کر دیتا ہے۔ افسر غصے میں آ کر کہتا ہے۔ "حرام زادہ اسے نوکری سے نکالنے کا دِل بھی نہیں کرتا ہے۔ بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہاتھ کانپتے ہیں جو اکھیلتا ہے اور دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ وہ لڑکی ناگپال سے کہتی ہے۔" پتاجی میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد آپ کا کام بھی کر دوں گی"۔ کلرک ناگپال سے پوچھتا ہے کہ بوڑھا ہونے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ ناگپال فوراً جواب

دیتا ہے کہ وہ شانتی سے معافی مانگ لے گا جو معاف کر دے گی۔ کیونکہ وہ ایک پتی ورتا استری ہے اور اپنے پتی کو پرمیشور مانتی ہے۔ پھر دینا ناگپال کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ اُسے برابر بدنام کرتا ہوا چلا آرہا ہے۔ ناگپال دفتر سے سیدھا مندر جاتا ہے اور مندر میں پجاری سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''بھگوان بڑا دیالو ہے۔ وہ گنہگار کو صاف کر دیتا ہے''۔ دھرم پال وہاں آکر جلدی سے کہتا ہے۔ ''تم شاید اسی لیے پوری زندگی ظلم کرتے رہتے ہو۔ کیونکہ تمہیں معلوم تھا کہ گناہ معاف بھی ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کے کردار کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ سماج پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناگپال اور دھرم پال کے یکے بعد دیگرے چلے جانے کے ساتھ ہی یہ سین بھی ختم ہو جاتا ہے۔

گیارہویں سین میں ناگپال کا گھر دکھایا گیا ہے۔ گھر پہنچتے ہی وہ اپنی بیوی شانتی سے کہتا ہے۔ کہ اُسے پیٹ میں سخت درد ہے۔ پیسے ختم ہو گئے ہیں۔ اور تنخواہ ملنے کو ابھی پندرہ دِن باقی ہیں۔ اگر شراب نہ پیے گا تو مر جائے گا۔ شانتی کہتی ہے کہ وہ جیب خالی ہونے کی وجہ سے خود صبح سے بھوکی بیٹھی ہے۔ ناگپال شانتی کے پاؤں پکڑ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اگر میں مر گیا تو تم بیوہ ہو جاؤ گی۔ اور ہندو دھرم کے مطابق بیوہ کو نہ اس دُنیا میں چین ہے اور نہ ہی اگلی دُنیا میں''۔ یہ سُن کر شانتی دوڑ کر جاتی ہے اور مہادیو سے پچاس روپے کا نوٹ چھین کر لاتی ہے۔ اس کے بعد مہادیو اور شانتی مکان کے اندر چلے جاتے ہیں۔ مہادیو اپنے من کی ہوس نکالتا ہے اور شانتی کو بُری طرح سے تڑپتا ہے۔ وہ عمر بھر کا بدلہ شانتی کی مجبوری دیکھ کر اس سے معر بھر کا بدلہ مانگتا ہے۔ وہاں سے چھوٹ کر شانتی ناگپال کو پیسے دیتی ہے۔

ناگپال شراب میں مست ہو جاتا ہے۔ جب شانتی کھانا کھانے کو کہتی ہے تو نشے کی حالت میں بڑبڑاتا ہے۔ ''تم نے تم نے مجھے کھانے کے لئے کیوں کہا۔ تمہاری ایسی جرت کیسے ہوئی۔ شرم نہیں آتی۔ میری بیوی ہو کر مہادیو کے پاس جاتی ہے''۔ شانتی پریشان ہو کر کہتی ہے۔ ''بھگوان! اگر تم نے انھیں بے رحم بنایا تھا تو مجھے رحم دل کے اندر پتی کے لیے محبت کیوں پیدا کی؟۔ اتنے میں سریتا آتی ہے اور شانتی کو بتاتی ہے کہ سریش ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے اور رمیش لوفر ہو گیا ہے۔ شنکر بھی از حد کمزور ہو گیا ہے۔ شانتی جواب دیتی ہے ۔''مجھ سے بے ایمانی کا بوجھ نہیں اُٹھایا جاتا ہے۔ تم ایمانداری کے بوجھ تلے دب گئی ہو''۔ سریتا کے وہاں سے

چلے جانے کے بعد شانتی سوجاتی ہے۔اور یہ سین بھی ختم ہوجاتا ہے۔

بارہواں سین: بارہویں سین میں ہسپتال کا منظر دکھایا گیا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں سریش لیٹا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی راموکا بستر بھی ہے۔ رامودرد کے مارے چیخ اُٹھتا ہے۔ سریش وہاں سے گذرنے والی نرس سے کہتا ہے کہ آشا کی شادی ہونے والی ہے۔ نرس نے حامی بھرتے ہوئے کہا کہ ہم دونوں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ راموپھر چلاتا ہے ۔ کمپاؤنڈر راموکو ٹیکا لگاتا ہے۔ راموزس سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا ہے۔ لیکن وہ چپ رہتی ہے۔شنکر آتا ہے اور سریش سے خیریت معلوم کرتا ہے۔ سریش اُن سے کہتا ہے کہ آشا کی شادی ہونے والی ہے ۔شنکر کے اصرار کے باوجود سریش کوئی بات نہیں کرتا ہے۔ سریش تھوکتا ہے اور اس میں خون دیکھ کر شنکر چونک اُٹھتا ہے ۔ اتنے میں سریتا بھی ادھر آتی ہے۔ شنکراورنرس کے چلے جانے کے بعد رات کوسناٹا چھاجاتا ہے۔اچانک راموکے تڑپنے کی آواز آتی ہے۔"اُف بھگوان مجھے موت دے"۔

درد برداشت سے باہر اور اُس دوکان دار کی گالی سے بھی زیادہ ہے۔ جو جب پیار کرتا تھا تب بھی ماں کی گالی دیتا تھا۔ جب نفرت کرتا تھا تب بھی ماں کی گالی دیتا تھا۔"ہاں ایشور مجھے موت دے"۔

راموکی آواز سن کر ڈاکٹر اور نرس آتے ہیں۔ رامو ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ کر کہتا ہے"ڈاکٹر مجھ پر رحم کرو۔ مجھے مرنے دو۔ میں بچ نہیں سکتا۔مگر یہ درد مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا۔ اتنے میں شنکر ہسپتال کے اندر داخل ہوتا ہے پھر سدھیر اور نلنی آتے ہیں ۔سدھیر نلنی سے کہتا ہے کہ وہ شنکر چچا کے پاؤں چھوئے ۔مگر شنکر اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے" رہنے دو سدھیر تم نے تو خاندان کی ناک کٹوائی ہے۔کیا اپنی برادری میں کوئی لڑکی نہیں تھی"۔ اس رشتے پر سریش اور شنکر میں گرم سرد بحث ہوتی ہے۔ نرس کے کہنے پر شنکر۔سدھیر اور نلنی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ پھر رامو دوبارہ نرس کو بلاتا ہے۔ کہ اُسے موت کا ٹیکا لگوایا جائے۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر گرجاتا ہے۔ سریش اسے دیکھتا ہے اور اتنی دیر میں تکیے کے نیچے سے چاقو نکال کر راموکے پیٹ میں ماردیتا ہے۔ راموکہتا ہے کہ قتل ہوگیا۔"بھگوان تمہارا بھلا کرے"۔ نرس آواز دیتی ہے۔"خون خون" کمپاؤنڈر کہتا ہے کہ قتل ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر دوڑتا ہوا آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ قتل کس نے کیا۔ نرس سریش کو پکڑنے کے لیے کہتی ہے۔ سریش کہتا ہے۔"ڈاکٹر میں بھاگ رہا ہوں"۔

اتنا کہہ کر سریش مر جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی سین نمبر بارہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

زیر نظر ڈرامے کے آخری سین میں شو جو ضعیف المعر ہے۔ بازار سے گذر رہا ہوتا ہے۔ اتنے میں ایک گاڑی اس سے ٹکرا جاتی ہے۔اور وہ گر جاتا ہے۔لوگ اُسے اُٹھا کر ہسپتال لئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کو نرس بتاتی ہے کہ شیو ڈاکٹر سدھیر کا پتا ہے۔شیو کو آپریشن تھیٹر کے اندر لئے جاتے ہیں۔ باہر لوگوں کی بھیڑ میں موجود بعض اشخاص کہتے ہیں۔''بچ جائے گا بھائی''۔بھگوان نے ہاتھ دیا ہے۔''نیت جو صاف رہی اُس کی''۔کھایا بھی خوب اور کمایا بھی خوب۔''جس سے لیا اس کا کام ضرور کیا''۔''غریب کو کبھی ستایا نہیں اس نے''۔سدھیر تھیٹر سے باہر نکل کر لوگوں سے کہتا ہے کہ شیو بچ گیا ہے۔ جب نرملا آتی ہے۔تو شیو اُسے کہتا ہے کہ اُس کی ٹانگ کٹ گئی ہے۔نرملا رونے لگتی ہے۔شیو اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔''مگر اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ پاپوں کا پرشچت ہے۔وہ بات ہے جس کی وجہ سے سدھیر ڈاکٹر بن گیا اور رمن انجینئر بنا۔ نرملا جسے تو اوپر کی آمدنی کہتی ہے۔وہ رشوت تھی''۔شیو کو گھر لے جاتے ہیں۔وہ مندر جا کر گیا شیب لگانے کی تمنا کرتا ہے۔اتنے میں دھرم پال حال چال پوچھتا ہے۔شیو اُس سے کہتا ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں اور اپنے پاپوں کا پراشچت کر رہا ہوں۔سزا بھگت رہا ہوں۔پھر شیو بیساکھیوں کے سہارے مندر جاتا ہے۔دھرم پال بھی اس کے ساتھ چلتا ہے۔ابھی پنڈت جی اور دھرم پال علیک سلیک یہی کرتے ہیں کہ سریتا انھیں بتاتی ہے کہ شنکر گھر چھوڑ کر جنگل جا رہا ہوں۔بھگوان کو پانے کے لیے تپسا کرنے کے لیے،تمہارا میرا جیسا بھی رشتہ تھا ختم ہو گیا ہے۔ وہ دھرم پال سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے۔''بھگوان کو یاد کرو۔وہ تمام پاپ معاف کر دیتے ہیں۔بخش دیتے ہیں۔تم ایک ایماندار آدمی تھے۔تم نے تمام زندگی رشوت نہیں لی۔مگر تمہارا بیٹا ارون چور کیوں نکلا۔''دھرم پال جواب دیتا ہے۔مگر میرا بیٹا پولیس انسپکٹر بھی تو ہے۔ مجھے اپنے ایک لڑکے کے چور بنے کا اس لیے غم نہیں ہے کیونکہ دوسرے لڑکے کے پولیس انسپکٹر بننے پر میں خوش نہیں ہوں۔''ایک شخص دھرم پال اور نا گپال کو بتاتا ہے کہ رمیش چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ایک اور شخص یہ فقرہ کستا ہے۔''باپ ایماندار بنا ہوا تھا۔ بگلا بھگت''۔ دوسرا بولتا ہے''کاہے کا ایماندار کام تو کسی کا کرتا نہیں تھا''۔ تیسرا آدمی بولتا ہے۔''منہ میں رام رام اور بغل میں چُھری''۔ دھرم پال سب سن کر کہتا ہے۔''لوگ بھول گئے ہیں کہ شنکر ایماندار تھا۔اور رشوت

نہیں کھاتا تھا''۔ اتنے میں ایک عورت آ کر شِو کے قدموں پر گرتی ہے اور اُسے بتاتی ہے کہ سدھیر نے اُس کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ ایک شخص وہاں کھڑا ہے اور کہتا ہے۔ ''سدھیر نہ ہوتا تو اُس کا بیٹا مر گیا ہوتا''۔ دوسرا شخص کہتا ہے ''جیسا باپ ایسا بیٹا'۔ شِو ان لوگوں کو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ان کی مہربانی ہے۔ ورنہ وہ کہاں اس قابل ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔ ایک شخص فوراً کہتا ہے۔ ''آپ مہان ہیں۔ جن کا ایسا بیٹا ہے۔ آپ کا نام صبح لینے کے قابل ہے۔ دھرم پال یہ سن کر کہتا ہے۔ کہ لوگ بھول گئے ہیں کہ شِو رشوت لیتا تھا۔ اس طرح سے تیرہواں سین بھی اور ڈراما ''تپسوئی کون'' بھی انجام تک پہنچتا ہے۔

پلاٹ: قصہ میں واقعات کی زمانی و منطقی ترتیب اور اِن واقعات کے مابین رابطہ و تعلق پلاٹ کہلاتا ہے۔ ڈراما میں پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر پلاٹ کے ڈراما وجود میں آ ہی نہیں سکتا ہے۔ ڈرامے کے لیے پلاٹ اس طرح سے ضروری ہے کہ جس طرح ایک مکان کی تعمیر کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا ضروری ہے۔ پلاٹ کا پہلا اصول یہ ہے کہ پلاٹ غم واند کے واقعات پر مبنی ہے۔ اور کردار علی طبقے سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ شان وشوکت اور وقار وحشمت کا پس منظر رکھتے ہوں۔ یونانی مفکر ارسطو نے اعلیٰ ترین جذبات اور سنجیدہ خیالات کی پیش کش پر بھی زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ واقعات کے پیش آنے میں ارتقائی کیفیت اور آغاز وسط اور انجام کے مراحل پر بھی ارسطو نے زور دیا ہے۔ واقعات کی منطقی ترتیب یا پلاٹ کو مشاہرین ادب نے چھ مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) آغاز یا تمہید (۲) ابتدائی واقعہ (۳) عروج کا آغاز (۴) نقطہ عروج (۵) زوال (۶) انجام

یہ تمام مرحلے آنند لہر کے ڈراما ''تپسوئی کون'' کے پلاٹ میں شامل ہیں۔

اس ڈراما میں واقعات، انتخاب، ترتیب اور تسلسل میں مصنف نے فنی مہارت دکھائی ہے۔ انھوں نے قصہ میں کشمکش، تصادم اور تذبذب پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پلاٹ مربوط ہے اور تمام واقعات فطری انداز میں پیش آئے ہیں۔ مصنف نے یہ ڈراما تخلیق کرتے وقت فنی مہارت سے کام لیا ہے۔

کردار نگاری: ڈراما کا دوسرا اور اہم جز کردار نگاری ہے۔ کوئی بھی ڈرامہ کرداروں کے بغیر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ کردار نگاری کے سلسلے میں پہلا اصول یہ ہے کہ کرداروں کو اپنی سماجی حیثیت، تہذیبی پس منظر، تعلیمی

لیاقت، مزاج وفطرت، فکروخیالات، عادات واطوار، احساسات وجذبات اور نفسی کیفیات کی مکمل اورفطری نمائندگی اپنی گفتگو، اپنے رویہ اوراپنے عمل کے ذریعہ کرنی چاہیئے ۔ تب ہی ان کرداروں کوفطری کردار کہا جاسکتا ہے۔اور کردرنگاری یا سیرت نگاری کے تعلق سے ان کی اہمیت ہوگی۔ڈراما ''تپسوئی کون' میں کم وبیش سبھی کرداروں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ فکروعمل نیز تجربہ،رویہ کے اظہار کے نقطہ نظر سے ان کی حیثیت نہایت فطری ہے۔آنند لہر شنکر کی ایمانداری،شوکی ایمانداری اور رشوت خوری، دھرم پال کی رشوت خوری اور مکاری اور کرشنا کی رومان پرستی اور مس ورما کی بے چارگی،تذبذب اور داخلی کشمکش کی جیسی جیتی جاگتی اور حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔وہ کردارنگاری کے فن پران کی گرفت کا بین ثبوت ہیں۔کردارنگاری کے لحاظ سے آنند لہر کا یہ ڈراما عمدہ ڈراما ہے۔آنند لہر نے تمام کرداروں کو بروقت اور اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق کرداروں کی سیرت مرتب کی ہے۔کرداروں کی زبان ہی استعمال کی ہے۔

مکالمہ نگاری: ڈرامے کا انتہائی اہم جزومکالمہ نگاری ہے۔کیونکہ خیالات وجذبات کی ترسیل مکالمے کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔جسم کی حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات کسی حد تک ہی خیال وجذبہ کی ترسیل کرسکتے ہیں ۔کرداروں کے تہذیبی وسماجی پس منظر، عادات واطوار اورفکرواحساس سے مکالمے ہی واقف ہوتے ہیں۔مکالموں کے اعتبار سے بھی آنند لہر کا یہ ڈرامہ اچھا ہے۔اس کے مکالمے ماحول سے مسابقت رکھنے والی آراستہ وپیراستہ زبان میں لکھے گئے ہیں جونہایت ہی برجستہ اور معنی خیز ہیں۔''تپسوئی کون'' کے مکالموں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ کرداروں کے مزاج اورفطرت سے بھی قریب ہیں اوران کی جذباتی کیفیت کا اظہار بھی ان سے بخوبی ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ عمل بھی قابل توجہ ہے کہ آنند لہر نے تمام مکالموں میں گفتگو کا انداز رکھا ہے۔

منظر کشی: ''تپسوئی کون'' تیرہ مناظر پر مشتمل ایک مکمل ڈراما ہے۔اس ڈراما میں منظر کشی کرتے ہوئے آنند لہر نے ایک ایماندار پولیس آفیسر کو بتایا ہے۔ جواپنی ایمانداری پر گمان کرتا ہے۔اس کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی منظر کشی کی گئی ہے جوایک رشوت خور کلرک ہے۔جوخوب رشوت کھا کر لوگوں کے کام کرتا ہے

اورلوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔آخر میں آہر صاحب ایک بے ایمان رشوت خوری کی منظرکشی کرتے ہیں جورشوت کھا کر بھی لوگوں کے کام نہیں کرتا ہے۔اس طرح کے مناظراس ڈراما میں پیش کیے گئے۔اس طرح اِن مناظر کومعنوی اعتبار سے بھی ڈرامے کے لیے اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔منظرنگاری ڈرامے کا ایک اہم جز ہے۔

تصادم وکشمکش: ڈراما''تپسوئی کون'' کی کشمکش مختلف صورتوں پر رکھی گئی ہے۔اس ڈراما میں کشمکش کی پہلی صورت یہ ہے۔شنکرایک ایماندار پولیس آفیسر ہوتا ہے۔وہ کسی سے بھی رشوت نہیں لیتا ہے۔وہ اپنے بیٹے اور بیوی سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ایک ایسا آفیسر ہوں جو پولیس محکمہ میں رہ کر بھی رشوت خوری سے دور ہو۔اس کی بیوی اور بچے اس سے تنگ ہیں۔کیونکہ رشوت کے پیسوں کے بغیراُن کا خرچہ پورا نہیں ہوتا ہے۔اور نہ ہی یہ لوگوں کے کام کرتا ہے جس کی وجہ سے لوگ بھی اس پر تنگ ہیں۔

اس ڈراما میں تصادم اور کشمکش کی دوسری صورت شنکر کا بھائی شو ہے۔ جوایک دفتر میں کلرک کے عہدے پر ہے۔لیکن یہ رشوت خور ایماندار ہے۔یہ رشوت لے کرلوگوں کے کام وقت پر کرتا ہے اوراس کے بیوی بچے بھی اس پر خوش ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔

اس ڈرامے میں تصادم کی تیسری صورت یہ ہے کہ دھرم پال نام کا ایک بے ایمان رشوت خور ہے جورشوت خوب کھاتا ہے مگرلوگوں کے کام نہیں کرتا ہے بلکہ یہاں تک شراب کے لیے اپنی بیوی کی عزت بھی داؤ پرلگادیتا ہے۔اس قسم کا تصادم اور کشمکش اس ڈرامے میں پائے جاتے ہیں۔تصادم وکشمکش ڈراما کا ایک اہم جز ہے۔اگرڈراما میں تصادم وکشمکش نہ ہوتو ڈراما مکمل نہیں ہوتا ہے۔

نقطہ عروج: نقطہ عروج سے مراد قصہ میں کشمکش اور تصادم کا اپنی انتہا تک پہنچ جانا ہے۔تصادم کی یہ صورت زیادہ دیر تک باقی نہیں رکھی جاسکتی ہے۔اس لیے نقطہ عروج پرایسے واقعات سامنے آنے لگتے ہیں جن سے کسی ایک فریق کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔''تپسوئی کون'' میں نقطہ عروج کا آغاز اس منظر سے ہوتا ہے جب ناگپال شراب کے لیے پریشان ہوتا ہے۔تو اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ میں مرنے جارہا ہوں ۔تو بیوی اُس کی جان بچانے کے لیے اپنی عزت کسی دوسرے کے حوالے کرکے اپنے خاوند کوشراب کے لیے

پچاس روپے دیتی ہے۔ جب ناگپال نشے سے فارغ ہوتا ہے تو اس کی پٹائی کرتا ہے ۔اس طرح سے یہ ڈراما نقطہ عروج پر پہنچتا ہے۔

انجام: ڈرامے کی آخری منزل انجام ہے۔ انجام کو نتیجہ خیز، فطری اور کامیاب بنانا ڈرامہ نگار کی ذمہ داری ہے۔ اگر پلاٹ کے سبھی واقعات باہم مربوط اور تسلسل سے پیش آئیں تبھی انجام فطری ہوگا۔ ڈراما ''تپسوئی کون'' کا انجام واقعات کے فطری نتیجے کے طور پر سامنے آتا ہے کیونکہ شنکر، شوا اور ناگپال کے مابین جو کشمکش تھی اور جس طرح سے سبھی کردار اپنے خوابوں، اپنے اصولوں، اپنے مقاصد اور اپنے جذبوں کے اسیر تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ سب سے کمزور کردار ناگپال کا نشے کی حالت میں ہونا مکمل تباہی ہوسکتا۔ انجام کا ہونا ڈرامے میں بہت ضروری ہے۔ انجام کے بغیر ڈراما مکمل ہی نہیں ہوسکتا ہے۔

زبان وبیان: آنند لہر کے ڈراما ''تپسوئی کون'' میں جو زبان استعمال ہوئی ہے۔ وہ سادہ اور سلیس ہے۔ جو عام سامعین کو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ان کے ڈراموں میں زباں وبیاں کا لطف شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ان کے ڈراموں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ روزمرہ اور عام بول چال کا لطف قائم رہے۔

آنند لہر کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعہ ''سرحدیں'' کا تنقیدی جائزہ

اُردو کے نشریاتی ادب میں ریڈیو ڈرامے کا اہم مقام ہے۔ عام طور پر ریڈیو کے ذریعے نشر کیا جانے والا پروگرام نشریاتی ادب کہلاتا ہے۔نشریاتی ادب کا ایک اہم حصہ نشری ڈرامے ہیں۔ یہ ریڈیو کی ایک طاقت ورصنف ہےاور ڈراما جب زوال پذیر ہو رہا تھا۔تو ریڈیو نے اسے بڑی حد تک سنبھالا۔ ریڈیو ڈرامے میں اسٹیج ڈرامے سے زیادہ امکانات موجود ہیں۔ اس کا میڈیم صوت وآواز ہے۔ ریڈیو ڈرامے میں آوازوں کے ذریعے ساری کیفیت اور پس منظر کو پیدا کیا جاتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے میں یہ ممکن ہے کہ ہم زمانے کو آگے پیچھے کردیں۔ ہندوستان میں ریڈیو ڈرامے کی نشریات سے قبل ہی بی بی سی (B.B.C) سے ریڈیو ڈرامے نشر ہوتے تھے۔ ہندوستان میں بھی اسی طرز پر ریڈیو ڈرامے نشر کیے گئے۔ ریڈیو سے اُردو ڈرامے اچھی خاصی تعداد میں نشر کیے گئے۔ ریڈیو کی سب سے اہم اور مقبول صنف ڈراما ہے۔ یہ خالص ریڈیائی صنف ہے۔ جو ڈرامے کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے اتنا ترقی کر گیا کہ آج اس کے بغیر ریڈیو ڈرامے کی تاریخ نامکمل ہے۔ ریڈیو ڈرامے نے اُردو تھیٹر کو نہ صرف نئی زندگی عطا کی بلکہ ہندوستانی ڈرامے میں ایک نئی جان ڈال دی۔ آغاز میں ریڈیو ڈرامے کے لیے کوئی خاص اصطلاح استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ ایک ہی دور میں اس صنف کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔ کوئی اسے نشری ڈراما تو کوئی نقاد اسے ریڈیو پلے کہتا ہے۔ اور کسی ادیب نے یک بابی اور ریڈیائی ڈرامے کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ریڈیائی ڈرامے کے لیے سب سے ضروری چیز ڈرامے کا اسکرپٹ ہے۔ ڈرامہ نگار کا ریڈیائی تکنیک پر عبور حاصل ہونا چاہیئے تبھی وہ کامیاب اسکرپٹ لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو ڈراما نویسوں نے بہت مشہور ڈرامے اور کہانیاں ریڈیائی روپ میں ڈالی ہیں۔ اور یہ تجربے کامیاب رہے ہیں۔ ریڈیو ڈراما نگاروں نے زندگی کی حقیقتوں کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا ہے۔ روزمرہ زندگی کے مسائل ملکی آزادی کی جدوجہد، تاریخی اور تہذیبی عظمتوں کی داستانوں کو ڈراما نگاروں نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اچھا اسکرپٹ ریڈیائی ڈرامے کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بعد آواز اور پروڈکشن کا نمبر آتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کے لازمی اجزا میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، زبان اور صوتی اثرات شامل ہیں۔ ریڈیو ڈرامے میں قاری اور فن کار میں مفاہمت ضروری ہے۔ یہ مفاہمتیں وقت کے تقاضوں کے ساتھ

بدلتی رہتی ہیں۔ یہ مفاہمتیں مستقل بھی ہوتی ہیں اور عارضی بھی۔ تحریری اور ڈرامائی بھی ہو سکتی ہیں۔

ریڈیو ڈراما ایک صنف کی حیثیت سے قائم ہو چکا ہے۔ اور اس کے نقوش ہمیں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں نظر آنے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں نشریات کے ابتدائی دور میں زیادہ تر انگریزی اور یونانی ڈراموں کے ترجمے ہی ریڈیو سے نشر کیے گئے لیکن آہستہ آہستہ جب اس کے خدوخال ابھرنے لگے تو تھیٹر سے وابستہ ڈراما نگاروں نے بھی اس طرف توجہ مبذول کی اور نشری ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ آغا حشر کے ڈراموں کو ریڈیائی شکل دی گئی۔ فضل الحق قریشی نے ایک ہسپانوی کہانی کی بنیاد پر ''ممتا'' نام کا ڈراما ریڈیو کے لیے لکھا۔ انصار ناصری کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''وحشی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ جن مصنفین نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے اُن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدیؔ، اوپندر ناتھ اشکؔ، شوکت تھانویؔ، کرتار سنگھ دگل، حیات اللہ انصاریؔ، اشتیاق احمد قریشیؔ، شاہد احمد دہلویؔ، عابد علی عابدؔ، محمد حسن، شمیم حنفی، آفاق احمد، رفعت سروشؔ، اقبال مجیدؔ اور آنند لہرؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آنند لہرؔ افسانے اور ناول بھی لکھتے ہیں اور ڈرامے بھی۔ اُن کے چھ ڈراموں کا مجموعہ ''نروان'' اور ایک طویل ڈراما ''تپسوئی کون'' تیرہ مناظر پر مشتمل منظر عام پر آ کر دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اور اب وہ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سرحدیں'' لے کر قارئین کی عدالت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اس دور میں ڈراما جبکہ روبہ زوال ہے اچھے اچھے ڈراما نگاروں نے اسٹیج چھوڑ کر کانفرنس اور سیمینار کا راستہ اختیار کر لیا ہے اب وہ سفر اور سفرناموں پر زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ ریڈیو کا بھی زمانہ نہیں رہا ہے کہ ریڈیائی ڈرامے سننے کی خاطر لوگ اپنے اپنے کانوں سے ریڈیو چپکائے بیٹھے رہیں۔ ایسے بحرانی دور میں کسی ادیب کا ڈرامے کی طرف مائل ہونا دِل گردے کی بات ہے۔ یہ قدم اُن کے ادبی ذوق وجذبہ، صبر وتحمل اور خلوص وصداقت کا مظہر ہے۔ اس لحاظ سے آنند لہرؔ کی یہ کاوش قابل داد ہے۔

زیر بحث مجموعہ میں کل تین ڈرامے ہیں۔ سرحدیں، پل اور زندگی۔ اس مجموعہ کا دیباچہ شبیر احمد نے لکھا ہے جو ڈراما کی صنف سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ تینوں ڈرامے ریڈیائی ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ نہ اسٹیج، نہ

کردار، نہ منظر، نہ لباس، نہ میک اپ، نہ رنگ، نہ روشنی، صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اثرات والے ریکارڈ کی آوازیں۔ موسیقی کی آوازیں، مکالموں کی آوازیں، یہاں ڈراما نگار ایک خود مختار فنکار رہتا ہے۔ اس کا ہتھیار صرف اس کا قلم ہوتا ہے۔ کوئی اداکار اپنی اداکاری کے جوہر سے اس کی خامیوں کی پردہ پوشی نہیں کرسکتا۔ ہدایت کار ودوسرے معاون فن کار بھی نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں تو ڈراما نگار صرف اپنی نوک قلم سے منظر کشی بھی کرتا ہے۔ کرداروں کے اوصاف بھی گنواتا ہے۔ پلاٹ کی ابتداء وانتہا بھی بتاتا ہے۔ مکالموں میں ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ آنند لہر کے اِن تینوں ڈراموں میں اِن کی نوک قلم کی کارفرمائیاں واضح طور پر منعکس ہوتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایک بات جو مشترکہ طور پر سامنے آتی ہے کہ آنند لہر سماجی رشتوں اور اخلاقی قدروں پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ وہ ان کی نوعیت اور اہمیت کا تجزیہ کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ سرحدوں پر پیش آنے والے واقعات سے زیادہ واقفیت ہے اس لیے سرحدوں کو بحث موضوع بناتے ہیں۔

آنند لہر کے زیر تبصرہ مجموعے کے تینوں ڈرامے کئی بار ریڈیو کشمیر جموں سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔ ان کی نشر ہونے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنند لہر کافی عرصہ تک ریڈیو کشمیر جموں سے منسلک بھی رہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہ ڈرامے وقتاً فوقتاً ریڈیو سے نشر ہوتے رہیں۔

''سرحدیں'' اس مجموعے کا پہلا ریڈیائی ڈراما ہے۔ یہ ڈراما 38 صفحات پر محیط ہے۔ اس ڈراما میں کل چھوٹے بڑے 23 کردار شامل ہیں۔ موہن اس ڈرامے کا سب سے بڑا کردار ہے اور وہ ایک فوجی ہے۔ اس کے بعد سریتا ایک بڑا کردار ہے اور ایک خوبصورت لڑکی کا کردار ہے۔ ان دو بڑے کرداروں کے بعد جو چھوٹے کردار اس ڈرامے میں نمودار ہوتے ہیں ان میں بچہ، لڑکا، گردھاری، باپ، بوڑھی، نارائن، مجمع باز، ایک شخص، دوسرا شخص، چندو، عورت، جان، کرن، میری، سپاہی، کیپٹن، گوپی، جج، سپاہی دوسرا سپاہی تمام ضمنی کردار ہیں۔

سرحدیں ایک دردناک ڈراما ہے جس میں سرحدوں پر خوفناک پس منظر اور انسانوں کے مارے جانے کا ذکر ہوا ہے۔ فوجی اس ڈرامے کا ہیرو ہے۔ جس کے اِرد گرد یہ پورا ڈراما گھومتا ہے۔ فوجی کو ہر وقت

بلکہ ہر لمحہ جنگ چھیڑنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ کہ دُشمنوں نے سرحدوں پر لڑائی شروع کر دی ہے۔ دوران جنگ جو واقعات سرحدوں پر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن پر حاوی ہوتے ہیں۔

سرحدیں سیاسی کوتاہ نظری اور انسانی رشتوں کی پامالی کو طشت از بام کرتا ہے۔ انسان نے اپنی ضرورتوں کو مدنظر کر کنبہ کی تشکیل کی اور جیسے جیسے اس کی ضرورتیں بڑھتی گئیں وہ گاؤں، قصبوں، شہروں اور ملکوں کی شکلیں اختیار کرتا گیا۔ آنند لہر اس ڈرامے میں چند چھپے ہوئے سوالات پوچھتے ہیں کہ آج انسانی ضرورت اس نقطہ کو پہنچ گئی ہے کہ ہم قومیت کے بجائے بین الاقوامیت کی باتیں کریں۔ آخر کب تک یہ سرحدیں انسانی رشتوں میں درار پیدا کرتی رہیں گی؟ ۔کیا وہ دِن نہیں آئے گا۔ جب انسان تمام نفرتوں کو چھوڑ کر آفاقی ضرورتوں کے تحت تمام سرحدوں کو ختم کر دے گا۔ اس وقت سرحدیں تو ہوں گی لیکن انسانیت کو بانٹنے کے لیے نہیں ہوں گی۔ ان کی کرب رسائی کے لیے نہیں۔ بلکہ انتظامیہ کی سہولتوں کے لیے ہوں گی تا کہ انسانی زندگی کو اور بھی بہتر بنایا جا سکے اور اس کی روز افزاں ضرورتون کی تکمیل ہو سکے۔

اس ڈراما کی کہانی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اور سپاہی جس کی وردی پھٹی ہوئی ہے اور ایک بوسیدہ بندوق اسکے ہاتھ میں ہے۔ اور ایک پوٹلی اس نے کاندھے پر لٹکائی ہوئی ہے اور وہ لڑکھڑا کر چل رہا ہے۔ آسمان پر کہیں بادل نظر آ رہے ہیں ۔ کھیتوں میں گندم کے پودے لہرا رہے ہیں۔ اچانک آسمان پر بادل اور گھنے ہو جاتے ہیں اور آسمان پر بادل گرجنے کی آواز آتی ہے اور جب یہ آوازیں اس فوجی کے کان سے ٹکراتی ہیں تو اس کے ذہن میں سرحدوں کا پورا منظر گھوم جاتا ہے تو وہ پوزیشن پکڑ لیتا ہے اور گاؤں کے تمام لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے ہیں کہ یہ فوجی ہیر چیز کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ دُنیا کی ہر چیز کو اپنے اندر نگلنا چاہتا ہے اور نفرت بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں آنند لہر نے سرحدوں کا پس منظر پیش کیا ہے۔ اس ڈراما میں یہ پورا منظر آوازوں اور سوالات کے بل بوتے پر چلتا ہے۔

''سرحدیں'' ڈرامے میں آنند لہر نے موہن اور سریتا کی پیار و محبت کا خاکہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ان دونوں کی محبت کے بعد اس ڈرامے میں یہ بات نظر آتی ہے کہ سب لوگوں کو ایک ہی طرح

کے لفظ دے کر اس زمین پر اُتارا تھا مگر نفرتوں کے چشموں نے ان چشموں کو نہیں پھوٹنے دیا۔

ڈرامے کے تمام واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس ڈراما میں منظر کشی بھی بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ لہر نے کبھی جنگ کی منظر کشی کی ہے تو کبھی سرحدوں پر کھڑے فوجیوں کا ہو بہو منظر پیش کیا ہے۔

کردار نگاری پر ڈرامے کا سارا دار و مدار ہوتا ہے۔ فوجی اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ جو ہمیشہ جنگ اور لڑائی کی باتیں کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں مکالمے نہایت ہی عمدہ ہیں۔ کوئی بھی ڈراما مکالموں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا ہے۔ مکالمہ نگاری ڈراما کی جان ہے۔ ڈرامے کا ابتداء اور انجام بھی عمدہ ہے۔ ڈراما میں استعمال کی گئی زبان و بیاں نہایت ہی سادہ اور سلیس ہے۔ جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ آنند لہر ریڈیائی ڈراموں کے لوازمات سے پوری طرح واقف ہیں۔

ڈرامہ ''پُل'' کا تنقیدی جائزہ

ڈرامہ ''پُل'' آنند لہر کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعہ ''سرحدیں'' میں شامل دوسرا ڈراما ہے۔ یہ ڈرامہ 25 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں کُل 30 کردار شامل ہیں۔ ڈرامے میں شامل کرداروں کے نام درج ذیل ہیں۔ گوپی، نرمل، نارائن، باپ، ماں، بوڑھی، سادھو، شخص، مجمع باز، بچہ، سپیرا، بوڑھا، سپیرن، آواز، آواز، آواز، آواز، شخص نمبرا۔ شخص نمبر۲۔ شخص نمبر۳۔ گوپال، ارملا، گردھاری، دلاور، سادھو، بوڑھی، بوڑھا، لڑکی، عورت نمبرا۔ عورت نمبر۲۔ یہ تمام کردار اس ڈرامے میں ایک ایک کر کے ظاہر ہوتے ہیں لیکن اس ڈرامے کے مرکزی کردار گوپی اور نرمل ہیں جن کے اردگرد ڈراما گھومتا ہے۔

آنند لہر نے اس ڈراما کا پلاٹ اس طرح سے تیار کیا ہے۔ س ڈراما کا نفس مضمون بھی سرحد ہی سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ سرحد سیاسی اور مصنوعی نہیں بلکہ جغرافیائی اور قدرتی ہے۔ ایک پانی سے بھری ہوئی ندی ہے۔ جس نے دو گاؤں کے لوگوں کے درمیان خطہ فاصل کھینچ رکھا ہے۔ آئے دِن یہ ندی لوگوں کے جان و مال کے نقصان کا سبب بنتی رہی۔ اس سے بچنے کے لیے لوگ ندی پر پُل بناتے ہیں لیکن المیہ یہ ہوتا ہے کہ جب پُل مکمل ہوتا ہے تو ندی اپنا رُخ دوسری طرف موڑ لیتی ہے۔ اس طرح لوگوں کی تمام محنت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ آنند لہر نے یہاں پر ندی کو دراصل سیاسی سرحدوں کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ سرحدی تنازعے دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا بدنما واقع رونما ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے جس سے پھر ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے اور انسانی رشتے پہلے ہی کی طرح سسکنے لگتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ نقصان سرحدوں کے قریب رہنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔

دریا کے دونوں طرف لوگ رہتے ہیں۔ اِن کے گھر ہیں۔ ایک طرف کے گھر میں گوپی رہتی ہے اور دوسری طرف کے ایک گھر میں نرمل۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دور سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے دور سے ایک دوسرے کے جسموں کو محسوس کیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کناروں پر بیٹھ کر دیکھتے اور درمیان سے دریا گذرتا۔

اس ڈراما میں آنند لہر نے دریا کو سرحد قرار دیا ہے۔ اس دریا کا اتنا بہاؤ ہوتے ہوئے بھی لوگ ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ڈراما میں لہر نے ہندوپاک کے درمیان جو سرحدیں کھینچی گئی ہیں۔ خاص کر ریاست جموں و کشمیر کے

علاقے میں موجودہ سرحد کوموضوع بنایا۔ آنند لہر نے اس ڈراما میں سرحد کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ایک پتھر دل انسان بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ تمام سرحدیں بے معنی ہیں۔ جس کی حفاظت کے لیے سپاہی رکھے گئے ہیں۔ دونوں طرف آرزوئیں، خواہشیں، اور امنگیں ہیں۔ دونوں طرف لوگوں کے سینوں میں دِل دھڑکتے ہیں۔ اور دونوں ملکوں میں رہنے والے لوگوں کے دل سرحد کو جھانک کر ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

ڈرامے میں گوپی اور نرمل دو مرکزی کردار ہیں جن کے گرد پورا ڈراما چکر کاٹتا ہے۔ جن سے ہندو پاک کی سرحد اور عوام کے جذبات اور دونوں ملکوں کی ہر چیز میں یکسانیت کو بتایا گیا ہے۔ گوپی ہندوستان کی لڑکی ہوتی ہے جب کہ نرمل پاکستان کا باشندہ ہوتا ہے۔ دونوں جوان ہوتے ہیں۔ گوپی اور نرمل کی نظریں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ سرحد کی پرواہ کیے بغیر گوپی نرمل سے ملنے اور نرمل گوپی سے ملنے کے لیے سرحد کے اس پار جا پہنچتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کا سرحد پار کرنے کا سلسل چل نکلتا ہے۔ کبھی گوپی اور کبھی نرمل سرحد پار کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔

آنند لہر کا یہ ڈراما بڑا دلچسپ ہے۔ اس میں ایک سیدھی سادھی کہانی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں ''پُل'' کو ایک سرحد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لہر کا یہ ڈراما دل کو موہ لینے والا ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کے کردار بھی بے مثال ہیں۔ صرف دو کرداروں پر سارے ڈرامے کا دارومدار ہے۔ دونوں کردار ایک دوسرے کے ساتھ بے حد محبت کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے منہ سے جو مکالمے کہلائے گئے ہیں وہ بے مثال ہیں۔ اور کرداروں کے بالکل مناسب نظر آتے ہیں۔ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے لحاظ سے یہ ڈراما اعلیٰ درجے کا ڈراما ہے۔

ڈرامہ ''پل'' میں جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اس میں روزمرہ محاوروں اور سادہ زبان کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ ڈرامے کی زبان میں روانی، لطافت اور جدت پائی جاتی ہے۔ ڈرامے کا انجام اتنا ڈرامائی اور موثر ہے کہ ایک سنگ دل انسان بھی موم ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر قاری کی ساری ہمدردیاں عام انسان کے لیے ہو جاتی ہیں۔ ڈراما نگار نے دونوں کرداروں کی کشمکش کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ڈرامے کا انجام بے مثال بن گیا ہے۔ اس طرح سے یہ ڈراما اپنے انجام پر پہنچ جاتا ہے۔

ڈراما ''زندگی'' کا جائزہ

ڈراما ''زندگی''، آنند لہر کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعہ ''سرحدیں'' میں شامل تیسرا ڈراما ہے۔ یہ ڈراما 47 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ڈراما میں چھوٹے بڑے 19 کردار شامل ہیں۔ اس ڈراما میں سب سے بڑا کردار ہریش ہے۔ اس کے بعد دوسرا بڑا کردار دھرم چند ہے۔ ان دونوں کرداروں کے اِرد گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ ہریش اس ڈرامے میں سب سے بڑا کردار ہے۔ ایک نہایت ہی بدتمیز آفیسر جو علاقے کا ڈپٹی کمشنر ہے۔ ڈرامے کا دوسرا بڑا کردار دھرم چند نہایت ہی سلجھا ہوا شخص ہے۔ جو کہ اس دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے ان کے بعد اس ڈرامے میں چھوٹے کردار آتے ہیں جن میں پہلا نام کملا کا ہے۔ کملا اِس دفتر میں کام کرنے والی ایک سادہ سی عام لڑکی ہے۔ اس کے بعد حمید ہریش کا ایک پرانا دوست اور نہایت ہی سلجھا ہوا شخص ہے۔ اس کے بعد شرما ایک چھوٹا کردار جو صرف ٹیلی فون کرتا ہے۔ پدمہ دھرم چند کی بیوی، اس کے علاوہ دھرم چند کے ماں باپ، بیٹا، محلے دار، پڑوسن، گل شیر ایک مزاحیہ کردار، سدھا، ہریش کی بیوی کا نام، گوپال ہریش کا ڈرائیور، نلنی ہریش کی بیٹی، تھتھا۔ ایک کردار جو رُک رُک کر باتیں کرتا ہے۔ کموں ہریش کی لڑکی، ٹینلو ہریش کا بیٹا۔ ایک چھوٹا سا کردار، رنگی ایک چھوٹا سا کردار۔ یہ تمام کردار اس ڈرامے میں باری باری نمودار ہوتے ہیں۔ اس ڈرامے کا اصلی ہیرو دھرم چند ہے جس کے اردگرد یہ پورا ڈراما گھومتا ہے۔ اس ڈراما میں مصنف نے حقیقی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کی نفسیاتی عکاسی ملتی ہے۔ آنند لہر صاحب نے اس ڈرامے میں یہ واضح کیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر خود غرض اور لالچی ہوتا ہے۔ جب اس کے پاس دولت آجاتی ہے تو وہ اپنے دوستوں، ساتھیوں، چھوٹے ملازموں کو تو کیا۔ اپنے رشتے داروں سے بھی منہ موڑ لیتا ہے۔

ڈراما کی کہانی یہ ہے کہ دھرم چند ایک دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے۔ اس دفتر میں کملا نام کی عورت بھی کلرک ہے۔ دھرم چند ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔ جو اس بات سے خوش ہے کہ اتنے بڑے دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ اپنی اس پوزیشن کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے لوگوں کے کام کرتا ہے۔ کسی کا راشن کارڈ بنواتا ہے۔ کسی کا دیگر کام۔ اس کے گھر والے خوش ہیں۔ اس کی بیوی خوش ہے۔ ماں باپ، خوش ہیں۔ یہاں تک کہ محلے والے بھی خوش ہیں۔

دھرم چند کی گھر میں کافی عزت ہوتی ہے مگر اس کا آفیسر یعنی کہ ہریش جو علاقے کا ڈپٹی کمشنر ہے خوش

نہیں ہے۔سب کوتنگ کرتا ہے۔بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔یہاں تک کے ماتحتوں سے گالی گلوچ کرتا ہے۔
مگراس کی بیوی اس کی بے عزتی کرتی ہے۔اس پرایک امیر باپ کی بیٹی ہونے کارعب جماتی ہے۔وہ جوں ہی گھر پہنچتا ہےتواس کی بے عزتی شروع ہوجاتی ہے۔اس کی بیوی کہتی ہے کہ اگروہ (I.A.S) آئی۔اے ۔ایس بھی ہےتو کیا ہے۔اس کے باپ نے توایسے کئی نوکرر کھے ہوئے ہیں۔

ہریش جوں ہی دفتر پہنچتا ہے تو دفتر میں کام کرنے والے ملازموں کی بے عزتی کرناشروع کردیتا ہے۔گالیاں دیتا ہے۔اور کملا کی بھی حد سے زیادہ بے عزتی کرتا ہے۔دھرم چنداس دن غصے میں آتا ہے۔وہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ہریش کے گھر جاکراس کی بے عزتی کرائے گا۔اس کی بیوی کوشکایت لگائے گا۔ہوسکاتو نوکری بھی چھوڑ دے گا۔

کملااور دھرم چنداس کے گھر پہنچتے ہیں مگر دیکھتے ہیں کہ کس طرح ہریش کی بیوی س کی بےعزتی کرتی ہے۔بچے اس کامذاق اُڑاتے ہیں اور گھر میں اس کی کوئی نہیں سنتا۔دھرم چنداور کملاکواس پر رحم آجاتا ہےاوروہ وہاں سے واپس آجاتے ہیں۔

اس ڈرامامیں آنندلہر نے دومتضادزندگیوں کاخاکہ پیش کیاہے۔ایک زندگی دھرم چندکی ہوتی ہے جس کوگھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھاجاتا ہے۔تودوسری طرف رمیش جوکہ آفیسر بھی ہے مگرگھر میں کوئی بھی اس کی عزت نہیں کرتا۔جودفتر میں توہرایک کوبُرابھلا کہتا ہےلیکن گھر میں اس کی عزت دوکوڑی کی ہے۔نہ اس کی ملازمت کی قدر ہے نہ اس کی ذات کی اہمیت ہے۔

پلاٹ تیار کرنے میں جوواقعات گھڑے گئے ہیں وہ حقیقت سے بہت قریب نظرآتے ہیں۔اس ڈرامامیں واقعاتی تاثر برقرار رہتا ہے۔ڈرامامیں منظرنگاری بھی لاجواب ہے۔کبھی گھر کے ماحول کااور کبھی دفتر کے ماحول کاہوبہونقشہ کھینچا گیا ہے۔ایک امیراورایک غریب کے درمیان کے فرق کوبھی موضوع بنایا گیا ہے۔

کردارنگاری اس ڈرامے کی جان ہے۔دھرم چنداس ڈرامے کاہیروہوتا ہے جوایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ملازمت ملنے پر بہت خوش ہوتا ہےاوراپنے پیشے سے بےحدانصاف کرتا ہے۔اُسے کوئی

بڑی خواہش نہیں ہوتی۔ بلکہ تھوڑے پر اتفاق کر کے بیٹھ جاتا ہے اور گھر میں بھی اس کی بہت عزت کی جاتی ہے۔

اس ڈراما میں قاری کی ساری ہمدردی دھرم چند کے ساتھ جاتی ہے۔اس ڈراما میں ڈراما نگاری کے وہ تمام پہلو موجود ہیں جو ایک کامیاب ڈرامے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ڈرامے کی زبان بے حد لطیف ہے ۔اسلوب انوکھا ہے۔روزمرہ کے محاورات کا استعمال نہایت خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔مکالمے بھی نہایت ہی موثر ہیں۔ڈرامے کا انجام بھی عمدہ ہے۔صرف انجام ہی نہیں بلکہ آغاز بھی ڈرامائی ہے۔موضوع حالاں کہ عام سا ہے۔لیکن ڈراما نگار نے اتنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ ایک بے مثال ڈراما بن گیا ہے۔

باب پنجم

حاصل مطالعہ

عصرِ حاضر کے اُردو فکشن نگاروں میں آنند لہر کا نام سرِ فہرست ہے۔ آنند لہر کی ابتدائی تعلیم وتربیت ضلع پونچھ میں ہوئی۔ ضلع پونچھ میں اُس وقت علم وادب کا گہوارتھا۔ آپ کی ادبی تربیت میں اس علمی وادبی فضا کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ آپ کے ادبی سفر کا آغاز کالج سے ہوا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ کو اُردو ادب سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ اکثر ادبی محفلوں میں تشریف لے جاتے جہاں پر ادباء وشعرا سے ملنے کا شرف حاصل ہوتا۔

کالج میں ہو رہی مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ لہر صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ انھوں نے ابتداء میں غزلیں کہنی شروع کیں۔ لیکن ان میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کالج میں بزم ادب پونچھ کے نام سے ایک بزم بنائی گئی تھی۔ اس بزم کے بانی نورحسن پونچھی تھے۔ نورحسن ہر مہینے میں اس بزم کے تحت مشاعروں کا اہتمام کرواتے تھے۔ اس بزم میں کافی لوگ شامل تھے۔ آنند لہر بھی اس بزم ایک سرگرم رُکن رہے ہیں۔ اس بزم کا مقصد اُردو ادب کو فروغ دینا تھا۔ اس بزم سے پہلے جن لوگوں نے سرزمین پونچھ میں ادبی ماحول پیدا کیا تھا اُن میں چراغ حسرت خان حسرتؔ، کرشن چندر، سرلہ دیو، اور ٹھاکر پونچھی وغیرہ قابل ذکر تھے۔ اس بزم کے تحت منعقد کی جانے والی ادبی محفلوں میں لہر صاحب نہ صرف شمولیت کرتے بلکہ صدارت کے فرائض انجام دیتے۔ اس بزم میں نہ صرف اُردو کے ادیب بلکہ ہندی کے ادیب وشاعر بھی شامل تھے۔ جہاں نئی تخلیقات پر کھل کر بحث ومباحثے ہوتے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نوجوان ادیبوں کو اس میں نہ صرف شرکت کا موقع ملا بلکہ اپنی تخلیقات پیش کرنے کا ایک ہموار میدان بھی مل گیا۔

آنند لہر نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا اس وقت جموں وکشمیر میں افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ ان افسانہ نگاروں میں پشکر ناتھ، مالک رام آنندؔ، ویدراہیؔ، نورشاہؔ، خالد حسین، موہن یاور، کشوری چند، ویریندر پٹواری، کشمیری لال ذاکر، عبدالغنی شیخ، پروفیسر ظہورالدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں۔ دیپک بدکی، عمر مجید، کلدیپ رعنا، حسن ساہوؔ، سدرشن، انیس ہمدنی، ریاض پنجابی اور ترنم ریاضؔ وغیرہ ایسے قلم کار ہیں جو ریاست میں افسانوی روایت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ لہر کا شمار عام طور پر جدید فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے فن پر جدیدیت کے اثرات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

آنند لہر بنیادی طور پر افسانہ نگاری کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''انحراف''، ''سرحد کے اس پار''، ''کورٹ مارشل'' اور ''بٹوارہ'' شائع ہو چکے ہیں ۔ انحراف آنند لہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں بہت ہی مختصر کہانیاں ہیں۔ کچھ کہانیاں تقریباً آدھے صفحے پر اور کچھ کہانیاں ایک یا دو صفحوں پر مشتمل ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ طویل کہانی تین صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ تجریدی افسانوں کے حوالے سے آنند لہر کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں ایسی بہت ساری کہانیاں ہیں۔ جن میں آنند لہر نے زندگی کی بے ثباتی کو خلیفانہ انداز فکر سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے کئی افسانے ہیں۔ ''انحراف'' کی کہانیوں میں سے پہلی ہی کہانی جس کا عنوان ''سوالھواں برس'' ہے۔ اس میں آنند لہر نے زندگی کو ایک کارواں سے تعبیر کیا ہے۔ اور افسانوں کا آنا جانا اس کارواں کو آگے بڑھانے کا عمل ہے اور یہ کارواں روز اول سے شروع ہوا ہے اور تا آخر چلتا رہے گا اور زندگی نہ ختم ہونے والا ایک کارواں ہے۔

''انحراف'' میں اسی طرح کے اور بھی بہت سارے افسانے ہیں ۔ ان میں سڑک، دروازے، لکیر، ریت کا چشمہ اور دائرہ وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جن میں لہر نے زندگی کی حقیقتوں کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یوں تو آنند لہر نے اپنے تمام افسانوں میں بے جا طوالت سے اجتناب کیا ہے۔ مگر ''انحراف'' میں موجود افسانے اُن کے مختصر افسانے کے بھی نچوڑ ہیں۔ دُنیا، خالقِ کائنات، زمین و آسمان، انسان و حیوان، چرند پرند، ہوا، بادل، بارش، سورج غرضیکہ کے انسانی ماحول میں موجود ہر چھوٹی بڑی چیز کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں اگرچہ تجریدیت کو فروغ دیا ہے۔ تاہم عام فہم زبان و بیان کا استعمال کیا ہے۔ اور یہ بات دوسری ہے کہ مصنف کی باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے قاری کو ذہنی غوطے لگانے پڑتے ہیں۔ چونکہ یہ تجریدیت کی خوبی تصور کی جاتی ہے۔ اور یہی تجریدیت کی بھی انفرادیت ہے۔ اُردو افسانہ میں انتظار حسین، بلراج میزا، اور سریندر پرکاش کے بعد آنند لہر نے علامتی اور تجریدی افسانے میں مثبت سمت اختیار کی ہے۔ اور یہ آنند لہر کے مقام کو مزید دوبالا کرتی ہے۔

آنند لہر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' ہے۔ جو 2002ء میں شائع ہوا۔ ''سرحد کے

اُس پار" کل تیرہ افسانے شامل ہیں۔ پہلی کہانی سرحد صرف ساڑھے چار صفحوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں فنی چابک دستی سے سرحد کے سب انسانوں کی تقسیم اور آپسی محبت کا دردناک حال بیان ہوا ہے۔ گوپی اور روشن کی عشقیہ کہانی کی صورت میں جنگ بندی سرحد کے دونوں اطراف رہنے والے لوگوں کی جذباتی تقسیم اور ان لوگوں کے ایک دوسرے سے میل جول نہ ہونے کا المیہ کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری خود بخود اشکبار ہو جاتا ہے۔ سرحد عام لوگوں کے بیچ ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ سرحد کی حفاظت کرنے والے فوجی اہلکار ہر وقت چوکس اور چوکنا رہتے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگ ایک جیسی بولی بولتے ہیں۔ لباس پہنتے ہیں اور ایک ہی قسم کے رسم و رواج کا پالن کرتے ہیں۔ مرانھیں سرحد کی وجہ سے ایک دوسرے کا دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ لہر کے تمام افسانوں میں تقسیم وطن اور سرحد کے قائم ہونے کے بعد سرحدی علاقوں کی عکاسی کسی نہ کسی طرح ضرور ملتی ہے۔ "سرحد کے اُس پار" شامل سارے افسانے انسانی زندگی مذہب رسم و رواج، سیاست اور سب سے بڑھ کر سماج اور سماجی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں کوئی بھی جن پری، دیو بھوت، کوہ و بیان، ریگستان و صحرا وغیرہ عجائب نظر نہیں آتے۔ رنگ ساز، سپیرن، گوری، شکست، رشتے، پھول والی، زندگی، تندور اور بنجارن انسانی نفسیات اور دورِ حاضر میں عام افسانوں کے اصحابِ اقتدار کے ہاتھوں استعمال کے آئینہ دار ہیں۔ کہیں امیری اور غریبی، کہیں دیہاتی و شہری اور کہیں مذہبی تفرقات بے بس اور لاچار لوگوں کی زندگی اور سماج کے تلخ حقائق کو بیان کرنے کے لیے چن چن کر الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہر کردار کی زبان بولا جانے والا لفظ برمحل موزوں ہے۔ ان کے افسانوں کا کوئی بھی حصّہ غیر ضروری نہیں ہے۔ خیال و بیان کی خوبیوں کیساتھ لہر صاحب کی اختصاری پسندی بھی قابل توجہ ہے۔

آنند لہر کی افسانہ نگاری کا تیسرا اہم کرشمہ "کورٹ مارشل" میں شامل کہانیاں سماجی زندگی سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے سیاسی و سماجی مسائل کو اُنھوں نے چابکدستی سے اس مجموعے کی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی کہانی "اب تھانہ چل پڑے گا"۔ ہمارے سماج کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کہانی میں لہر صاحب نے ایک پرسکون گاؤں کی زندگی کو جنم میں تبدیل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی نوعیت کی ایک اور کہانی ''سنہرا کفن'' ہے۔ جس میں ایک غریب گھرانے کی زندگی کو پیش کر کے غربت میں مبتلا لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور کہانی ''کھیر'' میں بتایا گیا ہے کہ سماج میں ایک طرف غریبوں کی عزت کو لوٹا جا رہا ہے۔ افسانہ ''فائر بریگیڈ'' بھی اہم ہے۔ اس مجموعے میں تمام کہانیاں ہمارے سماج سے تعلق رکھنے والی کہانیاں ہیں۔ آنند لہر نے ان افسانوں میں ہمارے سماج کا بہترین عکس پیش کیا ہے۔ لہر نے عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس مجموعے میں جو کہانیاں ہمارے سماج سے تعلق رکھتی ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔ دادی اماں، اب تھانہ چل پڑے گا، سپاہی، سنہرا کفن، کھیر، کرائے کا مریض فائر بریگیڈ اور انسان کب جیتے گا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''کورٹ مارشل'' میں شامل تمام افسانے سماجی اور روایتی انداز کے ہیں۔

آنند لہر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' 2010ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں بھی آنند لہر کی زیادہ تر کہانیاں، انسانی زندگی کے مسائل اور انسانی زندگی کا زوال اور دوسرے کئی موضوعات پر مبنی ہیں۔ اس مجموعے کا نام اس کی پہلی کہانی ''بٹوارہ'' پر رکھا گیا ہے۔ اس کی تمام کہانیاں آج کے سماج کا بہترین عکس ہے۔

بٹوارہ کے پس منظر میں جو رجحان سب سے زیادہ رہا ہے۔ وہ تقسیم وطن کا المیہ ہے۔ جس نے نہ صرف برصغیر کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا بلکہ ایک تہذیب کے دو حصے کر دیئے جس کی وجہ سے نہ صرف زمین کا بٹوارہ ہوا بلکہ انسانی قدریں بھی بٹ گئیں اور سرحد کے آر پار بسنے والے لوگوں کی زندگیاں رنج والم کا شکار ہوئیں۔ ان لوگوں میں تڑپ، بے چینی، بے راہ روی اور زندگی کی بے معنویت کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ اس طرح سے رجحانات ''بٹوارہ'' کے پس منظر میں حاوی ہیں۔ جہاں تک ہماری ریاست جموں وکشمیر کے بٹوارہ کا تعلق ہے۔ ریاستی بٹوارہ بھی کسی ضابطہ ومنصوبے کے تحت نہیں ہوا۔ اور نہ ہی باقاعدہ کوئی سرحد کھینچی گئی اس لیے یہاں تقسیم کا جواثر ہوا وہ عجیب طرح سے ہوا۔ یعنی کہ اچانک لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ بیوی ایک طرف رہ گئی اور خاوند دوسری طرف۔ اسکول ماسٹر ایک طرف طلباء دوسری طرف۔ طبلہ بجانے والا ایک طرف اور ناچ کرنے والا دوسری طرف۔ کھیت ایک طرف کسان دوسری طرف۔ البتہ ریاست جموں وکشمیر کا بٹوارہ۔ غیر فطری ہوا۔ جس نے لوگوں کو بے چینی اور اُداسی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لوگوں

کے ساتھ ساتھ ان کے پیار ومحبت کو بھی تقسیم کردیا گیا۔عرض یہ کے ہر چیز کا بٹوارہ ہوا۔جس نے زندگی کے مال کو اُداسی اور ماضی کی یادوں سے لبریز اور مستقبل کو نہایت گھپ اندھیرے میں تبدیل کردیا ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس سے متاثر ہوکر آنند لہر کا مجموعہ ''بٹوارہ'' وجود میں آیا۔افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' میں شامل چند نمائندہ افسانوں کے نام یوں ہیں۔ بٹوارہ۔دادی اماں، سمندر کا پانی، پھیکے آم، دوسری بے انصافی۔ایک داغ، یہ سرحدیں۔انصاف۔دوسرا بٹوارہ، جج صاحب، کلفیاں، دوسری سوچ اور ایک ہجرت وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ ''بٹوارہ'' کے پس منظر میں موجودہ دور کے سماج میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات، زندگی کے نشیب وفراز، بدلتے واقعات وحالات، جذباتی بے کیفی، بے رحم ماحول سنگینی، خودغرضی، لالچ، جھوٹ، رشوت خوری، اور عام لوگوں کی زندگی کا استحصال اور موجودہ دور میں عورت کا استحصال ایسے عناصر ہیں جن کی وساطت سے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔افسانہ ''جج صاحب'' میں جس میں ہمارے سماج میں پلنے والی بُرائیوں، بے ایمانی، رشوت خوری، وغیرہ کو نہایت ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ سرحد کے قریب رہنے والے جس طرح کی زندگی گذارر ہے ہیں اور جن جن مسائل سے دوچار ہیں اس پس منظر کو لے کر بھی بٹوارہ کی کئی کہانیاں وجود میں آئی ہیں۔جن میں ''سنہری مچھلی''، ''یہ سرحدیں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ سنہری مچھلی سے سرحد کے آر پار رہنے والے لوگوں کی زندگیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی طرح ''یہ سرحدیں''، ''دوسرا بٹوارہ'' وغیرہ کی کہانیاں بھی اسی پس منظر کے تحت وجود میں آئی ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے سماج میں غربت کی بڑھتی شرح اور امیروں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال وغیرہ کے پس منظر میں بھی ''بٹوارہ'' کی کچھ کہانیاں وجود میں آئی ہیں۔مثلاً۔''تھوڑی سی غلطی''، ''پھیکے آم''۔''دوسری بے انصافی''۔دادی اماں اور کلفیاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست میں عسکریت پسندی سے پیداشدہ صورت حال سے ریاست کشمیری پنڈتوں کو ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور پھر اُن کی زندگیاں یہاں پر آکر رنج والم میں بدل گئیں۔ اس پس منظر کو لے کر بھی بٹوارہ کی بعض کہانیاں تحریر کی گئی ہیں۔جن کی سب سے اچھی مثال ''ایک اور ہجرت'' ہے۔

آنند لہر نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ اُنھوں نے چار ناول بھی لکھے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے

پہلے 1997ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' ۔ 2002ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ۔ 2005ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور ان کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' ۔ 2008ء میں منظرِ عام پر آیا۔ آنند لہر کے ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کو پڑھ کر 1947ء سے لے کر 1997ء تک کی تاریخ ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ انھوں نے کشمیریوں کی مذہبی رواداری، مہمان نوازی اور آپسی بھائی چارے کا ذکر کر کے جنت نظیر وادی رہنے والے لاکھوں ہندو مسلمانوں کے آپسی اخلاقی اقتدار کو ماہرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے'' میں موجود جملے کشمیر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کو بیان کرتے ہیں۔ کبھی دِل خوشی سے جھومنے اور کبھی تباہی کا عالم دیکھ کر رونے لگتا ہے۔

چنانچہ لہر نے عبدل اور بدری کی صورت میں کشمیریوں کے روایتی بھائی چارے کی وضاحت کی ہے۔ انھیں ''ہندو مُسلم سکھ اتحاد'' کا نعرہ ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔ قبائلی چلے گئے۔ عبدالعزیز اور مقبول شیروانی جیسے لوگ شہادت کا اعلیٰ درجہ حاصل کر کے ایک رنگین تاریخ لکھوا گئے۔

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے۔ جو مصنف نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھا ہے۔ یہ داستان ہندوستان کی آزادی سے شروع ہو کر آج تک پہنچتی ہے۔ سرزمین کشمیر کی یہ درد بھری روداد، نصف صدی پر پھیلی ہوئی ایک ایسی روداد ہے۔ جس میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ کہیں کہیں متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔ کہیں اندھیرا فتح یاب ہوتا ہے اور کہیں روشنی لیکن انجام کار روشنی ہی، کامران و نصرت یاب ہوتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصب صدی کا یہ سارا سفر ناول نگار کے دِل کی تجلّی سے جگمگا رہا ہے۔ بنی نوع انسان سے محبت اور بالخصوص سرزمین کشمیر سے محبت ناول نگار کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ناول کے آخری حصہ میں آنند لہر کا وہ جذبہ سمٹ کر آ گیا ہے۔ جیسے ہندو مُسلم سکھ اتحاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔

''سرحدوں کے بیچ'' آنند لہر کا دوسرا ناول ہے۔ جس میں آنند لہر نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحد کے آر پار بسنے والے لوگوں کی عملی دقتوں کا تمثیلی انداز میں خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول بھی کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جو لوگ سرحدوں کے قریب رہتے ہیں۔ وہ دونوں علاقوں کو اپنا مانتے ہیں۔ انھیں کسی بھی

حد یا خطہ کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک عام باشندے کی حیثیت سے اپنے گردونواح کے وسائل سے زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

''مجھ سے کہا ہوتا''۔ آنند لہر کا تیسرا ناول ہے۔ ناول میں لہر نے اپنے افتادِ طبع کے عین مطابق ایک ایسے موضوع کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا تعلق اگر چہ ہمارے دور سے ہے لیکن نوعیت کے اعتبار سے ہر دور میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ یعنی طاقت ور بننے کے لیے ہتھیاروں کی دوڑ اور ان کے استعمال سے پیدا ہونے والے نتائج، جانور بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے ہیں۔ یہ ناول اگر چہ امریکہ کے ہاتھوں عراق پر نازل ہونے والی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن یہ بہت سے ایسے انسانی وسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں۔

''یہی سچ ہے'' آنند لہر کا چوتھا ناول ہے۔ یہ ناول 2008 میں منظر عام پر آیا ہے۔ آنند لہر نے زیر بحث ناول ''یہی سچ ہے'' میں زندگی کے حقائق کی فلسفیانہ انداز میں مختلف کردار اور واقعات کے ارتباط سے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آنند لہر نے اپنے اس ناول میں تین کلیوی کردار کو مرکز بنایا ہے۔ کوشل مصنف اور اس کے دو سالے شیو جو روت لیتا ہے اور شنکر جس کے دل میں خوف خدا ہے اور وہ رشوت سے دور بھاگتا ہے۔ ان تینوں اہم اور مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ناگ پال، دھرم پال وغیرہ کے کرداروں کو بھی ناول نگار نے بڑے فنکارانہ انداز میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔

آنند لہر نے دو سگے بھائیوں شیو اور شنکر کے ذریعہ امیری، غریبی، پاپ پنیہ، سورگ نرگ کا جو تصور پیش کیا ہے۔ آنند لہر نے نہ صرف افسانے اور ناول لکھے ہیں بلکہ انھوں نے ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ آنند لہر کے تین ڈرامائی مجموعے ''نراون، تپسوئی کون اور سرحدیں قابل ذکر ہیں۔

یہ ڈرامے بھی اُن کی کہانیوں کی طرح دلچسپ ہیں۔ ''نروان'' آنند لہر کے چھے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان کے سارے ڈراموں کے پس منظر میں دنیا، انسان، انسانی سوچ ہی ہے۔ جس میں رہنے والے ہر فرد دُکھ، درد، مصیبت، بیماری اور پریشانی سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان

جوتضاداور کشمکش ہے۔اس کی بڑی عمدہ تصویر کشی ، ناول،نویس نے کی ہے۔انسانی قدریں کس طرح پامال ہوتی ہیں ۔سماجی رشتے کس طرح ٹوٹتے بکھرتے ہیں۔اور سماج پر کس طرح منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔آنندلہر نے ان کے اظہار میں اپنی پوری فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔

ناول سبک روٹی سے شروع ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے اس کے کردار، واقعات اور اظہار بیان کے لطیف احساسات وجذبات سے سرشار ہوتے ہوئے قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔

آنندلہر زندگی کے حقائق کو دیکھنے ،سمجھنے اور برتنے کا ایک منفرد نظریہ رکھتے ہیں اور تخلیقی لمحوں میں وہ اپنے کردار واقعات، حادثات،سانحات کے ذریعے اپنے داخلی خارجی احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فطری تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔

''یہی سچ ہے'' دراصل زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے اور اس عمل میں بے حد کامیاب ہے۔لہر بنیادی طور پر کہانی کار ہیں اس لیے وہ اپنے خیالات کو کبھی افسانے کبھی ناول اور کبھی ڈراموں کی شکل میں پیش کرتے ہیں ۔انھیں ڈرامے لکھنے میں بھی اتنی ہی مہارت رکھتے ہیں۔جتنی کہ افسانہ اور ناول نگاری میں وہ بری سے بُری چیز کا ذکر بھی اس طرح کرتے ہیں کہ قاری کو مخصوص انداز میں ہی سب کچھ واضح ہوجاتا ہے۔اُن کے بیان میں کہیں بھی ہلکاپن نہیں آنے پاتا۔

''تپسوئی کون'' آنندلہر کا ایک مکمل ڈراما ہے جسے تیرہ مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ یہ سماجی ڈراما ہے جس میں ایماندار، رشوت خور، ایماندار اور بے ایمانوں کی زندگیوں کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ڈرامہ نگار دراصل یہ فیصلہ کرنے میں شرم محسوس کرتا ہے کہ وہ ان میں کس قسم کے آدمی کو تپسوئی قرار دے۔کیونکہ لوگ اس آدمی کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو رشوت تو کھاتا ہے لیکن لوگوں کے کام نبھانے میں کسی قسم کا دھوکا نہیں کرتا۔دوسری طرف ایماندار کا گھر تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔

یہ ڈراما پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، زبان وبیان کے اعتبار سے بھی خاصے کی چیز بن گیا ہے ۔مجموعی طور پر تپسوئی کون ایک دلچسپ اور کامیاب ڈراما ہے۔

آنندلہر کا تیسرا ڈرامائی مجموعہ ''سرحدیں'' ہے۔ان کی یہ نئی تصنیف ہے جو تین ریڈیائی ڈراموں

پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل سرحدیں، پُل اور زندگی ۔ تینوں ڈرامے، ریڈیو کے لیے لکھے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ نہ اسٹیج نہ کردار۔ نہ منظر، نہ لباس، نہ میک اپ نہ روشنی صرف آوازیں ہی سنائی دیتی ہیں۔

پہلا ڈراما ''سرحدیں'' سیاسی کوتاہ نظری اور انسانی رشتوں کی پامالی کو طشت از بام کرتا ہے۔ دوسرا ڈراما ''پُل'' ہے۔ اس کا نفس مضمون بھی سرحد ہی ہے۔ یہ سرحد سیاسی اور مصنوعی نہیں ۔ بلکہ جغرافیائی اور قدرتی ہے۔ تیسرے ڈرامے ''زندگی'' میں انسانی رشتوں کے دو پہلوؤں میں منکشف ہوتے ہیں۔ بعض لوگ رشتوں کی قدر جانتے ہیں۔ رشتوں کی پاسداری اِن کی سرست میں داخل ہوتی ہے اس لیے ان کی زندگی خوش حال ور بامعنی بن جاتی ہے لیکن بعض لوگ رشتوں کی قدروں سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کو جہنم بنالتے ہیں۔ اس لحاظ سے آنند لہر ڈراما نگاری میں بھی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ انھوں نے اسٹیج کے لیے بھی اور ریڈیو کے لیے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ آنند لہر کی شہرت ومقبولیت کے اسباب ان کے افسانے ہیں۔ آنند لہر نے اُردو فکشن کی روایت سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کے یہاں داستانوی اثرات سے لے کر منٹو اور بیدی کے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی وعصری مسائل کے ساتھ تقسیم اور عورت کا استحصال اور نفسیاتی مسائل کو بھی بڑی خوبصورتی سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے علامت اور تجریدیت کو تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔

موجودہ دور میں مصروف ترین زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ٹوٹتے ہوئے رشتے اور قدروں کے زوال کو آنند لہر نے بالخصوص اپنا موضوع بنایا ہے۔ اِن کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لہر سیاسی، سماجی، علامتی وتجریدی اور روایتی موضوعات سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ سماجی ناانصافیوں ،معاشی ناہمواریوں اور تقسیم ملک سے پیدا شدہ مسائل ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہیں۔

آنند لہر کو کردار نگاری پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں کرداروں کے خدوخال کو بہت خوبصورتی سے نمایاں کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں کہ کون سا کردار کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس کی مناسبت سے مکالمے کا انتخاب کرتے ہیں۔

کردار نگاری میں کامیابی کی وجہ سے آنند لہر کی ڈراما نگاری ہے۔ڈراموں میں کرداروں کو عہد اور ماحول کے حساب سے پیش کیا جاتا ہے۔اور اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔فکشن میں بھی آنند لہر کے وہی تجربے کام آئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔زبان و بیان کے اعتماد سے بھی وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔اور بامحاورہ زبان پر زور دیا ہے۔آنند لہر نے صرف راست بیانیہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ انھوں نے علامتی اور استعاراتی پیرایہ اظہار کو بھی اپنایا ہے۔لیکن ان کی کہانیوں میں کہیں بھی ترسیل کا مسئلہ درپیش نہیں آتا ہے۔بلکہ انھوں نے جدیدیت کے مثبت پہلوؤں سے بھی استفادہ کیا ہے۔مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ آنند لہر اگر اسی طرح لکھتے رہے تو وہ دِن دور نہیں جب اُن کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے معیاری فکشن نگاروں میں لیا جائے گا۔

کتابیات

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	مقام اشاعت	سن اشاعت
1	آنند لہر	سرحد کے اُس پار (افسانوی مجموعہ)	سیمانت پرکاشن نئی دہلی	2001ء
2	آنند لہر	انحراف (افسانوی مجموعہ)	ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ ،نئی دہلی	2002ء
3	آنند لہر	کورٹ مارشل (افسانوی مجموعہ)	مانوی پرکاشن پنج تیرتھی جموں	2005ء
4	آنند لہر	بٹوارہ (افسانوی مجموعہ)	اُردو بک سوسائٹی نئی دہلی	2009ء
5	آنند لہر	سرحدوں کے بیچ (ناول)	ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ نئی دہلی	2002ء
6	آنند لہر	اگلی عید سے پہلے (ناول)	مانوی پرکاشن پنج تیرتھی جموں	2004ء
7	آنند لہر	مجھ سے کہا ہوتا (ناول)	اُردو بک سوسائٹی نئی دہلی	2005ء
8	آنند لہر	یہی سچ ہے (ناول)	اُردو بک سوسائٹی ،نئی دہلی	2008ء
9	آنند لہر	تپسوئی کون (مکمل ڈرامہ)	ادارہ فکر جدید۔نئی دہلی	1994ء
10	آنند لہر	نروان (ڈرامائی مجموعہ)	جے کے بک ہاؤس ۔جموں (توی)	1988ء

11	آنند لہر	سرحدیں (ڈرامائی مجموعہ)	گلستان پبلی کیشنز، کلکتہ 73۔	2006ء
12	اطہر پرویز	اُردو کے تیرہ افسانے	ایجوکیشنل بک ہوس علی گڑھ	1980ء
13	برج پریمی	جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما	دیپ پبلی کیشنز سرینگر	1992ء
14	حامدی کاشمیری	ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب	گلشن پبلی کیشنز سری نگر	1991ء
15	خلیل الرحمٰن اعظمی	اُردو میں ترقی پسند	ایجوکیشن بک ہوس علی گڑھ	1979ء
16	شمس الرحمٰن فاروقی	افسانے کی حمایت میں	برٹی آرٹ پریس نئی دہلی	1987ء
17	قمر رئیس	پریم چند کے نمائندہ افسانے	تاج آفسیٹ پریس الہ آباد	1986ء
18	قمر رئیس	تنقیدی تناظر	طبع اوّل علی گڑھ	1978ء
19	گوپی چند نارنگ	اُردو افسانہ، روایت ومسائل	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس دہلی	1981ء
20	محمد صادق	ترقی پسند تحریک اور اُردو (افسانہ)	اُردو مجلس چتلی قبر دہلی	1981ء
21	مہناز انور	اُردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ	نامی پریس لکھنو	1985ء
22	وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	مکتبہ الفاظ علی گڑھ	1987ء
23	وقار عظیم	فن افسانہ نگاری	آفاق بک ہاؤس علی گڑھ	1969ء

24	وقار عظیم	نیا اُردو افسانہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1982ء
25	عبدل قادر سروری	کشمیر میں اُردو۔ جلد دوم	اکادمی آف آرٹ ،کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر	1982ء
26	ڈاکٹر صابر مرزا	صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اُردو کے اثرات	انجمن پہاڑی ترقیاتی ادب راجوری	2005ء
27	ڈاکٹر فرحت شمیم	اقبال مجید۔فن،فکشن،فنکار	قاسمی کتب خانہ جموں،توی	2011ء
28	ڈاکٹر چمن لعل بھگت	حالی،شبلی اور آزاد (تحقیق کے آئینے میں)	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	2008ء
29	ڈاکٹر چمن لعل بھگت	برج پریمی کی ادبی خدمات	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	2009ء
30	رام بوبو سکینہ	تاریخ اُردو ادب	ادارہ کتاب الشفاء	2000ء
31	ڈاکٹر رینو بیل	خوشبو میرے آنگن کی	--	2010ء
32	ڈاکٹر شہاب عنایت ملک	نئے جائزے	رسا جاودانی میموریل سوسائٹی جموں	2005ء
33	علی حیدر علی	افسانہ اور علامتی افسانہ	عاکف بک ڈپو مٹیا محل دہلی	1999ء

رسائل وجرائد

نمبر شمار	مدیر	نام رسائل	شمارہ، سن اشاعت	مقام ناشر
1	جاوید انور	تحریک ادب (سہ ماہی)	8 اکتوبر تا دسمبر 2010	مہاویر پریس وا
2	جمشید جہاں	دین جدید (سہ ماہی)	دسمبر تا مارچ 2010	جمشید جہاں ذاَ
3	ضیاء الرحمان غوثی	مسرت ہفتہ وار اخبار	24 سنیچر، 4 سے 10 دسمبر 2010	جامعہ نگر نئی دہلی
4	ضیاء الرحمان غوثی	مسرت ہفتہ وار اخبار	29 سنیچر 8 سے 14 جنوری، 2011	نئی دہلی
5	ڈاکٹر طارق تمکین	شاہین	پی جی کالج بھدرواہ۔ 09-2008	
6	ڈاکٹر ظہور الدین	تسلسل ''ششماہی''	15 جنوری، جولائی۔ 2005	شعبہ اُردو جموں جموں توی
7	فدا کشتواڑی	آنند لہر شخصیت اور فن (سہ ماہی۔ آب جو نمبر	جولائی 2005	اُردو نیشنل ڈپو لپ
8	وسیم ارشد	چوتھی دُنیا۔ ہفتہ وار	27 ستمبر تا 2 جنوری، 2011	نویڈا اُتر پردیش جنوری، 011
9	نوشاد مومن	مژگان (سہ ماہی)	31-12-2008	کولکاتہ
10	مرغوب حیدر آبادی	ایوانِ اُردو	نومبر 2003ء	اُردو اکادمی دہلی
11	مرغوب حیدر آبادی	ایوان اُردو	جنوری 2004ء	اُردو اکادمی [illegible]

12	نرگس سلطانہ	آج کل	ستمبر،2005ء	جلد24،شمار
13	اُردو ماہنامہ۔حیات			ادیب پبلی کیشـ
14	برج پریمی	ادب کی نشوونما	جون1992	
15	قاضی شہاب عالم	اُردو کیمپس	جولائی۔ستمبر 2011 جلد۔1،شمارہ۔20سہ ماہی	
16	افتخار امام صدیقی	شاعر	مئی2005ء جلد۔76،شمارہ5	امین سوسائٹی
17	ڈاکٹر مشتاق صدف	رنگ	اکتوبر۔نومبر دسمبر۔2005	سرکھیج روڈ احمد
18	نذیر فتح پوری	اسباق	جولائی تا ستمبر 2011	گنیش پریس
	بھاشاوِ بھاگ پنجاب (بلبیر کور)	پرواز ادب	جولائی اگست 2011	